پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کی تحریروں کا گلدستہ
نگارشاتِ فاروقی
ترتیب و تہذیب
محمد عالم مختار حق (گولڈ میڈلسٹ)
مکتبہ نبویہ
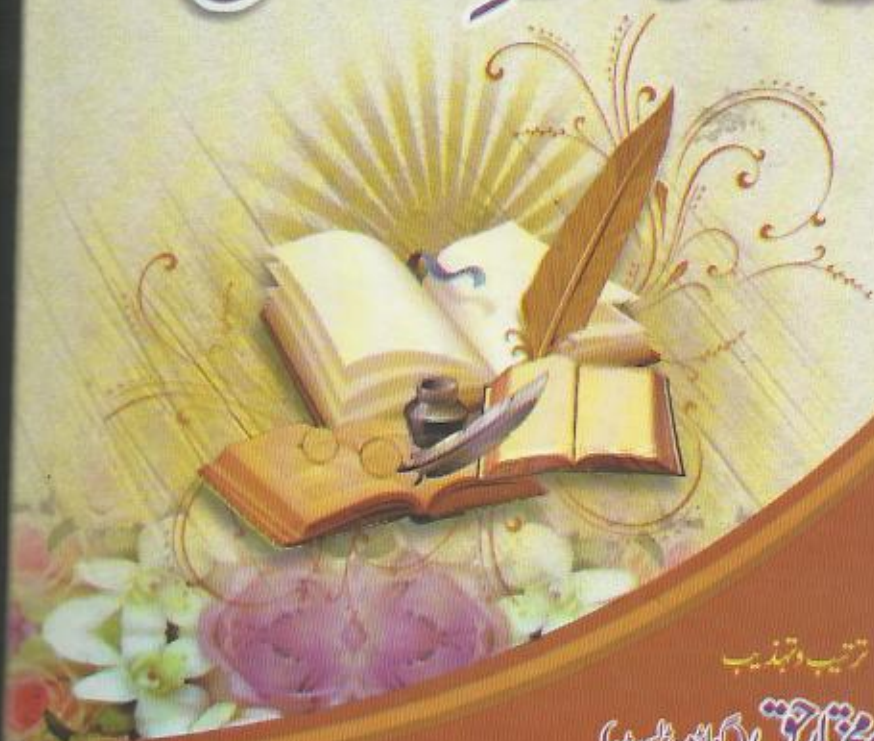
نام کتاب	....	نگارشات فاروقی
مرتب	....	محمد عالم مختار حق (گولڈ میڈلسٹ خطاطی)
موضوع	....	پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کی تحریریں
کمپوزنگ	....	فہیم سلطان/تاج کمپوزنگ سنٹر
سال تالیف	....	۲۰۰۹ء
سال اشاعت	....	۲۰۱۰ء
ناشر	....	مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ، لاہور
صفحات	....	۳۵۲
قیمت مجلد	....	۳۰۰ روپے

مکتبۂ نبویہ

گنج بخش روڈ، لاہور

فون: 042-7213560

فہرست مضامین نگارشاتِ فاروقی

عرصہ نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط ہے۔ مجھے یوں یاد پڑتا ہے کہ میں کتابوں کی تلاش میں مختلف کتاب خانوں میں جایا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں مولوی شمس الدین (متوفی ۱۹۶۸۔۱۔۱۱) نادرہ کتب فروش زیر مسلم مسجد لاہور کے ہاں بھی جایا کرتا تو فاروقی صاحب کو بھی تلاش کتب میں مصروف پاتا چنانچہ مولوی صاحب موصوف کی دکان ہی ہمارے راہ و رسم کی ابتدا کا سبب بنی۔ پھر حکیم اہل سنت حکیم محمد موسیٰ امرتسری (متوفی ۱۹۹۹۔۱۱۔۱۷) کی مجالس میں حاضری میں ان کی مزید قربت نصیب ہوگئی۔ مجھے یاد ہے کہ آج سے پچپن برس پہلے فاروقی صاحب محکمہ صنعت میں ایک افسر کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی سرانجام دے رہے تھے۔ ان کا دفتر لاہور میں چوبرجی کے پاس پونچھ ہاؤس میں میرے راستے میں پڑتا تھا۔ میں دفتر سے چھٹی کر کے کبھی کبھار ان کے پاس جا بیٹھتا۔ ان کے دفتر میں ایک صاحب تھے سید سبطین شاہجہانی وہ فاروقی صاحب کے عملہ کے ایک فرد تھے۔ وہ نعت گو شاعر بھی تھے اور نعت خوان بھی۔ اس حوالے سے فاروقی صاحب کے کمرے میں ایک ہلکی پھلکی محفل نعت منعقد ہو جاتی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ سبطین شاہجہانی صاحب روحانی منازل طے کر کے پیر طریقت کے درجہ پر فائز ہو چکے ہیں اور ان دنوں سلطان الاولیاء خواجہ حاوی العصر حبیب رحمانی محبوب جعفری اسلام آباد کے سجادہ نشین اور خلیفۂ اکبر ہیں۔

یہ عظمتیں ہیں مقدر کسی کسی کے لیے!

فاروقی صاحب کی اس محکمہ سے محکمہ لیبر میں تبدیلی کے بعد "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"

مجھے یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اس نصف صدی کے دوران فاروقی صاحب کا میں رفیق قلم بھی رہا اور جلیس مجلس بھی۔ بلکہ اب تک میرا معمول ہے کہ میں ہفتہ کے دن ان کے مکتبہ نبویہ داتا گنج بخش روڈ پر ملاقات کے لیے حاضر ہوتا ہوں۔ اس حوالے سے میں آپ کے علمی و ادبی کارناموں کا شاہد ہوں۔ اور قدم قدم پر ان کی رفاقت نے مجھے عزت بخشی۔ انہوں نے بھی میری اس دوستی اور کتاب سے وابستگی کی ہمیشہ قدر کی اور اپنے نہاں خانۂ دل میں جگہ دی۔ وہ مرکزی مجلس رضا کے رکن تھے اور مجھے بھی مرکزی مجلس رضا میں کام کرنے کا موقع ملتا تھا۔ اس حوالے سے ہم دونوں حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے علمی اور مسلکی مجلس کے رفیق رہے ہیں۔ پھر ایک وقت آیا کہ فاروقی صاحب نے ماہنامہ "جہان رضا" کے ذریعہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے افکار کو پھیلانا شروع کیا تو میں ان کا رفیق قلم بنا اور اس شاندار علمی جریدہ کی ترتیب و اشاعت اور اس کی پیش رفت میں فاروقی صاحب کا معاون بننے پر مجھے فخر حاصل ہے۔

فاروقی صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ صرف ماہنامہ "جہانِ رضا" کے مدیر ہی نہیں بلکہ وہ ایک بلند پایہ مفکر اسلام، دانشور، ادیب، مستند عالم دین، شخصیت نگار، اعلیٰ درجہ کے قلم کار، سیاست حاضرہ پر عقابی نظر رکھنے والے، عصری تقاضوں سے باخبر اور ایک منفرد طرز نگارش کے موجد بھی اور خاتم بھی۔

ع اے پیکر خوبی! تجھے کس نام سے پکاروں

فاروقی صاحب قلم برداشتہ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں اور اس پر نظر ثانی کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ فارسی اساتذہ کے منتخب اشعار کا ذخیرہ ان کے نہاں خانہ دماغ میں محفوظ ہے۔ اردو کے جدید شعراء کے کلام پر بھی ان کی نظر ہے۔ کوئی اچھا شعر پڑھ یا سن لیں، وہ ان کے دماغی کمپیوٹر میں اس طرح فیڈ ہو جاتا ہے کہ بوقت ضرورت بغیر بٹن دبائے ہی ان کی نوک زبان پر آجاتا ہے۔ بعض اوقات حالات کا تجزیہ کرتے وقت بعض اشعار میں ان کا معمولی سا تصرف واقعہ کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں ممد ثابت ہوتا ہے۔

وہ جب اداریہ لکھنے پر آتے ہیں تو اپنے منتخب کردہ موضوع کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے اداریے ہمارے اس دعویٰ پر شاہد عدل ہیں خاص طور پر جب ملک کے سیاسی بحران پر خامہ فرسائی کرتے ہیں تو ان کی رگ فاروقیت پھڑک اٹھتی ہے اور وہ:

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!

بن کر اصحاب بست وکشاد و صاحبان ذوی الاقتدار کے لیے "رضا کے نیزے کی مار" ثابت ہوتے ہیں اور بلا خوف و خطر اپنے دل کی بات بیان کر دیتے ہیں۔

اسی طرح وہ اپنے اداریوں میں ہم مسلک علمائے کرام کی فکری و تنظیمی صلاحیتوں کو بھی بیدار کرتے رہتے ہیں۔ ان کی بے حسی، بے اتفاقی کو جھنجھوڑتے ہوئے شعور و آگہی کی ترغیب دینے کے لیے قلم کی خفتہ صلاحیتوں کی مہمیز لگاتے ہیں۔ باطل نظریات اور قوتوں کے خلاف مضبوط چٹان کی طرح ڈٹ جاتے ہیں اور اقبال کے الفاظ میں:

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

فاروقی صاحب بڑے زندہ دل، خوش طبع اور بذلہ سنج واقع ہوئے ہیں۔ آپ ان کی مجلس میں ہوں یا ان کے ساتھ سفر کا واسطہ پڑ جائے، وہ آپ کو بور ہونے نہیں دیں گے۔ وہ آپ کو صرف کتابی باتیں ہی نہیں سنائیں گے بلکہ چشم دید اور ہڈ بیتے واقعات سے محظوظ فرمائیں گے۔ ایسے میں ان کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے:

رکھیو یا رب یہ در گنجینۂ گوہر کھلا

میں نے اگرچہ اردو ادب کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں مگر فاروقی صاحب کا آہنگ اور انداز ہی منفرد ہے۔ بعض اوقات میں فاروقی صاحب کی تحریریں پڑھتا ہوں تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے بالخصوص جب ان کے تمہیدی جملوں پر نظر جاتی ہے تو انہیں داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ ان کے منفرد انداز تحریر کا میں ہی قائل نہیں۔

نہ تنہا من دریں مے خانہ مست
جنید و شبلی و عطار ہم مست

بلکہ میری ہم نوائی میں سید وجاہت رسول قادری صاحب مدیر اعلیٰ ماہنامہ "معارف رضا" کراچی اور صدر ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا انٹرنیشنل کراچی بھی اپنے انداز میں یوں رطب اللسان ہیں کہ: "سیاست کا معاملہ ہو یا امامت کا، مسجد کا معاملہ ہو یا مدرسہ کا، منبر کا معاملہ ہو یا خانقاہ کا، تعلیم کا معاملہ ہو یا تعلم کا، ہر زاویے سے آپ نے لکھا ہے اور ہر زاویہ میں فکرِ رضا آشکار ہے۔ اس پر آپ کا منفرد طرز نگارش، جسے راقم "اسلوب فاروقی" کہے تو بے جا نہ ہوگا۔ سلاست و روانی، برجستگی، روزمرہ کا استعمال، محاورات اور ضرب المثل اور اختصار و جامعیت، نکتہ آفرینی، قوت استدلال، عبارات میں شعریت، موزوں الفاظ کی سجاوٹ، سہل پسندی، معلومات افروزی، واقعات نگاری، تجزیہ نگاری اور ادق موضوعات میں غواصی، فارسی، عربی اور اردو اشعار کا جابجا برمحل استعمال اداریے اور تحریروں کے نہایت موزوں اور جاذب نظر و قلب عنوانات اور ان میں تنوع کہ عنوانات خود بولتے ہیں، یہ ہیچ مداں کیا بیان کر سکتا ہے، کوئی اہل بیان و فن ہی اس کی قدر بتا سکتا ہے۔"

(جہانِ رضا۔ لاہور، جنوری، فروری ۲۰۰۷ء)

آمدم بر سرِ مطلب۔ مجالس علماء کی "تمہیدی باتیں" میں راقم نے گزارش کی تھی کہ موصوف کی متفرق تحریریں "نگارشاتِ فاروقی" کے عنوان سے زیرِ تسوید ہیں۔ یہ ۲۰۰۷ء کی بات ہے۔ للہ الحمد کہ تسوید کے بعد مختلف طباعتی مراحل طے کرتا ہوا یہ مجموعہ اب آپ کے زیرِ مطالعہ ہے۔ پیشتر ازاں موصوف کی تحریروں پر مشتمل دو کتابیں "فکرِ فاروقی" (پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی کے اداریوں کا گلدستہ) اور "نسیم بطحا" (پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی کے دربارِ رسول ﷺ میں حاضری کے تاثرات و کیفیات) ۲۰۰۶ء اور ۲۰۰۷ء میں بالترتیب خوانندگانِ گرامی قدر کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہیں اور اب یہ چوتھا مجموعہ پیشِ خدمت ہے جب کہ پانچواں مجموعہ "مکتوباتِ فاروقی" (بنام پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد علی گڑھ) زیرِ ترتیب ہے اور مناسب وقت پر یہ بھی آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ کل امر مرہون باوقا تہا۔ میں پروفیسر صاحب کا ممنونیت ریز شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے صاجزادہ صاحب کے جملہ مکاتیب، جو ۱۹۹۲ء سے سال موجود کے عرصہ پر محیط ہیں اور ان کی طویل قلمی رفاقت کا زندہ ثبوت ہیں، راقم پر اعتماد کرتے ہوئے برائے طباعت بلا حیل و حجت "سپردم بتو مایہ خویش را" کہتے ہوئے راقم کو پیش کر دیے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء!

فاروقی صاحب اس حوالہ سے خوش بخت انسان ہیں کہ ان کی حینِ حیات ہی ان کی علمی، ادبی، دینی اور سماجی خدمات کا اعتراف مختلف انداز سے کیا گیا۔ سب سے پہلے محمد صلاح الدین سعیدی صاحب کو "باتوں سے خوشبو آئے" مرتب کرنے کا شرف حاصل ہوا جس کی تقریبِ رونمائی کے اہتمام کا اعزاز ہجویری فاؤنڈیشن کے بانی و چیئرمین جناب صاجزادہ سلیم حماد صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت داتا گنج بخش کو حاصل ہوا۔ اس مبارک تقریب کے موقع پر فاروقی صاحب کی بارگاہ میں کلماتِ تحسین پیش کرنے کے لیے لاہور کے علاوہ دوسرے شہروں اور ملکوں سے بھی اصحابِ دانش و بینش تشریف لائے اور بھرپور انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ یہ ۱۱ جنوری ۲۰۰۷ء کا واقعہ ہے۔ ایسی تقریب کی مثال ماضی قریب میں نہیں ملتی۔

زاں بعد موصوف کی نگارشات کی چار جلدوں (فکرِ فاروقی، مجالس علماء، نسیم بطحا اور نگارشاتِ فاروقی) کی تدوین بحمد اللہ راقم کے حصہ میں آئی۔ جب کہ "سفیرِ رضا" کے عنوان سے جناب ڈاکٹر علامہ عبد النعیم عزیزی (بریلی شریف) نے آپ کی نگارشات کی روشنی میں آپ کی متنوع جہات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا اور علامہ جلال الدین ڈیروی نے "تحریکِ پاکستان میں علمائے کرام کا کردار" کے "غیر فاروقی عنوان" سے آپ کی سنی علمائے کرام کی تحریکِ پاکستان میں خدمات کے ذکر کو دیگر تائیدی منابع کی روشنی میں مبرہن کیا اور آخری اعزاز یہ کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی کے ترجمہ قرآن "کنز الایمان" کے صد سالہ جشن منعقدہ ۱۴، ۱۵ فروری ۲۰۰۹ء زیرِ اہتمام "ادارہ تحقیقات امام احمد رضا انٹرنیشنل کراچی" کے موقع پر آپ کو رضویات پر تحقیق کے اعتراف میں "امام احمد رضا ریسرچ گولڈ میڈل ایوارڈ" سے نوازا گیا۔

یہ عظمتیں ہیں مقدر کسی کسی کے لیے!

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے وجود باجود کا سایہ ہما پایہ ہمارے سروں پر تادیر سلامت باکرامت رکھے اور ہم ان کے فیوض و برکات سے اپنے تہی دامن کو مالا مال کرتے رہیں۔ آمین بجاہ نبی الامین!

لاہور ۱۹ جون ۲۰۱۰ء — محمد عالم مختار حق گولڈ میڈلسٹ (خطاطی)

افکارِ رضا کا ترجمان

حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ

اپنے احباب کے حلقہ میں

تیری محفل میں بیٹھنے والے
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

حکیم محمد موسیٰ امرتسری نور اللہ مرقدہ، مختلف اوصاف سے متصف تھے۔ ان کے حلقہ کے اربابِ قلم نے ان کی زندگی کے روشن پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اکثر اخبارات اور رسائل میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے مگر ہم ان کے ایسے احباب کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی مجالس میں علم و عرفان کی تلاش میں آتے تھے اور جھولیاں بھر کر لے جاتے تھے۔ ہم چونکہ خود چالیس سال سے زیادہ ان کی نیاز مندی کے حلقہ میں رہے ہیں اس لیے ہم نے جن اہلِ علم و فضل کو ان کے ہاں آتے جاتے دیکھا ہے ان کے اذکار سے قارئین "جہانِ رضا" کو شاد کام کرنا چاہتے ہیں۔ ہم جن حضرات کی آمد و رفت کا ذکر کریں گے وہ ایسے حضرات ہیں جنہیں ہم نے گوشہ چشم سے حکیم صاحب کے پاس بیٹھے دیکھا تھا اور ان کی یادیں ہمارے کنج خانۂ دماغ میں ابھی تک محفوظ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے احباب کا حلقہ بے حد وسیع تھا اور یہ سارے احباب بڑے اہلِ محبت اور روشن ضمیر تھے۔

تیری محفل میں بیٹھنے والے
کتنے روشن ضمیر ہوتے ہیں

جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں ان دنوں حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری

رام گلی نمبر ۲ لاہور میں ایک مختصر سی دکان پر مطب کیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب اپنی نشست پر جلوہ افروز ہوتے تھے ان کے سامنے شربت کی بوتلیں سجی ہوتیں، اردگرد ادویات کے ڈبے ایک طبیب کی نشست گاہ کی نشاندہی کرتے تھے۔ مریض آتے تو حکیم محمد موسیٰ امرتسری ان ڈبوں سے ادویات نکال کر دیتے اور اگر علمی احباب آتے تو انہیں محبت بھری نظروں سے خوش آمدید کہتے۔ اولاً شربت دیدار سے ہمارے دلوں کو ٹھنڈک پہنچاتے پھر ہمیں ٹھنڈے اور خوش ذائقہ شربت انار، شربت انجبار اور شربت دل بہار سے نوازتے۔ مریضوں سے فارغ ہوتے تو مختلف دینی، علمی اور تصوّف کے موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ ہم جس زمانے کی بات کرتے ہیں ان دنوں لاہور کے ایک دانشور اور عالم دین پیر غلام دستگیر نامی رحمتہ اللہ علیہ اکثر آپ کی مجالس کی زینت ہوتے۔ غلام دستگیر نامی موچی دروازہ کے محلہ ''چلہ بی بیاں'' کے رہائشی تھے۔ گورنمنٹ کے ایک ادارہ میں ملازم تھے، مگر لکھنے پڑھنے کے بڑے رسیا تھے۔ وہ سرکاری امور سے ہٹ کر تحقیقی کام کرتے، ان کے قلم سے مختلف موضوعات پر تحریریں سامنے آتیں۔ وہ انہیں زیور طباعت سے آراستہ کر کے لوگوں میں تقسیم کرتے۔ حکیم صاحب ان کی اس تبلیغی مہم میں برابر کے شریک ہوتے۔ دامے، درمے، قلمے، سخنے ان کے تبلیغی مقاصد میں شرکت کرتے۔

ایک قادیانی دانشور اسماعیل پانی پتی کو بھی ہم حکیم صاحب کی مجلس میں اکثر دیکھا کرتے۔ وہ رام گلی کے رہائشی تھے۔ سرسید کے مکتوبات کو مرتب کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں وہ حکیم صاحب سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ وہ لاہوری مرزائی تھے مگر حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے ساتھ سائے کی طرح چمٹے رہتے۔ ہمیں ان کا اس طرح

آنا جانا بڑا شاق گزرتا۔ قادیانی اسماعیل پانی پتی کے علاوہ رام گلی میں ایک اور صاحب قلم، پیام شاہجہان پوری رہتے تھے۔ وہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے ماہنامہ ''حمایت اسلام'' کے سب ایڈیٹر تھے اور بعض تحقیقی کام کر رہے تھے۔ انہوں نے ان دنوں حضرت شاہ محمد غوث لاہوری اور سیدہ عائشہ صدیقہ پر کتابیں لکھی تھیں۔ وہ حکیم صاحب کے پاس اکثر آتے اور علمی رہنمائی حاصل کرتے۔

حکیم صاحب کے مطب کی عقبی گلی میں اورینٹل کالج کے ایک فاضل پروفیسر علم الدین سالک مرحوم رہا کرتے تھے۔ وہ گاہے بگاہے حکیم صاحب کے پاس آتے اور بعض علمی موضوعات پر گفتگو کرتے۔ ان دنوں ماہنامہ ''نقوش'' کا ''لاہور نمبر'' زیر ترتیب تھا۔ پروفیسر علم الدین سالک اس نمبر کی ترتیب میں حصہ لے رہے تھے۔ انہوں نے حکیم صاحب سے لاہور کے اطباء پر ایک تحقیقی مضمون لکھوایا اور نقوش کے ''لاہور نمبر'' میں شریک اشاعت کیا۔ ماہنامہ ''نقوش'' کے لاہور نمبر کی تیاری میں جو حضرات اپنے مضامین کی تکمیل کے لیے حکیم صاحب مرحوم سے مشورہ کرنے آتے وہ بہت کچھ حاصل کرتے۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم ان دنوں ''تذکرہ علمائے امرتسر'' مرتب کرنے میں مصروف تھے۔ وہ اس سلسلہ میں بڑی محنت اور کاوش سے تحقیق کرنے میں مصروف تھے۔ انہیں اس سلسلہ میں منہمک پا کر ہمارے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ''تذکرہ علمائے اہل سنت لاہور'' مرتب کیا جائے اس سلسلہ میں حکیم صاحب نے نہ صرف ہمیں علمی رہنمائی سے نوازا بلکہ اپنے احباب کو بھی اس تذکرہ کے لیے علمی رہنمائی پر تیار کیا۔ ''تذکرہ علمائے اہل سنت لاہور'' تو زیور طباعت سے آراستہ ہو کر اہل علم وفضل کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ مگر ''تذکرہ علمائے امرتسر'' مکمل

نہ ہو سکا اور یوں حکیم صاحب کی یہ کاوش حکیم صاحب کی بے پناہ مصروفیتوں کے ملبے کے نیچے دبی رہی۔

میرے ایک ہم سبق دوست سید اصغر علی شاہ جعفری ایم اے رام گلی میں رہتے تھے۔ حکیم صاحب کی مجالس میں میری نشست و برخاست دیکھ کر وہ بھی آپ کے حلقہ علم میں شامل ہونے لگے وہ ان دنوں آقا بیدار بخت کے قائم کردہ ''دار العلوم السنۃ الشرقیہ'' میں لیکچرار تھے۔ وہ صبح و شام حکیم مرحوم کی مجالس میں آتے اور ان کے حلقہء احباب میں شامل ہو گئے۔ جعفری صاحب نے آگے چل کر کئی کتابیں لکھیں، جو ایم اے کے طلبہ کی رہنمائی کرتیں۔ ان کے ایک اور رفیق تدریس اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر مخدوم غلام جیلانی مرحوم نے بعد میں ڈاکٹریٹ کیا اور کم از کم تیس کتابیں تالیف کیں جو ایم اے کے طلبہ کے لیے رہنمائی کرتیں۔

حکیم صاحب مرحوم ان دنوں حضرت داتا گنج بخش کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے جاتے تھے۔ وہ آتے جاتے کتب فروشوں کی دکانوں پر ضرور جاتے۔ ''نوری کتب خانہ'' دربار بازار، غوثیہ کتب خانہ، مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ، المعارف اور مکتبہ شمس الدین مرحوم زیر مسلم مسجد ان کی نشست گاہیں تھیں۔ وہ مختلف کتابوں کو تلاش کرتے، من پسند کتابیں خریدتے، نادر و نایاب کتابوں سے دلچسپی لیتے اور اچھی کتاب کو ہر قیمت پر بدل و جاں خریدتے اور فرماتے:

جما دے چند دادم جاں خریدم بحمد اللہ چہ ارزاں خریدم

حکیم صاحب کو علمی کتابوں سے لگاؤ ہی نہ تھا عشق تھا۔ وہ کتاب شناس بھی تھے اور کتابوں کے خریدار بھی۔ انہی دنوں آپ نے حضرت داتا گنج بخش کی مشہور

کتاب ''کشف المحجوب'' کے اردو ایڈیشن پر ایک زبردست دیباچہ لکھا جسے پہلی بار ''المعارف'' لاہور نے حضرت ہجویری کے ۱۳۹۳ھ کے عرس مبارک کے موقع پر بطور نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ کتابوں کی تلاش میں وہ مندرجہ بالا کتب خانوں کے ساتھ ساتھ مولوی شمس الدین تاجر کتب نادرہ کے کتب خانہ کو بڑا وقت دیتے۔ مولوی شمس الدین مرحوم نہ صرف کتاب شناس تھے مردم شناس بھی تھے اور وہ ہر کتاب، ہر ایڈیشن، ہر مطبع اور ہر مکتبہ کی طباعت پر اطلاع رکھتے تھے حکیم صاحب کی کتاب شناسی اور مولوی شمس الدین مرحوم کی کتاب فروشی نے دونوں کو علمی دوست ہی نہیں بلکہ یک جان دو قالب بنا دیا تھا۔ مولوی شمس الدین اپنے کتاب خانہ میں آنے سے پہلے حکیم صاحب کے مطب میں آتے۔ نئی آمدہ کتاب کی خوشخبری سناتے اور قدیم کتابوں پر گفتگو کر کے حکیم صاحب کے علمی اور کتابی ذوق کو جلا دیتے۔

مولوی شمس الدین کی دکان کتاب دوست حضرات کا مرکز تھی۔ ملک بھر سے اہل علم لوگ نادر و نایاب کتابوں کی تلاش میں ان کے پاس آتے اور مولوی شمس الدین ایک دکاندار کی حیثیت سے نہیں ایک کتاب شناس سکالر کی حیثیت سے ان کی تشنہ کامی کا سامان کرتے۔ حکیم صاحب نے اس مرکز میں آتے جاتے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں اہل علم و فضل سے شناسائی حاصل کی۔ سید شرافت نوشاہی، خان شفقت جیلانی، پروفیسر محمد اقبال مجددی، علامہ مرزا غلام قادر جیسے کتاب دوست حضرات اسی کتب خانہ سے حکیم صاحب کے دامن محبت میں گرفتار ہوئے تھے۔

جناب بشیر حسین ناظم (ابھی ایم اے، تمغہ حسن کارکردگی اور دوسرے اعزازات سے مزین نہیں ہوئے تھے) ہمارے عزیز احباب میں سے تھے۔ وہ پہلی

بارہمارے ساتھ ہی حکیم صاحب سے متعارف ہوئے پھر اپنی مجلسی گفتگو، خوش آوازی اور نعت خوانی کی وجہ سے حکیم صاحب کی مجالس کا حسن بن کر چمکے۔ وہ نکتہ سنج تھے اور حکیم صاحب نکتہ شناس تھے ان دونوں کی ساری علمی زندگی ایک دوسرے سے محبت اور مواخات میں گزری۔ بشیر حسین صاحب ناظم کے ایک ہم دفتر میاں محمد دین کلیم تھے جو آثار لاہور پر کام کرتے تھے۔ وہ حکیم صاحب کے حلقہ میں آئے اور ان کے ساتھ مولانا عبداللطیف زار نوشاہی مرحوم بھی آنے لگے۔ جنہوں نے بعد میں سید شرافت نوشاہی کی بہت بڑی کتاب ''شریف التواریخ'' کی بارہ جلدیں طباعت سے آراستہ کر کے اہل علم کو دعوت مطالعہ دی۔ ہمارے علم دوست رفیق، جناب محمد عالم مختار حق صاحب انہی دنوں حکیم صاحب کی قربت میں آئے اور زندگی کے آخری سانس تک ان کے ہمدم دمساز رہے۔ محمد عالم مختار حق نے اپنی کتاب شناسی اور کتاب دوستی کی وجہ سے حکیم صاحب سے جو رشتہ قائم کیا، وقت کے ساتھ ساتھ گہرا ہوتا گیا۔

حکیم صاحب کے کتابی احباب کی صف میں ایک خاتون بھی شامل تھیں جن کا نام محترمہ پاشا بیگم تھا۔ وہ مجددی سلسلہ کے علمی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور مجددی سلسلہ کی کتابوں سے انہیں بہت لگاؤ تھا۔ وہ حکیم صاحب کی مجلس میں باپردہ آتیں اور سلسلہ مجددیہ کی کتابوں پر تحقیقی گفتگو کرتیں۔ ان کا یہ سلسلہ مودّت تادیر قائم رہا اور حکیم صاحب بھی ان کی علمی وجاہت اور کتاب شناسی کی وجہ سے ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

پروفیسر محمد اقبال مجددی ایک طالب علم کی حیثیت سے حکیم صاحب سے وابستہ ہوئے اور علمی منازل طے کرتے کرتے اہل علم کے حلقوں میں معروف

ہوئے۔ وہ خانوادہ مجددیہ اور سلسلہ نقشبندیہ پر تحقیقی کام کرتے تھے اور حکیم صاحب سے انہوں نے بے حد استفادہ کیا اور حکیم صاحب کے دوست سید شرافت نوشاہی سے سلسلہ مودت قائم کر کے ان پر بہت کچھ لکھا۔ پروفیسر محمد اقبال مجددی حکیم صاحب کی علمی اور تحقیقاتی ٹیم میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ہم نے رام گلی میں حکیم صاحب کے مطب میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ جو بعد میں وزیر تعلیم سندھ ہوئے، ڈاکٹر احمد حسن قریشی قلعہ داری، حکیم علامہ عبدالمجید عقیقی اور علامہ عرشی امرتسری اور کراچی کے پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم کو گھنٹوں نہیں ہفتوں حکیم صاحب کی محفل میں بیٹھے دیکھا۔ یہ تو حکیم صاحب کی علمی کشش اور جذب کا پہلو تھا۔ کہ اہل علم کھنچے چلے آتے تھے مگر آپ کی زندگی کا ایک پہلو بھی خالی از مروّت نہیں تھا۔ حکیم صاحب جونہی مطب سے فارغ ہو کر اٹھتے، اہل علم کی مجالس میں چلے جاتے۔ علمی استفادہ کرتے۔ روحانی مجالس میں بھی وقت گزارتے۔ ہم نے انہیں حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر اکثر حاضر ہوتے دیکھا اور اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ علی محمد خاں چشتی [illegible] شریف والے، حضرت فضل عثمان کابلی فاروقی مجددی اور سید امیر شاہ صاحب قادری گیلانی پشاوری حضرت نذر محی الدین قادری پھر پیر بدر محی الدین فاضلی قادری، علامہ سید ابوالبرکات قادری اور دوسرے کئی احباب کی مجالس میں حاضری [illegible] دیکھا اور نیازمندانہ جاتے دیکھا:

دانہ می چیدیم ہر جائے کہ خرمن یافتیم

رام گلی میں حکیم صاحب کے مطب کے اردگرد کمرشل ادارے اور مارکیٹیں بن گئیں تو اہل علم کی مجالس کا سکون ختم ہونے لگا حکیم صاحب نے اپنا مطب اٹھایا

اور ۵۵ ریلوے روڈ گوالمنڈی میں جا کر مسند طب وفن بچھادی۔ اس مطب میں مریضوں اور اہل علم کے لیے علیحدہ علیحدہ نشستیں بچھادی گئیں۔ مطب کا کام بھی از سرنو ترتیب دیا گیا اور ملنے والوں کو بھی پرسکون اور کھلی جگہ میسر آ گئی۔

۱۹۶۸ء میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک پروگرام بنایا اور ایک نابغہ روزگار شخصیت، امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے افکار کو متعارف کرانے کا تہیہ کرلیا۔ حکیم صاحب خالص سنی العقیدہ چشتی نظامی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے برصغیر کی ایک بلند پایہ علمی اور اعتقادی، قادری شخصیت کو اپنا مطمح نظر بنا کر ''مرکزی مجلس رضا'' قائم کی۔ ہمیں یاد ہے اس کا ابتدائی اجلاس شاہ محمد غوث کی جامع مسجد کے ایک حجرے میں ہوا تھا۔ جہاں مولانا محمد سعید نقشبندی خطیب مسجد رہتے تھے۔ پہلے اجلاس میں مولانا عبدالنبی کوکب مرحوم، مولانا باغ علی نسیم مرحوم، پیرزادہ اقبال احمد فاروقی، مولانا قیوم الٰہی عرفانی خطیب شاہی مسجد کے علاوہ چند اور سنی اہل علم ودانش شریک ہوئے۔ مولانا کوکب مرحوم اس اجلاس کے روح رواں تھے اور حکیم محمد موسیٰ امرتسری نے سنیوں کی زبوں حالی پر بڑی مفصل رپورٹ پیش کی اور اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کے افکار اور ان کے علمی اور اعتقادی نظریات کو عوام تک پہنچانے کا پروگرام پیش کیا اور پھر یاد ہے کہ اس اجلاس کے اراکین نے فوری طور پر مختصر سا چندہ جمع کیا اور مولانا عبدالنبی کوکب مرحوم کو ''یوم رضا'' منانے کے انتظامات تفویض کیے چنانچہ سب سے پہلے برکت علی محمڈن ہال میں پہلا ''یوم رضا'' منایا گیا۔ اس میں عام واعظین سے لے کر ان سکالر حضرات کو دعوت خطاب دی گئی جو اعلیٰ حضرت کی ذات گرامی پر اظہار خیال کرنے کی

اہلیت رکھتے تھے۔ موچی دروازہ کے باہر برکت علی محمڈن ہال میں تین سال تک متواتر ''یوم رضا'' منایا جاتا رہا اور ''یوم رضا'' کی روئیداد ہر سال چھپتی اور ملک کے گوشے گوشے میں تقسیم ہوتی رہی۔ مولانا عبدالنبی کوکب اچھے قلم کار تھے۔ وہ مختلف فرقوں کو ساتھ لے کر چلنے کے حامی تھے۔ خصوصاً انہیں ''جماعت اسلامی'' کے دانشوروں سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ انہیں اس سٹیج پر لانے لگے ان کے پیغامات شائع کرنے لگے۔ انہی کا تحریری انداز اپنانے لگے۔ جب انہوں نے ''یوم رضا'' کی تین روئیدادیں مرتب کیں تو پاک وہند کے راسخ العقیدہ سنی علماء کو اعتراض ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا نام لے کر ایسے ایسے لوگوں کو سامنے لایا جا رہا ہے جنہیں مسلک رضا سے کوئی تعلق نہیں۔

چوتھے ''یوم رضا'' پر حکیم محمد موسیٰ امرتسری نے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور راسخ العقیدہ سنیوں کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے خالصتاً فکر رضا پر کام کرنے والوں کو اہمیت دی جانے لگی اور ''یوم رضا'' برکت علی محمڈن ہال موچی دروازہ کی بجائے ریلوے سٹیشن پر ''نوری مسجد'' میں منعقد کیا جانے لگا۔

''مرکزی مجلس رضا'' کی بنیاد رکھنے اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی تعلیمات کو عام کرنے پر حکیم صاحب کے کچھ پرانے احباب کنارہ کش ہونے لگے۔ یا دوسرے لفظوں میں حکیم صاحب خود بھی ایسے ''گول مٹول'' اور غیر واضح عقیدہ رکھنے والے دوستوں سے پہلوتہی کرنے لگے۔ اب حکیم صاحب کی مجالس میں خالص سنی علماء اور دانشوروں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا۔ نئے نئے لوگ آنے لگے۔ اعلیٰ حضرت سے محبت رکھنے والے علماء اور دانشور حکیم صاحب کے قریب ہوگئے۔ ہمیں یاد

ہے کہ حکیم صاحب کی ذاتی مجالس کے ساتھ ساتھ ''یوم رضا'' میں جو خطیب یا مقرر آتے وہ عقیدے کے لحاظ سے بڑے پختہ ہوتے، جو نو وارد آتے، انہیں بھی فکر رضا کی پاسداری کرنا پڑتی۔ ''مرکزی مجلس رضا'' کے فروغ اور قیام کے بعد اس کی علمی خدمات کے پھیلاؤ پر پاکستان کے گوشے گوشے سے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے مسلک پر چلنے والے علماء مرکزی مجلس رضا کی طرف اُمڈنے آئے۔ سید عارف اللہ قادری راولپنڈی سے آئے، مولانا غلام قادر اشرفی لالہ موسیٰ سے پہنچے، حضرت مولانا تقدس علی خان پیر جو گوٹھ سندھ سے آگئے۔ مولانا عبدالستار خان نیازی اور ان کے رفیق کار مولانا ابراہیم علی چشتی ابن مولانا محرم علی چشتی آنے لگے۔ ''مرکزی مجلس رضا'' کے قیام کے بعد نہ صرف سنی علماء نے حکیم صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا بلکہ حکیم صاحب خود پاک و ہند کے قلم کاروں کو تلاش کر کے فاضل بریلوی پر لکھنے کے لیے تیار کرنے لگے۔ سنی رائٹرز گلڈ قائم کی گئی جس میں ایک ہزار سنی قلم کاروں کو رجسٹرڈ کیا گیا باقاعدہ بریفنگ دی جانے لگی بہت سے پروفیسر، ایڈووکیٹ اور صحافی حلقہ رضویت میں شامل ہونے لگے۔

''مرکزی مجلس رضا'' کی خدمات کو دیکھ کر پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب مظہری ایم۔اے۔، پی ایچ ڈی کراچی سے آگے بڑھے۔ ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب ایک علمی سنی خانوادے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے سنی دانشوروں میں شمار ہوتے تھے۔ مگر فاضل بریلوی کے افکار سے انہیں کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ حکیم صاحب نے انہیں استدعا کی کہ وہ مرکزی مجلس رضا کے سٹیج پر اپنے قلم کے جوہر دکھائیں۔ پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد صاحب نے لبیک کہا اور سب سے پہلی کتاب ''فاضل بریلوی

اور تحریک ترک موالات'' لکھی۔ ''مرکزی مجلس رضا'' نے اس کتاب کے چار ہزار نسخے چھپوا کر تقسیم کیے تو ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب مظہری کی تحریر کا تہلکہ مچ گیا اور علمی حلقوں میں اس نو وارد سکالر کی طرف عقیدت بھری آنکھیں اٹھنے لگیں۔ یہ پہلے سنی سکالر تھے۔ جنہوں نے فاضل بریلوی کے سیاسی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب کی کئی تحریریں سامنے آئیں۔

مرکزی مجلس رضا کے قیام کے بعد حکیم صاحب کا ایک نیا حلقہ پیدا ہوا جس میں علمائے اہل سنت اور مشائخ کرام کی اکثریت تھی۔ ان لوگوں نے حکیم صاحب کے کام کو بڑا پسند کیا۔ آگے بڑھ کر حوصلہ دیا اور ہدیہ تحسین پیش کیا۔ حکیم صاحب کے کام کا یہ ایک منفرد انداز تھا جسے اہل سنت کے ہر طبقہ نے پسند کیا اس سے پہلے ''اعلیٰ حضرت'' کا نام روائتی طور پر لیا جاتا تھا۔ ہم اگرچہ ان زعماء اور علماء کا ذکر رہے ہیں جنہیں ہم حکیم صاحب کی مجالس میں آتے جاتے دیکھا کرتے تھے۔ مگر مرکزی مجلس رضا کے قیام کے بعد جو کارکن اور احباب دن رات مجلس کا کام کرتے ان کا ذکر حکیم صاحب کے مجلسیوں میں آنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ مجلس کے آغاز میں محمد عارف ضیائی (جو آج کل فضیلت الشیخ الحکیم پیر عارف الضیائی کے نام سے مدینہ پاک میں مقیم ہیں) حکیم صاحب کے دست راست تھے اور مرکزی مجلس رضا کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ محمد سلیم (جو ان دنوں مسلم کمرشل بینک کے منیجر ہیں) صاحبزادہ حکیم محمد زبیر ضیائی المدنی (جو ان دنوں حکیم صاحب کے مطب کے نگران اعلیٰ ہیں) قاضی صلاح الدین قادری اور دوسرے کئی نوجوان ''مرکزی مجلس رضا'' کے اشاعتی امور میں حکیم صاحب سے معاونت کرتے تھے یہ نوجوان دراصل مرکزی مجلس رضا کی ابتدائی

ٹیم تھے۔ جنہوں نے بے سروسامانی کے عالم میں حکیم صاحب کی نگرانی میں دن رات
کام کیا اور مرکزی مجلس رضا کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ حکیم صاحب کی علمی مجالس میں
جس شخص نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ سید شرافت نوشاہی تھے۔ جنہوں نے اپنی
بے مثال محنت اور تحقیقات سے حکیم صاحب کے دل میں گھر بنالیا۔ سید شرافت نوشاہی
نے خانوادہ نوشاہیہ پر ایک زبردست کتاب ''شریف التواریخ'' لکھی جو بارہ ضخیم
جلدوں پر مشتمل تھی۔ حکیم صاحب کی دلی خواہش تھی کہ یہ کتاب چھپے۔ پھر حکیم صاحب
کی کوششوں سے واقعی یہ کتاب چھپی اور اس طرح حکیم صاحب کا دل اور شرافت
صاحب کی روح خوش ہوگئی۔

ہمیں صاحبزادہ سید محمد فاروق القادری صاحب سجادہ نشین آستانہ عالیہ شاہ
آباد شریف ضلع رحیم یار خاں، صاحبزادہ پروفیسر سید اسرار حسین بخاری صاحب کوہاٹی
اور صاحبزادہ میاں محمد سلیم حماد صاحب سجادہ نشین حضرت داتا گنج بخش لاہور کا ایک
عرصہ تک حکیم صاحب کی مجالس میں آنا یاد ہے اور ان تینوں جواں سال صاحبزادوں
نے حکیم صاحب کی رفاقت میں اپنے اپنے طور پر علمی کام کیے۔ صاحبزادہ سید فاروق
القادری کی کتاب ''فاضل بریلوی اور امور بدعت'' تو ایک نیا انداز لے کر آئی۔ پھر
مشائخ بھر چونڈی شریف کے تذکرے سامنے آئے۔ پروفیسر سید اسرار بخاری نے
تصوف کی کتابوں کے ترجمے کیے۔

صاحبزادہ محمد سلیم حماد نے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے
سے کئی کتابیں اور تحقیقی مقالات لکھے۔ یہ حکیم صاحب کی مجالس کے اثرات تھے جو علمی
دنیا میں روشن راہیں ہموار کرتے گئے۔ حضرت پیر محمد امیر شاہ قادری گیلانی سجادہ نشین

حضرت شاہ محمد غوث، حضرت پیر عبداللہ جان مجددی جب بھی پشاور سے لاہور آتے
حکیم صاحب کی مجلس کو رونق بخشتے۔ پیر سید محمد حسن شاہ نوری گیلانی، پیر علی اصغر چشتی
صاحب، حکیم امین الدین صاحب خوشحالی شاد باغ حکیم صاحب مرحوم کی مجالس کی
زینت تھے۔ حضرت صاحبزادہ میاں جمیل احمد صاحب شرقپوری نے تو حکیم صاحب کی
رفاقت میں ایک عرصہ گزارا اور حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ اور شہنشاہ نقشبنداں
حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی پر ماہنامہ ''نور اسلام'' کے بڑے ضخیم نمبر نکالے۔ ان
دستاویزات کی ترتیب واشاعت میں حکیم صاحب کا بڑا ہاتھ تھا۔ تاریخ گو، شاعر اور
صحافی فدا حسین فدا صاحب مدیر ''مہر وماہ'' لاہور تو ساری زندگی حکیم صاحب کی مجالس
کی زینت بنے رہے اور ماہنامہ ''مہر وماہ'' کے کئی تاریخی نمبر نکالے۔ تاریخ گوئی
شاعری اور سوانح نگاری پر بھی عمدہ کتابیں مرتب کیں۔ لاہور سے دور رہتے ہوئے بھی
گجرات سے سید عارف محجور اور جہانیاں منڈی سے جناب خلیل احمد رانا، پنڈ دادن
خان سے مولانا مرید احمد چشتی، قصور سے جناب محمد صادق قصوری، حیدرآباد سندھ
سے پیر انجم بخاری، کھاریاں سے مولانا جلال الدین قادری، گجرات سے ظہور خان،
بہاولپور سے مولانا محمد فیض احمد اویسی، پھالیہ سے سید نور محمد قادری مرحوم بھی حکیم
صاحب کی مجالس سے وابستہ رہے اور کئی علمی کام سرانجام دیے۔

حکیم صاحب کی مجالس سے جن نوجوان نے گہرا اثر لیا ان میں معارف
نعمانیہ شاد باغ لاہور کے صدر حافظ فیاض احمد تھے۔ ماہنامہ ''کنز الایمان'' کے چیف
ایڈیٹر جناب نعیم طاہر رضوی (صدر کنز الایمان سوسائٹی) بزم عاشقان مصطفےٰ فلیمنگ
روڈ کے صدر محمد آصف، صوفی محمد طفیل مدیر ''القول السدید'' نے حکیم صاحب کی نگرانی

میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے افکار کی اشاعت کے لیے بڑے جاندار ادارے قائم کیے جو شمع شبستان رضا بن کر اب تک چمک رہے ہیں۔

خانوادہ اعلیٰ حضرت کے دو فرزندان بریلی، کراچی سے اٹھے۔ وہ حکیم صاحب کے مجلسی تو نہ تھے مگر وہ حکیم صاحب کے کام سے بڑے متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنے طور پر اعلیٰ حضرت کے افکار کو پھیلانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہم ان دو حضرات کو بھی حکیم صاحب کی مجالس کے جلیس ہی کہیں گے۔ ان میں سے ایک تو حضرت علامہ شمس بریلوی تھے اور دوسرے سید ریاست علی قادری بریلوی تھے جنہوں نے کراچی میں ''ادارہ تحقیقات امام احمد رضا'' کی بنیاد رکھی۔ فاضل بریلوی کا پیغام اعلیٰ طبقہ کو پہنچانے کا اہتمام کیا۔ وہ عوامی سطح سے اٹھ کر اعلیٰ حضرت کے عقائد وافکار کو وزراء، امراء، اور اعیان مملکت حتیٰ کہ سربراہان پاکستان تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

حکیم صاحب کی مجالس سے دور برطانیہ کے ایک سنی سکالر حاجی محمد الیاس قادری نے برطانیہ میں اعلیٰ حضرت کے افکار کو انگریزی میں شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ایک ماہنامہ ''اسلامک ٹائمز'' سٹاک پورٹ برطانیہ سے نکالا اور اعلیٰ حضرت کے عقائد وافکار کو عوام تک پہنچایا۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت کی کئی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کر کے سارے یورپ میں پھیلا دیں۔ ان کا ماہنامہ ''اسلامک ٹائمز'' انگریزی کا ''جہان رضا'' تھا۔ جس نے یورپ میں رضویت کو روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

ہم حکیم صاحب کی مجالس میں بیٹھنے والے چند سنی علماء کے اس مکروہ کردار کو نہیں بھول سکتے جنہوں نے حکیم صاحب کی علالت کے دوران ''مرکزی مجلس رضا'' پر

قبضہ کر لیا۔ مجلس کے فنڈ، مرکزی مجلس رضا کی تعمیر کردہ ''مسجد رضا'' رضا لائبریری، رضا کلینک، رضا ریسرچ سنٹر اور مرکزی مجلس رضا کے قلمی مسودات اور مطبوعہ لٹریچر پر قبضہ کر کے حکیم صاحب کو شدید صدمہ سے دوچار کر دیا۔ ان ''نادان علمائے دین'' نے سنیوں کے اتنے عظیم ادارہ کو تباہ کر کے رکھ دیا جو فاضل بریلوی کے افکار کا ایک بہتا ہوا دریا تھا۔ جو اعلیٰ حضرت کے انوار کی ضیا پاشیوں کا منبع تھا۔ جو اعلیٰ حضرت کے افکار کا مرکز تھا جہاں سے بارہ لاکھ کتابیں شائع ہو کر دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچی تھیں۔ حکیم صاحب کی مجلس میں بیٹھنے والے ایسے مکروہ علماء اہل سنت اور جہلائے اہل سنت نے ایک طرف بانی مرکزی مجلس رضا حکیم محمد موسیٰ امرتسری کو ذہنی طور پر ہلکان کر دیا۔ دوسری طرف ''مرکزی مجلس رضا'' کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ یہ لوگ علم وفضل کے باوجود وہ مرکزیت حاصل نہ کر سکے جو فاضل بریلوی کے افکار کا سرچشمہ تھی۔ ان حضرات کی اس حرکت سے حکیم صاحب ایک طویل عرصہ تک سرگرفتہ رہے اور اس باغ کی آبیاری سے رک گئے جسے انہوں نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ ''مرکزی مجلس رضا'' کا اشاعتی کام رک گیا۔ ممبر سازی ختم ہو گئی۔ حتیٰ کہ بانی مرکزی مجلس رضا نے دل گرفتہ ہو کر ایسے لوگوں کو خاموش رہنے کی ہدایت کر دی جو اس موضوع پر بات کرنا چاہتے تھے۔

اس حادثہ کے باوجود حکیم صاحب کی نجی مجالس ان کے احباب سے بھری رہتیں۔ مرکزی مجلس رضا کی تباہی کے ذمہ دار آپ کی مجالس سے ایک ایک کر کے بھاگ گئے اور شرمندگی سے ان لوگوں سے بھی آنکھ چھپا کر نکل جاتے جو حکیم صاحب کو ملنے آتے تھے۔

کچھ عرصہ کی خاموشی اور ڈیڈ لاک کے بعد پیرزادہ اقبال احمد فاروقی آگے بڑھے۔ مجلس رضا کی تباہی کے بعد جمود کو توڑنے کے لیے حکیم صاحب سے مختلف اوقات پر ملاقاتیں کیں اور ''مرکزی مجلس رضا'' کے اجڑے ہوئے باغ پر خاموش رہنے کی بجائے انہیں ذہنی طور پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ حکیم صاحب کی نگرانی میں ایک اشاعتی کمیٹی بنادی جائے اور مرکزی مجلس رضا کا کام دوبارہ شروع کیا جائے۔ ۱۹۸۹ء میں حکیم صاحب کی رضامندی کے ساتھ مرکزی مجلس رضا کا دفتر نعمانیہ بلڈنگ ٹکسالی گیٹ لاہور میں منتقل کردیا گیا۔ آپ کی مجالس کے جلیس خاص صاحبزادہ زبیر احمد ضیائی، ریاض ہمایوں اور محمد شفیع رضوی صاحبان کو بااختیار اتھارٹی کی حیثیت سے کام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ جب یہ لوگ کام کرنے لگے تو بے سروسامانی ان کا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ ایک پنسل اور ایک رجسٹر لے کر دارالعلوم نعمانیہ میں آبیٹھے اور از سرنو کام کا آغاز کیا۔ ''مرکزی مجلس رضا'' کی شکست وریخت کے باوجود دوبارہ کتابیں چھپنے لگیں۔ لوگوں کا بکھرا ہوا حلقہ جمع ہونے لگا اور دوبارہ ہزاروں کتابیں عوام تک پہنچنا شروع ہوئیں۔ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کی ادارت میں ''ماہنامہ جہان رضا'' جاری ہوا۔ جس نے دور دور تک افکار رضا کو پھیلانے اور پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا اور مجلس کے اشاعتی امور کی نگرانی کرنے لگے۔

حکیم صاحب سے علمی اور تحقیقی راہنمائی حاصل کرنے والے دو دیوبندی دانشوروں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک پروفیسر محمد ایوب قادری تھے۔ جنہوں نے ساری زندگی حکیم صاحب کی علمی رفاقت میں گزار دی۔ انہوں نے کئی کتابیں، مقالات، رسائل اور مضامین لکھے جن میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمتہ اللہ علیہ کی رہنمائی شامل حال

تھی۔ وہ کراچی سے لاہور آتے تو حکیم صاحب کے گھر ذاتی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرتے اور حکیم صاحب کے خلوص اور مہمان نوازی کو سارے لاہور کے دیوبندیوں پر ترجیح دیتے۔ دوسرے پروفیسر محمد اسلم ہیڈ آف ہسٹری ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی لاہور تھے۔ وہ ایک دیوبندی دانشور اور سکالر تھے مگر حکیم صاحب کی تحریروں، تحقیقی کام اور محنت سے بڑے متاثر تھے وہ بھی حکیم صاحب کی مجالس کو ایک علمی خیابان جان کر اکثر آتے۔ حکیم صاحب ان کی کتاب ''دین الٰہی اور اس کا پس منظر'' سے بڑے متاثر تھے۔ پروفیسر محمد اسلم نے اور کتابوں کے علاوہ حکیم صاحب کی لائبریری کی فہرست پر پہلی ضخیم جلد شائع کی اور اسے اہل علم تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان دیوبندی دانشوروں کے علاوہ حکیم صاحب کی مجلس میں علامہ حکیم محمد حسین عرشی صاحب (جو امرتسر کے اہل قرآن فرقہ سے تعلق رکھتے تھے) آتے اور علمی و ادبی تحریکوں پر گفتگو کرتے۔ حکیم عبدالمجید عقیقی صاحب جو سرسید سکول آف تھاٹ کے ہمنوا تھے، نابینا ہونے کے باوجود آتے اور پہروں بیٹھتے۔ انہوں نے اپنی قیمتی لائبریری خانقاہ ڈوگراں کی میونسپل لائبریری کو دے دی تھی۔

حکیم صاحب کے ایک کتابی دوست سید جمیل احمد رضوی جو پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری کے صدر تھے، انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں ''شعبہ حکیم محمد موسیٰ امرتسری'' قائم کیا اور حکیم صاحب کی ذاتی لائبریری منتقل کرانے، انہیں لائبریری میں سجانے، سکالرز حضرات کو اس سے استفادہ کرنے اور پھر فہرست کتب خانہ حکیم محمد موسیٰ کی کئی جلدیں مرتب کرکے انہیں چھپوانے اور وقت رحلت تک حکیم صاحب کی کتابوں کی ترسیل کو اپنی جگہ ترتیب دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ جناب رضوی صاحب حکیم صاحب کی زندگی کے آخری دور کے کتابی دوست تھے جن پر حکیم صاحب کو بڑا اعتماد تھا۔

ہم حکیم صاحب کے ان احباب کا ذکر کرنے سے قاصر ہیں جو مریض بن کر آئے اور شفایاب ہونے کے بعد آپ کی مجالس کے جلیس بن کر رہ گئے۔ جو تکلیف لے کر آئے اور صحت یاب ہو کر راحت جان بن کر رہے۔ جو لڑکھڑاتے ہوئے آئے اور ساری زندگی حکیم صاحب کی مجالس میں باتیں سنتے، حکایتیں سناتے اور علماو مشائخ کی زیارت سے محظوظ ہوتے زندگی گزار دی۔

بلاکشان محبت چو از قفس رستند   به کنج خانه صیاد آشیاں بستند

حکیم صاحب کی زندگی کی مجالس اہل علم وفضل سے آباد تھیں۔ مگر دوسری طرف حکیم صاحب ایسے مولویوں سے بڑے بیزار تھے جوان کے پاس آتے مگر کوئی دینی یا علمی کام کرنے سے گھبراتے۔ وہ اپنے مسلک کے ایسے علماء کو ''سست عناصر'' کہہ کر نظرانداز کر دیتے۔ وہ بڑے بڑے جبہ ودستار کے مالکان مشائخ اور محراب ومنبر کے وارثان جو اپنے وعظوں کی قیمت وصول کرنے والے علماء تھے کو اپنے نزدیک نہ پھٹکنے دیتے۔ بعض سادہ لوح مولوی آپ کی مجلس میں آتے اور آپ کو ولی اللہ جانتے ہوئے ہاتھ چومتے ایسے لوگوں کو نہایت شدت سے روک دیتے اور اپنی مجلس سے اٹھا دیتے۔ وہ ایسے علماء کرام کے سخت مخالف تھے جو زکوۃ وخیرات اور وعظ فروشی کے پیشہ سے منسلک تھے۔ وہ ایسے مولویوں کو برا بھلا کہنے سے بھی نہ چوکتے جو امراء، وزراء کے دروازوں پر بار بار جاتے تھے اور بدکردار دنیاداروں کے مال وعمر کے لیے دعائیں دیتے تھے جو حرام خور دولت مندوں کے قصیدے پڑھتے تھے ہم نے حکیم صاحب کو ان کی اس عادت سے باز رہنے کے لیے کئی بار کہا کہ ''بے چارے علماء'' کو کچھ نہ کہیں۔ یہ بڑے اللہ والے ہیں یہ ہمارے عالم ہیں مگر وہ کہتے:

بڑے بھولے بھالے بڑے اللہ والے   ریاض آپ کو بس ہمیں جانتے ہیں!

ان کی اس عادت نے کئی سنی مولویوں کو آپ سے دور کر دیا تھا بہر حال ایسے علماء آپ کی مجالس کے ''آدمی بے نظیر ہوتے ہیں'' کے زمرہ میں نہیں آتے۔ ہم نے یونہی ان کا ذکر کر دیا ہے ورنہ:

گریز داز صف ما آنکہ مرد غوغا نیست   کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلہء ما نیست

حکیم صاحب کی زندگی کے آخری دور میں ایک ایسا نوجوان سامنے آیا جو آپ کی علمی مجالس کی زینت بنا۔ پیر مولانا محمد شہزاد ملک مجددی سیفی بڑے قریبی جلیس رہے اور تادم آخر حکیم صاحب سے استفادہ کیا اور اپنے خلوص اور علمی تجسس سے حکیم صاحب کا اعتماد حاصل کیا۔

(جہانِ رضا لاہور۔ اکتوبر نومبر 2000ء۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری پر خصوصی اشاعت)

سیّدی علامہ مولانا سیّدابوالبرکات قادری، اشرفی، قدس سرہ العزیز

رفتید! ولے نہ از دلِ ما

سیدی علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمتہ اللہ علیہ بانی مرکزی انجمن حزب الاحناف پاکستان کے وصال کو کئی سال گزر چکے ہیں۔مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی باتوں کی مٹھاس کانوں میں ابھی تک ٹپک رہی ہے۔ان کی مجالس کی خوشبو ابھی تک دل ودماغ کو معطر کررہی ہے۔ان کے ملفوظات کی ضیائیں ذہن وفکر کو جلا بخش رہی ہیں۔ان کی شفقت بھری نگاہیں چہروں کو طمانیت کے فروغ سے نواز رہی ہیں۔لوگ کہتے ہیں کہ وہ اب ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔مگر مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ ابھی ابھی مکتبہ نبویہ سے اٹھ کر اپنے قدیم دار العلوم میں داخل ہوئے ہیں او راپنی علمی کتابوں پر نگاہیں ڈال رہے ہیں:

آرام کردۂ بہ نہاں خانۂ دلم — خلقے دریں گماں کہ بہ مرقد نشستہ

آپ اپنے والد مکرم سید مولانا دیدار علی شاہ الوری المشہدی قدس سرہ کے ساتھ ۱۹۲۳ میں پہلی دفعہ لاہور آئے۔یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور کے اہل ذوق برصغیر کے علماء وفضلاء کو اپنے ہاں بلاتے۔دیدہ ودل فرش راہ کرتے تھے ان کے وعظ سے اپنی مجالس کو آباد کرتے۔ان کے علمی خزانوں سے اپنے دامن امید کو بھرتے اور پھر ان بزرگان ملت کے بیانوں سے عوام الناس کو دین کی دولت حاصل کرنے کا اہتمام کرتے۔حضرت مولانا دیدار علی شاہ الوری ان دنوں مفتی آگرہ تھے۔ان کی علمی شہرت برصغیر کے مسلمانوں کے دل ودماغ کو مسحور کرچکی تھی۔وہ اپنے زور بیان سے

اہل علم حضرات سے خراج تحسین حاصل کررہے تھے۔انجمن نعمانیہ لاہور کے اراکین نے بھی اپنے تاریخی اجلاس میں آپ کو تقریر کرنے کی دعوت دی۔آپ کی پہلی تقریر نے زندہ دلان لاہور کو موہ لیا۔آپ کے زور بیان سے ست عناصر حلقوں میں گرمی گفتار پیدا ہونے لگی۔آپ کی دینی مباحث نے نظریاتی دنیا میں تہلکہ بپا کردیا۔انجمن نعمانیہ کے تاریخی اجلاس کے بعد اہل لاہور کے دینی حلقوں نے فیصلہ کیا کہ حضرت کو لاہور کے قیام پر آمادہ کیا جائے۔چنانچہ آپ کو لاہور کی مسجد وزیر خاں کی خطابت کے لیے منتخب کرلیا گیا۔یہ لاہور کے لوگوں کے خلوص اور دینی والہیت کی کشش تھی کہ حضرت آگرہ جیسے تاریخی شہر کو چھوڑ کر مدینۃ اولیاء لاہور میں قیام پذیر ہوگئے۔

مولانا سید دیدار علی شاہ الوری کی آمد کے ساتھ آپ کے دونوں جواں سال صاحب علم وفضل صاحبزادے سید محمد احمد ابوالحسنات قادری اور سیّد احمد ابوالبرکات قادری بھی قیام پذیر لاہور ہوئے۔سیّد دیدار علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے تھوڑی ہی مدت بعد مسجد وزیر خاں میں ایک دار العلوم کی بنیاد رکھی جو بعد میں دار العلوم حزب الاحناف کے نام سے شہرہ آفاق ہوا اور دہلی دروازے کے اندر باقاعدگی سے تشنگان علوم دینیہ کو دعوت تعلیم دینے لگے۔آپ کے یہی صاحبزادے اس دار العلوم کے اولین مدرسین میں سے تھے۔

علامہ ابوالبرکات سیّد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ نے اس دار العلوم کو اپنی زندگی کی صبح وشام بنالیا۔نماز صبح سے ظہر تک طلبہ کے حلقے میں پڑھاتے۔ظہر سے عصر تک عوام الناس سے دینی مسائل پر گفتگو فرماتے۔عصر سے شام تک معمولات قادریہ میں مشغول رہتے اور پھر عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر نصف شب تک مطالعہ کتب میں مستغرق رہتے۔آپ نے انہیں معمولات میں مسلسل کئی سال گزارے آپ کی لگاتار

اور شبانہ روز محنت کا نتیجہ تھا کہ دارالعلوم حزب الاحناف پنجاب بھر کے لیے سرچشمہ علم اور مطلع انوارِ فضل وکمال بن گیا۔ تشنگان علوم دینیہ کشاں کشاں اس چشمہ شیریں تک پہنچنے لگے۔ بادہ کشان فنون اسلامیہ شورنوشانوش کے ساتھ داخلہ لینے لگے اور تہی دامن اہل ذوق دور دراز علاقوں سے سفر کر کے لاہور پہنچنے شروع ہوئے۔ حضرت علامہ ابوالبرکات کی محنت اور قابلیت نے طالب علموں کو ہی نہیں وقت کے علماء ومشائخ تک کو متاثر کیا اور اس طرح دارالعلوم مرکز علم وادب بن گیا۔

دارالعلوم حزب الاحناف نے اس ربع صدی میں اپنے لاتعداد شاگردوں کو دولت علم سے مالا مال کر دیا۔ ان شاگردوں میں سے بعض علماء تو آسمان شہرت پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکے۔ ان میں کئی مدرس، معلم، مفتی، ادیب، فقیہ اور خطیب بن کر برصغیر کے گوشے گوشے میں پھیلتے گئے اور جہالت کی تاریکیوں کو نور علم سے مٹاتے گئے۔ دارالعلوم حزب الاحناف کے اکثر نامور فرزندوں نے دینی علوم کی درس گاہیں قائم کیں۔ دور دراز علاقوں میں دارالعلوم جاری کیے۔ عظیم الشان مساجد تعمیر کیں اور اپنی خطابت ونیابت سے اسلامی نظریات کی ضیائیں بکھیرتے گئے اس دارالعلوم کے فارغ التحصیل علماء نے عقائد اہلسنت کی حفاظت کے لیے اس وقت اہم کردار ادا کیا جب اسلام انگریز حکمرانوں کی حکمت عملی کی بدولت فرقوں میں بٹتا جا رہا تھا اور یہ برصغیر سیکڑوں نظریاتی فتنوں کی آماجگاہ بن رہا تھا۔ ان فرزندان حزب الاحناف نے شہروں، قصبوں اور دور دراز بستیوں میں پہنچ کر عقائد اہلسنت کی نگہبانی کی اور معاشرے میں بے دینی اور محبت رسول سے بے گانگی کے رجحانات کو بڑی پامردی سے روکا۔ سیّد ابوالبرکات رحمۃ اللہ علیہ اس دارالعلوم کے ناظم، مہتمم، شیخ القرآن اور

شیخ الحدیث ہی نہ تھے۔ وہ بذاتہ ایک انجمن تھے۔ جن سے علم کے ساتھ عقائد کی پختگی اور عقائد اہلسنت کی اشاعت کے مراکز قائم کرنے کا حوصلہ ملتا تھا۔

مجھے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک کا وہ زمانہ یاد ہے جب میں خود بھی اس دستر خوانِ علم سے ٹکڑے اکٹھے کرنے میں مصروف تھا۔ دارالعلوم حزب الاحناف کے پیر رجل جلیل (حضرت علامہ ابوالبرکات) تدریسی اور تعلیمی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں ابھرتی ہوئی تحریکات پر بھی اپنا امتیازی کردار ادا کیا کرتے تھے۔ مولوی احمد علی لاہوری دیوبندی مکتب فکر کی اشاعت کے لیے سرگرم عمل تھے وہ اپنے عقائد کے انجمن خدام الدین کی طرف سے چھوٹے چھوٹے پمفلٹ چھپوا کر عوام میں تقسیم کرتے اور سیّد صاحب قبلہ انجمن حزب الاحناف کی طرف سے ایسے رسالوں کا جواب اپنے جوابی رسالوں میں شائع کرتے.... علامہ عنایت اللہ مشرقی ان دنوں علماء کرام کے خلاف زبردست مہم چلا رہے تھے اور آئے دن ''مولوی کا غلط مذہب'' کے عنوان سے سیکڑوں رسالے چھپتے اور تقسیم ہوتے۔ ادھر سید صاحب قبلہ کے دارالعلوم سے ''مشرقی کا غلط مذہب'' کے عنوان سے جواب الجواب رسالے چھپتے اور تقسیم ہوتے۔ خاکسار تحریک سے وابستہ نوجوان رات کے وقت جب ''چپ وراست'' کی بارعب آواز کے ساتھ بیلچے اٹھائے بازاروں میں پریڈ کرتے تو دوسری طرف سیّد صاحب قبلہ کے حلقے کے نوجوان ''یمین ویسار'' کی پرشکوہ آوازوں کے ساتھ پریڈ کرتے اور لاہور کے کوچہ وبازار کو رات گئے تک بیدار رکھتے۔ قادیانی مناظر بساط مناظرہ بچھاتے تو سیّد صاحب قبلہ کو جواب کے لیے مدمقابل پاتے اور مناظرہ کی سٹیج پر کھڑے نظر آتے۔ مسجد شہید گنج کا سانحہ جب احراری اور کانگریسی سیاست دانوں کی

زد میں آیا تو یہ سیّد صاحب کی ذات گرامی تھی جو اپنی درس گاہ سے نکل کر پیر حافظ
جماعت علی شاہ، علی پوری کے پاس پہنچی اور انہیں اپنے لاکھوں عقیدت مندوں کے
ساتھ شاہی مسجد عالم گیری میں تاریخی اجتماع کرنے پر آمادہ کیا اور لاہور کی تاریخ میں
ایک بے مثال اجتماع کا اہتمام کیا۔ ''تحریک ختم نبوت'' کے دوران یہ دارالعلوم سنیوں
کی طرف سے تحریک کا مرکز تھا۔ مولانا محمد حسین نعیمی اور صاحبزادہ سیّد محمود احمد رضوی
اسی مرکز سے گرفتار ہوئے اور اسی مرکز سے مرزائیت کی رد میں لٹریچر شائع ہوتا تھا۔

دارالعلوم حزب الاحناف کے سالانہ اجلاس ان دنوں مسجد وزیر خاں کے وسیع
وعریض صحن میں منعقد ہوا کرتے تھے ان اجلاسوں کا اہتمام وانتظام سیّد صاحب قبلہ کے
حسن انتظام اور اہل علم کے دلوں میں قدر واحترام کا ایک نمونہ ہوتا تھا۔ کلکتہ سے لے کر
خیبر تک کے جلیل القدر سنی علماء جمع ہوتے۔ قد آدم اشتہارات چھپتے۔ ریلوے سٹیشن
سے لے کر مسجد وزیر خاں تک آنے والے سنی علماء کے استقبال کا خصوصی اہتمام ہوتا۔
لاہور کے کوچہ وبازار مشتاقان دیدار سے اَٹے نظر آتے۔ صدر الافاضل سیّد نعیم الدین
مراد آبادی تشریف لا رہے ہیں۔ حضرت محدث کچھوچھوی رونق فرمائے لاہور ہو رہے
ہیں۔ حضرت مولانا حامد رضا بریلوی (صاحبزادہ اعلیٰ حضرت امام اہلسنت احمد رضا خاں
بریلوی قدس سرہ) ہزاروں شاگردوں کے جلو میں جلوہ فرما ہو رہے ہیں۔ حضرت پیر
حافظ جماعت علی شاہ محدث علی پوری ہزاروں مریدوں کے جلوس میں پہنچ رہے ہیں۔
حضرت مولانا امجد علی اعظمی (مؤلف بہار شریعت) کی آمد آمد ہے۔ حضرت خواجہ
سیالوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے نورانی مریدوں کے جلو میں جلوہ فرمائی کر رہے ہیں۔ جھنگ
سے مولانا قطب الدین جھنگوی آ رہے ہیں۔ مولانا عبدالغفور ہزاروی کی سیاہ زلفیں اور

بارعب شملہ اپنی روایتی جھلک کے ساتھ اہل لاہور کو کھینچ رہا ہے پیر سید ولایت شاہ
گجرات سے چل کر بصد خلوص ونیاز جلسہ گاہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ پھر اہل سنت
کے قافلے اور اہل دل کے کارواں جوق در جوق جلسہ گاہ کی طرف رواں دواں ہیں۔
ہائے زمانہ کی رفتار تجھے کہاں روکا جائے۔

اہل دل کے کارواں کن وادیوں میں کھو گئے

جلسہ گاہ میں ایک بلند سٹیج پر منقش قالین بچھی ہوئی ہیں۔ سٹیج پر ایک سو گاؤ تکیے
پڑے ہیں۔ علماء کرام اور ہزاروں بزرگان اہلسنت بڑی شان وشوکت سے جلوہ فرما
ہیں۔ نقرئی پاندان سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ معطر ماحول، پاکیزہ اور نورانی شکلیں،
خلوص ومحبت کی تصویریں، سامعین اسلام کی عظمت کی شہادت دے رہے ہیں
۔ حاضرین حد نگاہ تک باادب، باوضو اور باحسن عقیدت ہمہ تن گوش بر آواز مقررین
ہیں۔ بارگاہ رسالت میں نعت کے گلدستے پیش کیے جا رہے ہیں۔ نعت خوانان رسول
پر نوٹ برس رہے ہیں۔ صلوٰۃ وسلام کی بارشیں ہو رہی ہیں۔ توحید ورسالت کے
نعرے گونج رہے ہیں۔ مسجد کا عریض ووسیع صحن سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور
جب حضرت محدث کچھوچھوی کے خطبہ کی گونج دار آواز ابھرتی ہے تو رقت کا سماں
طاری ہو جاتا ہے۔

اللہ اللہ کیا ہوئیں وہ مجلسیں! کہاں گئے وہ لوگ!

صدر الافاضل ذکر رسول فرما رہے ہیں۔ آنکھیں اشکبار ہیں۔ سامعین بھی
آنسوؤں کی جھڑیاں برسا رہے ہیں۔ بے پناہ مجمع مگر ایک سناٹا ہے۔ حد مسجد تک لوگ
بیٹھے ہیں مگر نظم وضبط کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ اہل درد کی آہیں اور اہل رقت کی

سسکیاں فرشتوں سے بھی دادِ عقیدت وصول کر رہی ہیں۔ ہائے!

تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے؟

رات کے اجلاس دیدنی اور رات گئے کی تقاریر شنیدنی ہوتی تھیں۔ اہل لاہور ہی نہیں اہل پنجاب جمع ہیں۔ مولانا عبدالغفور ہزاروی گرج رہے ہیں۔ مولانا حشمت علی معاندین پر برس رہے ہیں۔ ابوالنور محمد بشیر کوٹلوی اپنی ترنم ریزیوں سے دلوں کو موہ رہے ہیں۔ مولانا سردار احمد (شیخ الحدیث) اپنے دلائل سے ذہن و فکر کو مالا مال کر رہے ہیں۔ مولانا قطب الدین جھنگوی اپنی گھنی زلفوں کو لہراتے ہوئے (مسئلہ رٹے پر چڑھا رہے ہیں) مسئلہ کی وضاحت کر رہے ہیں۔ پیر ولایت شاہ اپنی تلوار کی نوک کے ساتھ گرج رہے ہیں۔ پھر مولانا محمد یار فریدی بہاولپوری اپنی سنہری ٹوپی اور لال پٹکے کے ساتھ مولانا روم کی مثنوی کے مترنم اشعار کی دستک سے اہل دل کے نہاں خانوں کے دروازے ہلا رہے ہیں۔ یہ رونقیں، یہ نور کی بارشیں، یہ علم و فضل کی ضیائیں، یہ صلوٰۃ وسلام کی بہاریں، یہ علماء کے جھمگٹے یہ اہل دل کے مجمعے، یہ اہل ذوق کی محفلیں، پھر اہل سنت کی مجلسیں تو حضرت سید ابوالبرکات رحمۃ اللہ علیہ کے دم قدم سے آباد تھیں۔

تیرے جانے سے بہاروں کو نہ جانے کیا ہوا

علامہ سیّد صاحب نے اپنی ساری زندگی قال اللہ اور قال الرسول کی وادیوں میں گزاری۔ آپ سیاسی تحریکوں اور ہنگاموں سے دور رہ کر قرآن و حدیث کے انوار کو بکھیرتے رہے ان کی جوانی ان کے بڑھاپے کا دیباچہ تھی اور ان کا بڑھاپا ان کی جوانی کا بہترین سرمایہ تھا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی تدریس میں وقف کی اور ان کا بڑھاپا بھی اس عظیم مقصد کی نذر رہا۔ وہ بستر علالت، زمانہ تکلیف اور پھر زندگی کے آخری

ایام میں بھی اپنے طالب علموں کو اسباق حدیث سے جدا نہ کرتے۔ وہ نہ صرف حافظ صحاح تھے بلکہ احادیث کی اسناد، رجال الاحادیث بلکہ حضور نبی کریم ﷺ کے بیان حدیث کے رموز اور عہد قیام کی تاریخ سے واقف تھے وہ احادیث پر گفتگو فرماتے تو وقت کی کڑیاں ٹوٹ جاتیں۔ مگر ان کے بیان کا سلسلہ ختم نہ ہوتا۔ ان کے دستر خوان علم پر طالب علموں کا حلقہ ہوتا۔ ہزاروں طلبہ اپنا اپنا حصہ لے کر نکلے اور دنیا کے مختلف مقامات پر علم کی روشنیاں دوسروں تک پہنچاتے گئے۔ آج پاک و ہند کے اکثر اسلامی مدارس، دینی مراکز، مساجد اور مکاتب آپ کے دارالعلوم کے فارغ التحصیل شاگردوں، مدرسوں، خطیبوں اور ادیبوں سے آباد ہیں۔ آپ اپنی علمی بصیرت اور فقہی کمالات کی وجہ سے سینوں کی دنیا میں روشنی کا مینار تھے۔ کوئی فقہی، اعتقادی یا نظریاتی مسئلہ حل نہ ہوتا تو علماء آپ سے رجوع کرتے اور آپ کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا۔ اہل علم حضرات آپ کے سامنے زانوے ادب تہ کرنا سعادت حیات جانتے اور آپ کے خرمن علم سے خوشہ چینی کو باعث سعادت وافتخار خیال کرتے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم　　تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے!

آپ ایک علمی شخصیت تھے۔ سیاسی مباحث سے نہ آپ کو دلچسپی تھی۔ نہ آپ کو سیاسی چالیں آتی تھیں۔ آپ کے دارالعلوم میں اگر کوئی سیاسی بحث ہوتی تو آپ اٹھ کر اپنے کتاب خانہ میں چلے جاتے۔ وزیروں امیروں اور سیاسی شخصیات کو ملنے یا بلانے میں آپ نے کبھی دلچسپی نہیں لی۔ آپ علمی اور خاص کر اعتقادی حضرات سے ملتے خوش عقیدہ لوگوں کی عزت کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے جو عقیدہ کی راہ سے بھٹک جاتا اس سے کوئی راہ و رسم نہ رکھتے۔ آپ کے ذاتی کتب خانہ میں

هزاروں عربی فارسی اور اردو کی کتابیں موجود تھیں۔ مگر اکثر کتابیں اعتقادیات پر تھیں آپ کے حافظے میں علماء اعتقادیات کے اقوال اور کتابوں کے صفحات کے صفحات نقش تھے میں نے بارہا مخالفین کی تحریروں کو آپ کی زبان سے سنا۔ پھر ان تحریروں کے صفحات، کتابوں کے ایڈیشن اور مطابع کا نام تک بیان فرماتے جاتے۔ آپ جب مباحث یا مناظرہ میں ان کتابوں کے حوالے پیش کرتے تو آپ کے حافظے کی قوت کا احساس ہوتا۔ آپ کی نگاہیں صرف علماء اہلسنت کی تحریروں پر نہ تھیں بلکہ مختلف طبقات مذاہب کے اہل قلم کی تحریروں پر پورا پورا محاسبہ تھا۔

سیّد صاحب کی مجلس میں علماء کرام کے علاوہ طلبہ، شعراء، اطباء اور فقراء آتے طلبہ کے ساتھ شفقت سے پیش آتے اور ان کے سوالات کا جواب دیتے۔ شعراء کا کلام سنتے مگر بھری مجلس میں غلطی کی نشان دہی نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ بعض معائب سخن پر آپ بروقت اپنے خاموش تاثر کا اظہار فرماتے۔ اطباء سے ادویات اور انسانی صحت کے طریقہ علاج پر گفتگو فرماتے۔ درویش فقراء پر خصوصی توجہ فرماتے۔ درس اور علمی مصروفیات سے ہٹ کر شعروادب سے دلچسپی کا اظہار فرماتے۔ مجھے آپ کی مجالس میں اکثر فارسی اردو اور عربی اساتذہ کے منتخب اشعار سنانے کا موقع ملا۔ آپ شعر سنتے اور داد دیتے اور انتخاب شعر کی تعریف کرتے۔ کئی بار جب خود اساتذہ کے اشعار سناتے تو میرے کشکول ذہن کو خزانوں سے بھر دیتے اور اہل مجلس محو حیرت ہو جاتے کہ یہ ایک مصروف اور تدریسی ذہن اتنی خوش ذوقی کی دولت سے مالا مال ہے۔ پنجابی اشعار کو سنتے تو ترجمہ اور تشریح طلب فرماتے تشریح کی جاتی تو اس موضوع پر فارسی یا اردو اساتذہ کے متبادل اشعار سناتے۔ نعت خواں حضرات آپ کی مجالس

میں عزت پاتے اور داد پاتے اور انعام بھی پاتے اچھی نعت گوئی اور عمدہ نعت خوانی پر دل کھول کر داد دیتے۔ اعلیٰ حضرت کی کہی ہوئی نعتوں کو بڑے ذوق سے سنتے۔

دین کی خدمت کرنے والوں کا بے حد احترام کرتے۔ مسلک اہلسنت کی حفاظت کرنے والوں کو خصوصیت سے نوازتے۔ آخری عمر میں جب آپ نے بعض سنی اشاعتی اداروں کی مفید اشاعتی کوششوں کو دیکھا تو بڑی حوصلہ افزائی فرماتے۔ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی کی خدمات کو سراہتے اور مکتبہ نبویہ لاہور کی تازہ مطبوعات دیکھ کر خوش ہوتے پڑھتے اور پھر دعاؤں میں یاد فرماتے۔ ''فتاوی رضویہ'' پہلی بار چھپ کر آیا تو خوشی سے جھوم اٹھے دارالعلوم کے تمام طلبہ کو فتاوی رضویہ کی جلدیں خرید کر تقسیم فرماتے۔ بیماری کے دوران ''معارج النبوۃ'' کا ترجمہ چھپا تو اپنے رفیق مجلس جناب نصیر الدین ہاشمی سے اس کتاب کے مقدمہ سے لے کر اختتام تک سنا اور بے پناہ مسرت کا اظہار فرمایا۔ کتاب کے آغاز میں میرا دیباچہ سن کر فرمانے لگے ''تم نے ملا معین واعظ الہروی کی شخصیت کو میرے سامنے بلند سے بلند مقام پر لا کھڑا کیا''۔ ''شواہد النبوت'' ملفوظات شریفہ الدولۃ المکیہ اور دوسری کتابوں کے تراجم بستر علالت پر سنتے رہے اور میری حقیر کوششوں کی حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔

بیماری کے دوران آپ کو بے پناہ تکلیف اور شدت درد میں سے گزرنا پڑا مگر درد کی برداشت کا یہ عالم تھا کہ گفتگو میں، نشست و برخاست میں، عبادات و معمولات میں کبھی اہل مجلس کو محسوس تک نہیں ہونے دیا کہ وہ درد کی شدت سے گزر رہے ہیں گلو کوز کی نالیاں اپنا کام کر رہی ہیں۔ مگر آپ زبان ونگاہ سے اہل مجلس کے سوالات کے جوابات نہایت اطمینان سے دیتے جا رہے ہیں۔ علمی مباحث پر گفتگو بھی ہے اور

کتابوں کے زبانی حوالے بھی سنائے جا رہے ہیں۔ راقم الحروف شدید بیماری میں مخل ہونے سے دانستہ اجتناب کرتا۔ مگر آپ دیر سے حاضر ہونے کی وجہ دریافت کیے بغیر نہ رہتے اور دیر سے حاضری کا نوٹس لیتے۔ زندگی کے دوسرے مصائب اور ابتدائی کیفیتوں کو بھی آپ نے خندہ پیشانی اور جواں مردی سے برداشت کیا۔ وہ ہر دکھ سہتے اور مصیبت برداشت کرتے۔ کبھی شکوہ نہ کرتے۔ مگر عزیز دوستوں کا کسی وجہ سے روٹھ جانے اور پھر جدا ہو جانے کے رنج کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکتے۔

اعلیٰ حضرت امام اہلسنت احمد رضا خاں صاحب بریلوی قدس سرہ سے عقیدت ہی نہ تھی، عشق تھا۔ آپ کا نام سنتے تو خوشی سے کھل اٹھتے آپ کا کلام سنتے تو گھنٹوں سنتے جاتے آپ کی کتاب کا اچھا ایڈیشن دیکھتے تو چھاپنے والے کو دعائیں دیتے۔ آپکا ذکر خیر زبان پر لاتے تو وہ علمی نکات بیان فرماتے جاتے جس سے کتابوں کے صفحات اور سوانحی کتابوں کے اوراق اب تک خالی ہیں۔ بریلی سے جو بھی آتا، اسے سینے سے لگاتے۔ اپنے زمانہ طالب علمی کے بریلی شہر کے گلی کوچوں کی تعریف کرتے۔ مکتب بریلی کے ایک ایک طالب علم کی یاد تازہ کرتے چلے جاتے۔ بریلی شریف کی علمی یادیں ان کی یادوں کا سرمایہ تھیں اور اس شہر کی علمی شخصیتیں ان کی عقیدت و محبت کا مرکزی نقطہ تھیں۔

(۱۔ جہانِ رضا لاہور۔ اپریل ۱۹۹۲ء)

(۲۔ ماہنامہ رضوان۔ لاہور۔ اپریل ۲۰۰۸ء)

آنا جانا نور کا

ابوالنور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں کی رحلت

سلطان الواعظین ابوالنور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں ایک ممتاز عالم دین، واعظِ شیریں بیاں، شاعرِ شیریں سخن اور مدیرِ شہیر ماہنامہ "ماہ طیبہ" دنیائے خطاب و بیان میں ستتر سال تک بلبل ہزار داستان بن کر چھائے رہے۔ برصغیر پاک و ہند میں دینی جلسے، اہل سنت کی مجالس اور اہل محبت کی محفلیں اُن کے حسن بیان سے پر رونق رہیں۔ وہ سیالکوٹ کے ایک قصبہ کوٹلی لوہاراں سے اٹھے۔ خطاب و بیان کی دنیا پر چھا گئے۔ ان کے والد مکرم فقیہ اعظم مولانا ابو یوسف محمد شریف محدث کوٹلوی (م ۱۹۵۱ء) رحمتہ اللہ علیہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام احمد رضا بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز اور پنجاب میں افکار رضا کے ترجمان تھے۔ حضرت محدث کوٹلوی نے اپنے اس نامور فرزند کو ابتدائی کتابیں خود پڑھائیں۔ پھر انہیں اس وقت کے مشہور دار العلوم حزب الاحناف لاہور میں داخل کرایا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب دار العلوم حزب الاحناف ابو محمد سید محمد دیدار علی شاہ الوری رحمتہ اللہ علیہ کے زیر اہتمام علم و فضل کا چشمہ بن کہ بہ رہا تھا۔ علامہ ابوالبرکات جب مسند نشین تدریس ہوئے تو ان کی شاگردی کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ مولانا محمد بشیر نے حزب الاحناف کے مہتمم مولانا دیدار علی شاہ الوری کی بارگاہ میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کا 'قصیدہ نور'' پڑھا تو تمام اساتذہ جھوم اٹھے۔:

صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا — صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا

جب آپ اس شعر پر پہنچے:

جو گدا دیکھو لیے جاتا ہے توڑا نور کا — نور کی سرکار ہے، کیا اس میں توڑا نور کا

آپ کی آواز شیریں تھی۔ طرز پیاری، استاد مکرم اٹھے، محمد بشیر کوٹلوی کا سر چوم لیا اور گلے لگا کر اعلان کیا آج کے بعد ابو یوسف کا بیٹا ''ابو النور'' ہوگا۔ مولانا دیدار علی شاہ الوری کا دیا ہوا یہ لقب آپ کی ساری زندگی کا اعزاز بنا رہا۔

ابو النور مولانا محمد بشیر کوٹلوی نے دوران تعلیم بے حد محنت کی۔ اس محنت کی وجہ سے علمی میدانوں میں شہرت حاصل کی۔ شیریں خطاب، فاضلانہ باتیں، عالمانہ استدلال، حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور اردو فارسی شاعری میں کمال حاصل کیا۔ آپ پاکستان اور بھارت کے گوشے گوشے میں پہنچے اور مسلکِ اہلِ سُنت کے ترجمان بن کر ہر شہر میں دھوم مچاتے گئے۔ برصغیر پاک بھارت سے ماورا مشرق وسطی اور متعدد یورپی ممالک کے تبلیغی دورے کیے۔ جہاں گئے اسلام کی عظمت پر خطاب کیے۔

آپ نے زبان کے ساتھ ساتھ قلم کو اپنا رفیق زندگی بنایا۔ خطبات (۲ جلد) ختم نبوت، آنا جانا نور کا، سنی علماء کی حکایات، دیوبندی علماء کی حکایات، لبیک یا سیدی، مفید الواعظین، الخطیب اور سچی حکایات جیسی بلند پایہ اور مقبول کتابیں تصنیف کیں۔ یہ کتابیں اہل سُنت میں اتنی مقبول ہوئیں کہ آپ کی زندگی میں کئی کئی ایڈیشن چھپے اور اپنی تازگی کو برقرار رکھتی رہیں۔

جن دنوں مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں زیر تعلیم تھے ان کا تدریس میں انہماک دیدنی تھا۔ وہ صبح سے لے کر شام تک نصابی کتابوں کے مطالعے میں رہتے۔ استادوں

سے استفادہ کرتے اور رات کے وقت مطالعہ میں ڈوب جاتے۔ ان حالات کو ان کے ایک عزیز مشہور شاعر اور نعت گو حافظ محمد مظہر الدین رحمت اللہ علیہ نے فارسی اشعار میں ۱۹۳۴ء میں ان پر لکھی گئی کتاب ''نار و نور'' میں بیان کیا ہے جس سے مولانا بشیر کی طالب علمی کا دور سامنے آجاتا ہے

آں نگارے کہ دل پذیر آمد — بہر غم دیدگاں بشیر آمد
می کند صبح وشام کسبِ علوم — ذاتِ او ہمچو قدسیاں معصوم
نکند چشم جانبِ جانباز — ہست نا آشنائے سوز وگداز
روز وشب شغلِ او کتب بینی — حرزِ جانش معارفِ دینی

ایک زمانہ تھا کہ لاہور کے روزنامہ ''زمیندار'' کا بڑا چرچا تھا اس کے ایک مزاح نگار، فنکار ''حاجی لق لق'' تھے وہ خوب مزاحیہ نظمیں لکھتے اور اہلِ ذوق سے داد پاتے۔ مولانا محمد بشیر کوٹلوی بھی ان کی شاعری اور ان کی مزاح نگاری سے متاثر تھے۔ مگر ان کے مقابلے میں ''حاجی حق حق'' کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا تو اکثر لوگ ''حاجی لق لق'' کو بھول کر ''حاجی حق حق'' کو پڑھنے لگے اگرچہ ''زمیندار'' کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان قلم وتحریر کے بادشاہ تھے مگر حقہ پیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں ان کے ایک مداح اور عقیدت مند عطا محمد بٹ اکبری منڈی لاہور میں تمباکو کی دکان کیا کرتے تھے وہ مولانا ظفر علی خان کو شہد میں گوندھا ہوا تمباکو پیش کیا کرتے تھے۔ اور جب مولانا ظفر علی اس شہد آمیز تمباکو کا کش لگاتے تو ایسے شعر کہتے جس سے اہل علم جھوم جھوم جاتے۔ ایک دن مولانا ظفر علی خاں نے خوش ہوکر ''بٹ تمباکو'' کی خدمات پر ایک مرصع قصیدہ لکھا جو بہت مشہور ہوا۔

جناب بٹ کے تحفے کے رسیلے پن کا کیا کہنا
یہ تمباکو ہے یا کشمیر کے انگور کا ٹاکو

مولانا محمد بشیر نے مولانا ظفر علی خاں کی حقہ نوشی پر یہ فخریہ قصیدہ پڑھا تو جھوم اٹھے۔ لیکن آپ نے اپنے والد کے پیرومرشد مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی حقہ نوشی کا تذکرہ کیا تو ایک مرصع قصیدہ لکھا اس کا ایک شعر یوں تھا:

حقہ ''حق حق'' می کند در یادِ حق
عالماں زیں شُد ہم گیرند سبق

اعلیٰ حضرت ابھی زندہ تھے۔ آپ نے یہ شعر سنا تو محمد بشیر کوٹلوی کے والد مولانا محمد شریف کوٹلوی کی معرفت اپنی مسرت کا اظہار کیا اور دعائیں دیں۔

آپ نے ۱۹۵۱ء میں ''ماہ طیبہ'' جاری کیا۔ جو ۲۱ سال تک مسلسل اپنے قارئین کو نوازتا رہا۔ ابھی وہ لوگ زندہ ہیں جو ''ماہ طیبہ'' کے قاری اور ''حاجی حق حق'' کے لطائف سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر مجیب احمد صاحب رئیس شعبہ تاریخ اسلامک یونیورسٹی، راولپنڈی نے لکھا ہے کہ مولانا محمد بشیر کوٹلوی اپریل ۱۹۴۶ء میں تاریخ سنی بنارس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے اور علماء کی خصوصی کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ اپنے فرائض کو بطریق احسن نبھاتے رہے اور تحریک پاکستان کے متعلق ان کی اصلاحات آج بھی تاریخ کا حصہ ہیں۔

۱۹۴۸ء میں ملتان سنی کانفرنس میں صف اول کے رہنماؤں میں شامل تھے۔ پھر جمعیت علماء پاکستان کے تاسیسی اجلاس میں بھی شامل ہوتے رہے۔

ابھی پاکستان نہیں بنا تھا کہ مولانا محمد بشیر کوٹلوی دستارِ فضیلت سجا کر دار العلوم

حزب الاحناف سے فارغ ہوئے ان سے دو سال پہلے حافظ مظہر الدین رمداسی (فرزند ارجمند مولانا نواب الدین چشتی) بھی فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ ان دونوں نوخیز خطیبوں کا چرچا سارے پنجاب میں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میدان خطابت میں قدم رکھ رہے تھے۔ ہم ابھی طالب علم تھے۔ بلکہ طفلِ مکتب تھے۔ صوفی غلام حسین گوجروی، حافظ محمد عالم سیالکوٹی ہمارے ہم سبق تھے۔ ہم طالب علم ان بزرگوں کا دامن پکڑ کر وزیر خاں کی مسجد میں حزب الاحناف کے سہ روزہ اجلاس میں جاتے تو ان دونوں معروف خطیبوں کا دامن پکڑ کر سٹیج پر جا بیٹھتے۔ پھر جب ان کی تقریریں ہوتیں تو ہم حاضرین اور سامعین کو داد دینے کے انداز کو دیکھتے تو ہمارا دل خوش ہو جاتا ہم دل میں کہتے کاش ہم بھی تقریر کریں اور لوگ ہماری تقریر سن کر بھی اسی طرح داد دیں۔

پاکستان نیا نیا بنا تھا خان لیاقت علی پاکستان کے وزیر اعظم تھے ان کی بیگم رعنا لیاقت علی پاکستان کی ''خاتونِ اول'' تھیں۔ انہوں نے پاکستانی خواتین کو پردے سے باہر آنے کی تحریک شروع کی اور ہر عورت کو غرارہ پہننے کی تلقین کی۔ بیگم رعنا لیاقت علی نے آل پاکستان ویمن ایسوسی ایشن (اپوا) کی بنیاد رکھی اور عورتوں کو چار دیواری ہی نہیں پردے کو بھی خیر باد کہنے کا اعلان کیا۔ اس کا اپنا لباس ماڈرن تھا جس میں نمایاں ''غرارہ'' تھا۔ اس نے مسلم لیگی خواتین کی ایک ریلی تیار کی جس میں ۵۰۰ کے قریب عورتیں غرارے پہن کر اسمبلی ہال کے سامنے مظاہرہ کرنے والی تھیں۔ لیکن اس وقت کے علماء کرام اور لاہور کے عوام نے احتجاج کر کے ان مستورات کے مظاہرے کو روک دیا۔ پھر خود بڑے بڑے جلسے کیے اور علمائے کرام کو بلا کر پردے کی اہمیت پر تقاریر کا سلسلہ شروع کیا۔

مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں سے لاہور پہنچے اور بیگم لیاقت علی خاں کے خلاف
ایک احتجاجی جلسے میں پردے کے موضوع پر ایک مدلل تقریر کی۔ تقریر کے دوران آپ
نے عام لوگوں کو سمجھانے کے لیے ایک مثال پیش کی اور پنجابی میں لوگوں کو اپنی خاص
طرز میں مخاطب کیا: ''توں قصائی دی دکان تے گوشت لین جاناں ایں، اک سیر
گوشت لیناایں، قصائی تینوں اربی دیاں پتیاں وچ گوشت لپیٹ کے دیندا توں پھر
اس گوشت نوں اخبار دے کاغذ وچ لپیٹناں ایں فیر کپڑے دے رومال وچ چھپاناں
ایں۔ میں تینوں پچھناں توں ایہہ کیوں کرناں ایں۔ توں اس لئی کرناں ایں کہ تیرے
سیر گوشت تے کوئی کوانہ جھپٹے، کوئی چیل نہ ٹوٹ پڑے، کوئی بلی نہ پنجہ مارے، کوئی کتا
نہ دبوچ لے''۔ پھر آپ نے گرج کر کہا۔ لاہوریو! تم ایک سیر گوشت کی حفاظت کے
لیے اتنا اہتمام کرتے ہو میں لیاقت علی خاں سے پوچھتا ہوں کہ پاکستان کے لوگ تو
ایک سیر گوشت کتنے پردوں میں چھپاتے ہیں اور تمہاری بیگم کی ڈیڑھ من کی لاش مال
روڈ پر بے پردہ جائے گی تو اس پر کوئی کتا بلا نہیں جھپٹے گا۔ کوئی کوا نہیں آئے گا، کوئی چیل
کوئی باز کوئی شکرا اس کو نوچنے کو نہیں جھپٹے گا۔ بی بی پردے میں رہو نہیں تو شیطان کے
پاس کووں، چیلوں، کتوں، بلوں کا ایک بہت بڑا لشکر موجود ہے تیرے اور تیری ساتھی
سہیلیوں کی بوٹیاں کھا جائیں گے''

''مجالس علماء'' کے مصنف نے مولانا محمد بشیر کوٹلوی کے تقریری اثرات اور
مجمعے پر کنٹرول کا ایک چشم دید واقعہ لکھا ہے کہ پاکستان سے پہلے مولانا ریاست
بہاولپور میں ہارون آباد کے ایک گاؤں میں تقریر کر رہے تھے۔ مجمعے پر سناٹا طاری تھا۔
ہزاروں سامعین کی نگاہیں مقرر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں سارا مجمع خاموشی سے تقریر

سن رہا تھا۔ آپ تقریر کرتے کرتے رک گئے اور فرمانے لگے میں آپ لوگوں کو رات کا
''ایک واقعہ'' سنانا چاہتا ہوں۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ میں کمرے میں سویا ہوا تھا۔
کمرے میں رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کچھ بھی نظر نہ
آیا۔ مگر میں رونے کی آوازیں لگاتار سنتا رہا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید اس کمرے
میں جن بھوت بستے ہیں۔ میں نے سورۃ جن پڑھی۔ سورۃ والناس پڑھی۔ سورۃ کہف
پڑھی۔ مگر آوازیں بند نہ ہوئیں۔ میں نے غور کیا تو میرا بسترا، رو رہا تھا۔ میرا تکیہ رو رہا
تھا۔ میری رضائی رو رہی تھی۔ میری تلائی رو رہی تھی۔ میری چادر رو رہی تھی۔ میں نے
پوچھا تم کیوں رو رہے ہو، وہ روتے روتے کہنے لگے مولانا آپ کو کیا بتائیں آپ عالم
دین ہیں، واعظ خوش بیان ہیں، عاشق رسول ہیں، اللہ کے نیک بندے ہیں ان لوگوں
نے آپ کے لیے ہمیں سلایا، تیار کیا اور آپ کا بستر بنا دیا۔ آپ نے ہمیں بڑا آرام
پہنچایا ہم نے بھی آپ کی خدمت کی، بڑا سکون ملا، بڑا آرام ملا، راحت ملی، مگر ہم
ڈر رہے ہیں کہ آپ کے جانے کے بعد آپ کا میزبان ہمیں اجڈ، گنوار اور جاہل لوگوں
کے حوالے کر دے گا۔ وہ اپنے پلید گھٹنوں اور گندے پاؤں سے ہمارا حشر نشر کر دیں
گے۔ ہم تو اس لیے روتے ہیں کہ کل ہمارا کیا حال ہوگا!

مولانا بشیر نے جب رات کا یہ واقعہ بیان کیا تو مجمعے میں سے آپ کا میزبان
اٹھا اور کہنے لگا۔ ''مولانا یہ سارا بسترا آپ کا ہوا اسے روتا نہ چھوڑ جانا''۔

مولانا محمد بشیر کی موت نے ملت اسلامیہ کا ایک عظیم عالم دین ہم سے چھین
لیا ہے۔ خیابانِ اہل سنت کا گل سرسبد خزاں کے ہاتھوں موت کی وادی میں چلا گیا
ہے۔ ایک خوش گفتار مقرر وادی خاموشاں میں جا بسا ہے۔ ایک شیریں بیاں خطیب

خاموش ہوگیا ہے۔ ایک گوہر بار قلم کا مالک، ایک مثالی ادیب ہم سے چھن گیا ہے۔
آپ کی موت پر سارے پاکستان کے علماء اہل سنت نے اظہار افسوس کیا، قرار دادیں
پاس کیں، تعزیتی اجلاس کیے۔ اخبارات اور رسائل نے آپ کی علمی خدمات پر
مضامین لکھے۔ اور آپ کے بیٹے عطاء المصطفی جمیل اور برادر زادے ڈاکٹر پروفیسر
مجیب احمد ایم۔ اے کو ہزاروں تعزیت نامے لکھے۔ ہم مرکزی مجلس رضا کی طرف سے
مولانا محمد بشیر کوٹلوی کی رحلت پر اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے ان کی بخشش کے لیے دعا
کرتے ہیں۔ ہم ان کی زندگی اور موت کو دیکھتے ہیں تو یوں محسوس کرتے ہیں کہ یہ تھا۔

"آنا جانا نور کا"

(جہانِ رضا۔ اکتوبر نومبر ۲۰۰۷ء)

ہائے او موت! تجھے موت ہی آئی ہوتی

قائد اہلسنت حضرت مولانا الشاہ احمد نورانی صدیقی سواد اہلسنت کے عظیم
رہنما اور جمعیت علماء پاکستان کے باوقار سربراہ، ۱۱ دسمبر ۲۰۰۳ء کو صبح ۱۲ بجے کے قریب،
اسلام آباد میں دل کا دورہ پڑنے پر داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ حضرت قبلہ نورانی
رحمتہ اللہ علیہ اگرچہ آج سے بیس سال قبل دل کے ہاتھوں تنگ آکر دل کا آپریشن
کروا چکے تھے مگر اتنے لمبے عرصے میں دل نے انہیں کبھی تنگ نہیں کیا۔ نہ ان کی دل کی
دھڑکن نے انہیں کبھی موت کی وادی کی دعوت دی تھی۔ وہ سابقہ کئی سالوں سے عالمی،
ملکی، سیاسی اور دینی معرکوں کی بھرپور قیادت کرتے رہے ہیں۔ وہ صبح وشام سفر
کرتے، جلسوں میں جاتے رات ڈھلے آرام نصیب ہوتا۔ چند لمحوں بعد نماز تہجد کے
لیے بارگاہ رب العزت میں کھڑے ہوجاتے۔ دن کے وقت سیاسی امور پر تبادلہ
خیالات کرتے، امریکہ نواز حکومت کے اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات
کرتے تھے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ جرأت مند سنی عالم دین تھے۔ ساری زندگی اپنے
اصولوں پر قائم ودائم رہے انہوں نے بیگانوں کے زخم سہے۔ اپنوں کے پتھر کھائے۔
مگر پیشانی پر کبھی بل نہ آنے دیا۔

اپنے بھی خفا مجھ سے، بیگانے بھی ناخوش میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

موت سے کس کو رستگاری ہے..... اس کے سنگین ہاتھوں سے کون بچا
ہے.... مگر نورانی صاحب کی موت کا سنا تو بے اختیار منہ سے نکلا۔

ہائے او موت! تجھے موت ہی آئی ہوتی

اس موت نے ہمارا اتنا قیمتی انسان ہم سے چھین لیا۔ ہمارا اتنا عظیم راہنما ہم سے جدا کردیا۔ ہمارا اتنا بلند خیال لیڈر موت کی وادی میں پہنچا دیا۔ ہمیں ایک عظیم الشان بلند کردار لیڈر سے محروم کر دیا گیا۔

شیخ سعدی شیرازی کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

فرشتہء کہ مؤکل است برخزانہ باد　　　چہ غم کند کہ بشکند چراغ بیوہ زنے!

موت کے طوفانوں والے فرشتہ کو کیا پروا کہ وہ ایک پھونک سے ''ایک بیوہ عورت'' کی جھونپڑی کا چراغ گل کر رہا ہے۔ آج پاکستان کے سوادِ اعظم سنی ایک ''بے بس بیوہ عورت'' کی طرح بے سہارا ہو گئے ہیں۔ ''چراغ اہلسنت'' کے گل ہو جانے کی وجہ سے وہ بے آسرا ہو کر رہ گئے ہیں۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ط

(جہانِ رضا۔ لاہور دسمبر ۲۰۰۳ء)

گلستان رضا کا ایک خوش نوا نعت خواں

محمد اعظم چشتی رحمۃ اللہ علیہ

ماہ جولائی ۱۹۹۳ء نے ملک کے ایک ممتاز، خوش آواز نعت خواں اور بارگاہ رسالت میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کہی ہوئی نعتوں کے خوش گلو نعت خوان، محمد اعظم چشتی کو موت کی وادی میں دھکیل دیا۔ محمد اعظم چشتی مرحوم نے ۵۰ سال سے زیادہ عرصہ تک پاکستان کے دینی اجتماعات، بزرگان دین کے عرسوں کی مجالس، نعت رسول کی محافل، اور ریڈیو ٹیلی وژن کی صوتی آہنگوں کو اپنی ترنم ریزیوں سے مالا مال اور پر بہار بنائے رکھا۔ آج مرحوم کے سیکڑوں شاگرد، ہزاروں طرز شناس اور لاکھوں سامعین سوگوار ہیں، جن کے کانوں میں ان کی نعتوں اور خوش آوازی کا رس موجود ہے جسے انہوں نے ملک کے گوشے گوشے میں پھیلایا تھا۔ محمد اعظم چشتی مرحوم کی نعت خوانی اور نعت گوئی پر پاکستان میں اور دنیا کے مختلف ممالک میں ایسے لاکھوں نہیں کروڑوں اہل دل موجود ہیں جو ایک عرصہ تک اس آواز کو داد تحسین دیتے رہیں گے، جسے آج موت نے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا ہے۔

محمد اعظم چشتی مرحوم گجرات کی ایک تحصیل پھالیہ کے قصبہ چکوڑی میں ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے والد مکرم مولوی محمد دین مرحوم کے ساتھ لاہور آئے۔ غالباً یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے جب دونوں باپ بیٹا شیرانوالہ دروازہ کے باہر محلہ عثمان گنج میں اپنے ایک عزیز کے پاس قیام پذیر ہوئے۔ میرے چند عزیز بھی ان دنوں عثمان گنج میں رہتے تھے، جہاں میں گاہے بگاہے جاتا تو مولوی محمد دین مرحوم

کی زیارت کے ساتھ ان کے جواں سال بیٹے محمد اعظم چشتیؒ سے بھی ملاقات ہوتی۔ وہ عثمان گنج کی مسجد میں نماز پڑھنے آتے تو کبھی کبھی مجلس نعت میں (جس کا اہتمام مولانا حافظ خدا بخش مرحوم کیا کرتے تھے) نمازیوں کو نعت سناتے تھے۔ کچھ دنوں بعد چشتی مرحوم مصری شاہ کے مین بازار میں حکیم فضل الٰہی مرحوم (جو طبیب بھی تھے اور نعت خوان بھی تھے) کی شاگردی میں آگئے۔ حکیم فضل الٰہی نعت خواں نعت کی مجلسوں میں جاتے تو اپنے شاگردوں کی پوری جماعت لے کر جاتے۔ محمد اعظم چشتی نے حکیم صاحب کی ان مجالس میں نعت خوانی کے ابتدائی مراحل طے کیے اور خداداد صلاحیتوں سے تھوڑے ہی عرصے میں خوش آوازی اور شیریں بیانی سے اہل محبت کی نظروں میں ابھرنے لگے۔ آہستہ آہستہ نعت کی نجی مجالس سے نکل کر علمائے کرام کی مجالس وعظ میں آنے لگے اور اس طرح ان کی شہرت علمی دنیا میں پھیلنے لگی۔ عثمان گنج سے نکل کر کاچھو پورہ قیام پذیر ہوئے تو وہ پاکستان کے مختلف شہروں میں جانے لگے۔

قیام پاکستان سے کئی سال پہلے لاہور سیاسی اور دینی جلسوں کی رونقوں سے معمور رہتا تھا۔ رنگون سے خیبر تک کے سیاسی اور دینی مقررین اور خطیب لاہور آتے اور اہل لاہور کو اپنے بیان وخطاب سے مسحور کرتے۔ ان دنوں 'مرکزی انجمن حزب الاحناف'' (اندرون دہلی دروازہ لاہور) کے سالانہ اجلاس مسجد وزیر خان میں ہوا کرتے تھے۔ ان جلسوں کا اہتمام اہل سنت کے نامور عالم دین اعلیٰ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز مولانا علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری اشرفی رحمۃ اللہ علیہ کیا کرتے تھے۔ علامہ ابوالبرکات اپنے سالانہ جلسے کی سٹیج کو برصغیر کے ممتاز علماء اہل سنت، خصوصاً بریلی شریف سے وابستہ علمائے دین سے سجا دیا کرتے تھے۔

وہ بریلی، مراد آباد، میرٹھ، الور، آگرہ، دہلی، فیض آباد، بہار، بنگال، سرحد اور پنجاب بھر سے بڑے بڑے بلند پایہ سنی خطیبوں کو بلاتے اور اہل لاہور ہی کو نہیں، اہل پنجاب کو علمی دولت سے مالا مال کر دیتے تھے۔ ان جلسوں کا انتظام دیدنی اور علمائے کرام کی تقاریر شنیدنی ہوا کرتی تھیں۔ وزیر خاں کی مسجد کا صحن اہل علم وفضل سے لبالب بھرا ہوتا اور تین دن تک جلسہ اپنے پورے جاہ وجلال سے برپا رہتا۔ میں نے پہلی بار محمد اعظم چشتی کو اس شاندار سٹیج پر اعلیٰ حضرت عظیم البرکت فاضل بریلوی کی یہ نعت پڑھتے دیکھا تھا۔

نعمتیں بانٹتا جس سمت وہ ذیشان گیا ساتھ ہی منشی رحمت کا قلم دان گیا

مجھے اس وقت تک ''سمت''، ''ذیشان'' اور ''منشی رحمت کا قلم دان'' اور دوسرے مشکل الفاظ کے معانی جاننے کا شعور نہ تھا۔ مگر مجھے محسوس ہوتا کہ کوئی ٹھنڈی چیز میرے دل پر اتر رہی ہے۔ دوسری طرف میری نگاہیں اٹھتیں تو میں نعت سننے والے علمائے کرام کو تڑپتے دیکھتا۔ عوام جلسہ گاہ میں لوٹ پوٹ جاتے اور اہل محبت پر وجد و رقت طاری ہو جاتی۔ ان دنوں نعت خوانوں پر نوٹ برسانے کا رواج نہ تھا مگر محمد اعظم مرحوم اعلیٰ حضرت کی نعتوں کو اپنی مترنم آواز سے پڑھتے تو جلسہ لوٹ لیتے۔ داد وتحسین سے جھولی بھر لیتے اور علمائے کرام اس نعت خوان کو اٹھ اٹھ کر داد دیتے اور سر چومتے۔

پاکستان بن گیا۔ ملت اسلامیہ ایک نئے انداز میں آزاد فضا میں ابھری۔ عرسوں کے مجمعے اور دینی مدارس کے اجلاس محمد اعظم چشتی کی خوش آوازی سے معمور ہوتے۔ آپ ملک کے جس گوشے میں جاتے، داد وتحسین کی دولت سمیٹ کر لوٹتے۔ اب ان کا حلقہ پشاور سے لے کر کراچی تک وسیع ہو گیا تھا۔ ان کی ادا، ان کی طرز، ان

کی آواز، ان کی خوش آوازی، ان کا تلفظ، ان کا موقع محل پر نعت کا انتخاب، پھر دل کو موہ لینے والے دوہڑے جہاں چاہتے، جہاں پڑھتے، جہاں سناتے، اہل محبت کو وجد میں لے آتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شہرت دور دور تک پھیلنے لگی۔ وہ ہر زبان میں نعت پڑھتے۔ اردو، پنجابی، فارسی اور عربی، غرضیکہ جہاں جاتے، دلوں کے دروازے پر دستک دیتے جاتے۔ لوگ انہیں آنکھوں پر بٹھاتے، احترام سے سر جھکا دیتے اور دیدہ ودل فرش راہ کرتے۔ آہستہ آہستہ ان کی آواز میں توانائی، شیرینی اور حلاوت بڑھنے لگی۔ اساتذہ کا عمدہ کلام انہیں ازبر ہوتا گیا۔ جامی، رومی، سعدی، عطار، امام رضا، غالب، میر، اقبال، حفیظ، غرضیکہ وقت کے شاہان سخن کا کلام ان کی نوک زباں پر ہوتا اور موقع محل پر سناتے اور داد پاتے۔

آپ کے ہم عصر نعت خوانوں میں بابا محمد علی ٹرپئی (طوطی ہند)، حافظ پیلی بھیتی، سرفراز (پپا)، جان محمد امرتسری، جانی، سائیں مست جمال، مولا بخش بودی شاہ، قاری احمد حسن فیروز پوری، قاری محمد طفیل امرتسری جیسے کئی خوش آواز نعت خوان ''عندلیبان ریاض رسول'' کی حیثیت سے حضور کی بارگاہ میں نعت خوانی کرتے۔ مگر اعظم چشتی مرحوم کا اپنا رنگ تھا، اپنی ادا تھی، اپنی طرز تھی اور اپنا حسن وجمال تھا۔ وہ جہاں کھڑے ہو جاتے، تمام رنگ پھیکے پڑ جاتے۔

در محفلے کہ تو بمقابل نشستہء   وہاں شکستہ رنگ خجل ایستادہ اند

اساتذہ کے کلام کے ساتھ ساتھ اعظم نے اپنا کلام بھی سنانا شروع کیا تو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ اہل علم نے داد دی اور اہل سخن نے سراہا۔ ان کے اپنے کلام کے چار مجموعے آئے۔ ''رنگ وبو''، ''غذائے روح''، ''نیر اعظم'' اور ''انیندرے''۔ ان

مجموعوں میں گل ہائے رنگا رنگ تھے اور ہر زبان میں طبع آزمائی کی گئی تھی۔ اہل علم وفضل نے انہیں پسند کیا۔ صوفی غلام مصطفے تبسم، مولانا کوثر نیازی، حفیظ جالندھری اور فیض احمد فیض جیسے شعراء اور نقاد بے پناہ تعریف کرتے۔ ان کی نعت میں عشق رسول کی حلاوت بھی تھی اور رنگ تغزل بھی۔ بقول مولانا کوثر نیازی: ''نعت خواں اعظم، نعت خوان اعظم ہے''۔ ان کی نعت میں رنگ تغزل ملاحظہ فرمائیں۔

تو کائنات حسن ہے یا حسن کائنات   سمجھا نہیں ہنوز میرا عشق بے ثبات

وہ تیرا ذکر پاک ہے اے زینت حیات   جو ذکر زندگی کے فسانے کی جان ہے

اس انتظار میں کہ پھر وہ آئیں ایک رات   اب تک سجی ہوئی ہے ستاروں کی انجمن

ہے کبریا کا ہاتھ رسول خدا کا ہات   ارشاد مارمیت سے ظاہر ہوا یہ راز

میرے لیے تو ہے یہ سرمایہء حیات   ''اعظم'' میں ذکر شاہ زمن کیسے چھوڑ دوں

ان کی نعت میں رنگ تغزل نمایاں تھا اور غزل میں بوئے نعت نمایاں تھی۔

ہر بوالہوس کے ہاتھ میں پیانہ دیکھ کر   اعظم ہمارے ہاتھ سے پیانہ گر گیا

چشتی مرحوم نے عام نعت خوانوں کی طرح صرف مجالس نعت ومیلاد کو ہی اپنا محور نہیں بنایا اور نہ ہی نوٹوں کی آمد آمد پر نگاہیں جمائیں، وہ عام لوگوں کے ذوق وداد سے ہٹ کر اہل علم وفضل کی صحبت کو اختیار کرتے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے بلند پایہ خطیبوں، علماء اور نامور واعظوں کی مجالس میں رہتے تھے۔ وہ وقت کے ادیبوں، سخنوروں اور نقادوں کے پاس بیٹھتے تھے۔ علمائے اہل سنت میں سے مولانا شیخ القرآن عبد الغفور ہزاروی، مولانا غلام دین (انجمن شیڈ) اور مولانا محمد بخش مسلم (مسلم مسجد لاہور) رحمتہ اللہ علیہم آپ کے پسندیدہ خطیب تھے۔ یہ حضرات بھی جس جلسے میں جاتے، محمد اعظم

چشتی کو ساتھ لے جاتے۔ ان بزرگوں کی رفاقت چشتی مرحوم کی زندگی کا سرمایہ تھی۔ یہ اہل علم و بیان حضرات بھی اپنے وقت کے قادر الکلام خطیب تھے، جو چشتی مرحوم کی نعت کو اپنے خطاب و بیان کا دیباچہ بناتے۔ آج کا مقرر جب سٹیج پر آتا ہے تو لوگ اکتانے لگتے ہیں۔ مگر یہ چاروں حضرات جہاں جاتے، کسی کا جلسہ چھوڑ کر جانے کو جی نہ چاہتا۔ مولانا غلام دین کی خوش بیانی، مولانا مسلم کی مترنم تقریر، پھر مولانا ہزاروی کی نکتہ آفرینی اور منفرد انداز بیان، اس پر اعظم چشتی کی دلکش نعت دلوں پر بجلیاں گراتی جاتی۔ مجال ہے کوئی بھی ذوق اور محبت رکھنے والا شخص جلسہ چھوڑ کر باہر چلا جائے۔

نگاہ کے تیر سے گر بچ گیا شکار کوئی — تو بڑھ کے زلف نے اس کو اسیر دام کیا

میں نے ان چاروں کے جلسے دیکھے ہیں، ان کی تقریریں سنی ہیں، ان کے علمی نکتے سنے ہیں۔ رات گزر جاتی مگر سننے والے اپنی جگہ پر پتھر کی تصویر بن کر بیٹھے رہتے ہائے!

اہل دل کے کارواں کن وادیوں میں کھو گئے

محمد اعظم چشتی کے پاس اساتذہ کے کلام کا ایک زبردست ذخیرہ موجود تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری میں اہل سخن کے دیوان قطار در قطار رکھے نظر آتے وہ اساتذۂ سخن کے اشعار کو ازبر کرتے اور ان کا رنگ اپنی نعت میں لاتے۔ جامی و رومی کے انداز کو بے حد پسند کرتے۔

کشتۂ اندازِ ملا جامیم — نظم و نثر او علاج خامیم

کبھی کبھی تازہ کہی نعت مجھے بھی سنانے آجاتے اور اجازت دیتے کہ تنقید و تحسین کرو۔ بھلا میں شعر و سخن سے ناواقف، ہیچمدان کیا کہتا۔ مگر ان کا ذوق تھا، سرفراز فرماتے۔ میں نے ان کی ساری کتابیں چھپوا کر ملک بھر میں تقسیم کیں۔"

کلیات اعظم" کے کئی ایڈیشن چھاپے اور تقسیم کیے۔ اعظم مرحوم کی دریا دلی دیکھیے، نہ کبھی رائلٹی کا مطالبہ کیا، نہ کبھی اشارہ کیا۔ اگر میں چند کتابیں ان کی گاڑی میں رکھ دیتا تو فرماتے: "آپ اپنا نقصان کیوں کرتے ہیں، مجھ پر تو اللہ کی رحمت "نوٹوں کی شکل" میں بھی برستی رہتی ہے"۔

آج پاکستان میں نعتیہ محافل میں نوٹوں کے نچھاور کرنے کا رواج چل نکلا ہے۔ بے سرے اور غلط تلفظ والے نعت خوانوں کی نظریں سامعین کی جیبوں پر ہوتی ہیں۔ مگر میں نے اعظم کو نعت پڑھتے دیکھا ہے کہ ہزاروں روپے ان کے قدموں میں نچھاور ہو رہے ہیں مگر ان کی نگاہ کبھی کسی جیب یا ہلتے ہوئے ہاتھ کی طرف نہیں گئی۔ وہ فقیر بھی تھے اور امیر بھی تھے وہ تنگ دست بھی تھے اور کشادہ دل بھی تھے۔ وہ تہی دست بھی تھے اور غنی دل بھی تھے۔ ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ جواں سال بیٹا موت وحیات کی کشمکش میں ہے مگر اعظم چشتی کا ہاتھ کسی کے سامنے پھیلتا کبھی دکھائی نہیں دیا۔

میں گدا ہوں اپنے کریم کا، میرا دین پارۂ ناں نہیں

چند دنوں کے بعد خزانہ غیب سے اس قدر آتا کہ ہسپتال کے عملے کا ایک ایک فرد خوش ہو جاتا۔ یہ صدقہ ہے حضور کے دروازے پر خوش نوائی کا!

مجھے اعظم چشتی مرحوم نے تو نہیں بتایا البتہ ان کے احباب بتایا کرتے تھے کہ وہ صوفی غلام مصطفے تبسم، مولانا کوثر نیازی اور احسان دانش جیسے ارباب سخن سے اصلاح سخن لیا کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنا کلام دکھالیا کرتے تھے۔ طرز و ادا میں ابتدائی طور پر اپنے استاد حکیم فضل الٰہی مرحوم سے مشق کی، پھر بعض اساتذۂ فن سے آواز کی زیروبم میں اصلاح لی حتیٰ کہ فریدہ خانم جیسی فنکارہ خاتون سے بھی

فنی اتار چڑھاؤ میں حصہ لیا۔

دانہ می چیدیم ہر جائے کہ خرمن یافتیم

حیات مستعار کے آخری دنوں میں انہیں کئی بیماریوں نے آگھیرا تھا۔ وہ ان سے لڑتے رہے۔ اطباء اپنے علاج معالجہ میں لگے رہے مگر ان کی صحت گرتی رہی۔ مجھے چند علماء کرام کے ساتھ ان کی بیمار پرسی کا موقع ملا تو وہ اپنے بستر پر ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آتے تھے۔ کمرے میں جانے اور پریشان کرنے کی اجازت نہ تھی مگر میں صرف ''یک نگاہی دیدار'' کے بہانے اندر چلا گیا۔ پاس بیٹھا، انہیں گزرا ہوا زمانہ یاد دلایا۔ کروٹ بدل کر مجھے دیکھنے لگے۔ میں بات کرتا گیا بات بناتا گیا، باتیں سناتا گیا، ان کی زندگی کے واقعات دہراتا گیا۔ وہ اٹھ بیٹھے۔ پھر کیا تھا، بیماری دور تھی، گفتگو چل نکلی۔ زندگی کی کئی کہانیاں سنا گئے۔ سخن و شعر پر بات کرتے گئے، نعت و حمد کی مجالس کا ذکر کرتے گئے اہل محبت اور اہل دل کو یاد کرتے گئے۔ چار گھنٹے گزر گئے۔ میرے ساتھی محو حیرت تھے۔ چشتی صاحب کے چہرے پر رونق آگئی۔ ٹھنڈا شربت پلایا۔ گرم چائے کے دور چلے۔ جب میں نے اجازت مانگی تو کہنے لگے ''نصف بیماری '' چلی گئی ہے۔ سبحان اللہ! اہل ذوق بھی کن مراحل سے گزرتے ہیں۔

اعظم چشتی مرحوم نے فاضل بریلوی کی کہی ہوئی نعتوں کو خوش آوازی سے پڑھا، ترنم سے سنایا، وجد و ذوق سے پڑھا۔ عوام تک پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ بعد میں ان کے ہوتے ہوئے دوسرے نعت خوانوں نے بھی فاضل بریلوی کی نعتوں کو عام کرنے میں بڑا حصہ لیا اور اعلیٰ حضرت کی نعتوں کا عام رواج ہو گیا اور ملک میں ''جھوم جھوم اٹھے ہیں نغمات رضا سے بوستان'' کا سماں بندھ گیا۔ مگر اعظم چشتی

نے اس فیلڈ میں بہت اہم کام کیا۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت کے دیوان ''حدائق بخشش'' کا خاصا حصہ سنایا۔ ان پر تضمینیں کہیں۔ ان کی نعتوں کی زمین پر نعتیں لکھیں۔ ان کے خیالات کو اپنے الفاظ میں ڈھال کر اہل محبت کے دلوں کے پیمانوں میں انڈیلتے چلے گئے۔ لوگ ''کلام رضا'' اعظم کی زبان سے سنتے تو کانوں میں رس گھلتی محسوس ہوتی۔ دل و جگر کے کانٹے نکلتے دکھائی دیتے۔ وہ پڑھتے

کانٹا میرے جگر سے غم روزگار کا — یوں کھینچ لیجیے کہ جگر کو خبر نہ ہو

کہتی تھی یہ براق کو اس کی سبک روی — یوں جائیے کہ گرد سفر کو خبر نہ ہو

پھر وہ مکرر کہتے

پل سے گزارو راہ گزر کو خبر نہ ہو — جبریل پر بچھائیں تو پر کو خبر نہ ہو

دنیائے نعت میں اعظم چشتی مرحوم نے اپنا مقام پیدا کیا۔ ایک منفرد مقام، ایک ممتاز مقام۔ آج ملک کے ہزاروں نعت خوان زبان کھولتے ہیں تو کسی نہ کسی انداز میں اعظم کا رنگ سامنے آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اعظم کے دستر خوان نعت سے خوشہ چینی اور لقمہ اندوزی کی ہے۔ وہ کعب بن زہیر اور حسان بن ثابت کے راستے کے مسافر تھے۔ انہوں نے ''مجلس حسان'' قائم کی مگر نعت خوانوں کی ''بلند پروازیاں'' اور ''اڈاریاں'' ان کی تربیت گاہ سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ نعت رسول نے انہیں غربت سے امارت دی، گمنامی سے شہرت بخشی، دیہاتی سے شہری بنا دیا۔ وہ کئی بار بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے۔ کبھی اپنے پروں پر اڑ کر پہنچے، کبھی انہیں اہل محبت پلکوں پر بٹھا کر لے گئے۔ دیار حبیب کے علاوہ وہ دنیا کے مختلف ممالک میں بلائے گئے۔ جہاں گئے نعت رسول کی شیرینیاں بانٹتے گئے اور لوگوں کے دلوں پر

نعت گوئی کے سکے بٹھاتے گئے۔

ملک سخن کی شاہی تجھ کو رضا مسلم   جس طرف چل دیے ہیں سکے بٹھادیے ہیں

حضور کی بارگاہ نعت خوانی سے کبھی خالی نہیں رہی اور قیامت تک اس بارگاہ میں رونق رہے گی۔ آج بھی ہماری مجالس نعت سیکڑوں نعت خوانوں سے بھری پڑی ہیں۔ گلہائے رنگا رنگ سے رونق چمن باقی ہے، مگر اعظم چشتی کی آواز موت کے پردوں کے پیچھے چلی گئی ہے۔ اب ہمیں کون سنائے گا

تیرے گداؤں میں اے شہریار ہم بھی ہیں!

اللہ تعالیٰ اعظم چشتی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور اس کی قبر کو نبی کریم کی نگاہ التفات کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں سے معمور رکھے! (آمین)

(جہانِ رضا۔ لاہور اگست و ستمبر ۱۹۹۳ء)

ثنا خوان رسول و عندلیب ریاض مصطفیٰ

ثناء اللہ بٹ کی رحلت

ثناء اللہ بٹ نعت خوان رسول تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے پچاس سال ''ثنا خوانی رسول'' میں گزارے۔ وہ نعت کی مجالس کی جان تھے اور ساری زندگی اہل محبت کے دلوں کو سامان محبت مہیا کرتے رہے۔

آج موت نے انہیں ہم سے جدا کر دیا۔ مختصر سی علالت نے ثناء اللہ بٹ کو موت کی وادی میں پہنچا دیا۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ بارگاہ مصطفوی سے پیام محبت لانے والا طائر خوش نوا، وادی بقا میں جا بیٹھا وہ نبی پاک کا عاشق تھا۔ وہ حضور کی ثنا خوانی کے خیابان میں ایک صدائے محبت تھا۔ وہ محافل نعت کی رونق تھا۔ وہ ہمارا دوست تھا۔ وہ ہماری محفلوں میں نعت رسول پڑھتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے مرجھائے ہوئے پھولوں کی کلیوں میں جان پڑ گئی اور دل کے تاروں سے نغمے پھوٹنے لگے ہیں۔

ہم نے زندگی کی کئی راتیں ثناء اللہ بٹ سے بارگاہ مصطفیٰ میں نعت سنتے گزاریں۔ ہم نے کئی بار انہیں مجالس نعت میں گھنٹوں ثنا خوانی رسول میں وارفتہ پایا۔ ان کی وارفتگی اہل مجلس کے دلوں پر اپنے اثرات مرتب کرتی تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے محبوب کی ثنا خوانی میں بڑی نعمتوں سے نوازا تھا۔ وہ ہر زبان میں، ہر انداز میں اور ہر لہجہ میں نعت پڑھتا تھا اور اپنے سامعین کے دل و دماغ کو روشن کرتا جاتا تھا۔ ہم نے اسے ہزاروں کے مجمعوں میں نعت پڑھتے سنا۔ ہم نے اسے خصوصی مجالس میں نعت پڑھتے سنا ہم نے اسے ''شہر محبت'' مدینہ پاک کے ایوانوں میں نعت پڑھتے سنا،

ہم نے اسے خلوت کدوں میں نعت پڑھتے سنا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب اسے نہایت دھیمی آواز میں ''ریاض الجنۃ'' میں نعت پڑھتے سنا۔ مگر جہاں بھی سنا دل جھوم جھوم گیا۔ ثناء اللہ بٹ ایک درویش صفت نعت خواں تھا۔ اسے بلند پایہ اساتذۂ نعت سے تربیت ملی تھی۔ جو اپنے وقت کے معروف نعت خواں تھے۔ ان کے والد میاں رحمت علی گھنگ شریف کے مرید تھے اور اپنے پیر و مرشد کو حضرت جامی اور مولوی غلام رسول عالم پوری، سید فضل شاہ نواں کوٹی کے اشعار سنایا کرتے تھے۔ ان کے ماموں خورشید عالم بٹ اپنے وقت کے زبردست قاری تھے۔ قرآن پڑھتے تو سامعین اشک بار ہو جاتے تھے۔ ان کے دوسرے ماموں بشیر احمد بٹ بڑے دانشور تھے اور دینی کتابوں کا ذخیرہ رکھتے تھے اور پھر ان کا گہرا مطالعہ کرتے تھے۔ ثناء اللہ بٹ سکول کی تعلیم سے فارغ ہو کر محمد اعظم چشتی مرحوم کی شاگردی میں رہے اور ایک خوش نوا نعت خواں کی حیثیت سے ابھرے اور آہستہ آہستہ زبان و کلام کے اسرار و رموز کو نعت خوانی کے سانچے میں ڈھالتے چلے گئے۔

ثناء اللہ بٹ، مدینہ پاک میں جاتے تو اعلیٰ حضرت کے خلیفہ مجاز قطب مدینہ مولانا ضیاء الدین قادری رضوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس نعت میں اعلیٰ حضرت کا کلام سناتے تو داد پاتے۔ ہم نے انہیں فضیلت الشیخ مولانا فضل الرحمان مدنی کی مجالس نعت میں کئی بار اعلیٰ حضرت کی مشکل نعتیں پڑھتے سنا اور داد حاصل کرتے دیکھا اور انعامات کی بارش ہوتے پایا۔ مدینہ پاک کے قیام کے دوران وہ اہل محبت کی نجی مجالس نعت میں ساری ساری رات نعت پڑھتے رہتے۔ نہ تھکتے تھے نہ اپنے سامعین کو تھکاوٹ کا احساس ہونے دیتے تھے۔

وہ نعت پڑھتے تو الفاظ کے تلفظ کا بڑا اہتمام کرتے۔ خود شاعر نہیں تھے مگر نفیس شعراء کے کلام کا انتخاب کر کے اپنے سامعین سے داد پاتے، وہ عام محافل کے علاوہ علماء کرام کی مجالس کے پسندیدہ نعت خواں تھے۔ ''مرکزی مجلس رضا'' کے بانی حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم انہیں ہر سال ''یوم رضا'' پر خصوصی طور پر بلاتے اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کا کلام سنانے کی فرمائش کرتے۔ یہ محفل اہل علم و فضل سے بھی ہوا کرتی تھی۔ ثناء اللہ بٹ اس محفل میں ثناخوان رسول کی حیثیت سے مائک پر آتے۔ تو اہل علم سے داد پاتے۔ وہ ہمارے ذاتی محبوب نعت خوان تھے۔ ہم نے ماہنامہ ''جہان رضا'' میں دیار حرم میں ان کی نعت خوانی کی مجالس کا کئی مقامات پر ذکر کیا ہے۔ مدینہ پاک میں ایک محفل میں آپ نے ایک نعت کا آغاز کیا:

جو لوگ تیری زلف کے سائے میں مکیں ہیں   دراصل وہی وارث فردوس بریں ہیں

اس نعت پر وہ تضمین کرتے گئے۔ گرہ لگاتے گئے۔ پھر مختلف اساتذہ کے نعتیہ اشعار کے پیوند لگاتے گئے۔ رات کے دو بج گئے۔ سامعین انہیں اشکبار آنکھوں سے داد دیتے اور خوشگوار الفاظ میں تحسین کرتے جاتے تھے۔

ثناء اللہ بٹ کئی سال تک 'انجمن عندلیبان ریاض رسول' کے جنرل سیکرٹری رہے۔ وہ نعت کے پڑھنے کا انداز، طرز اور صحیح تلفظ کی ادائیگی اور حسن انتخاب کلام پر سختی سے کاربند تھے۔ وہ فلمی طرزوں پر نعت خوانی، غلط تلفظ کی ادائیگی، غیر معیاری کلام میں ثنا خوانی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات وہ ایسے نعت خوانوں کو برسر مجالس ٹوک دیتے تھے جو غلط الفاظ بولتے یا غیر معیاری کلام لے کر آتے تھے۔

اپنے ملک پاکستان میں شاید ہی کوئی شہر ہو جس کی مجالس نعت میں ثناء اللہ بٹ نہ گئے

ہوں اور وہاں کے لوگوں نے آپ کی نعت خوانی سے لطف نہ اٹھایا ہو۔ آج ملک کے نامور نعت خواں اپنے اپنے حلقوں میں نعت خوانی کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر خوش آواز ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر صاحب طرز ہے وہ ساری ساری رات نعت رنگ سے ان نورانی محافل کو حضور کی نعت سے معطر اور معنبر بناتے رہتے ہیں۔ مگر یہ سارے بلند پایہ نعت خواں، ہمارے ثناء اللہ بٹ کے دوست ہیں، ساتھی ہیں، ہمنوا ہیں، یہ عندلیبان ریاض رسول ہیں، یہ بلبلان باغ مدینہ ہیں، یہ نغمہ سرایان کوچہء مصطفیٰ ہیں۔ آج ان میں ثناء اللہ بٹ نہیں مگر اس کی روح یقیناً ان محافل میں حاضر ہوتی ہوگی اپنے دوستوں کو دیکھ کر خوش کام ہوتی ہوگی اور داد دیتی ہوگی۔

آج ہم اپنے دوست، ثنا خوان رسول، عظیم نعت خواں، ثناء اللہ بٹ کی یادوں کو تازہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائے اپنے محبوب نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کا شرف عطا فرمائے اور عاشقان رسول کی ارواح کو ہدیہ نعت سنانے کی توفیق دے۔ ہم جب تک مجالس نعت میں حاضر ہوتے رہیں گے، بارگاہ مصطفیٰ میں حاضری کی سعادت حاصل کرتے رہیں گے، مدینہ پاک کی گلیوں میں آتے جاتے رہیں گے ہمیں ثناء اللہ بٹ کی مترنم آواز سنائی دیتی رہے گی، اور ہم سنتے رہیں گے، اور جھوم جھوم کر پڑھتے رہیں گے:

کس کی زلفوں کی مہک لائی ہے بطحا سے نسیم
دل وجاں وجد کناں جھک گئے بہر تعظیم

(جہانِ رضا۔ لاہور اگست وستمبر ۲۰۰۵ء)

کوکب نورانی کی ایک آرام دہ گولی

علامہ کوکب نورانی ہمارے مہربان (بلکہ قدردان) ہیں۔ پچھلے دنوں ہم جناح ہسپتال لاہور کے ایک کمرے میں آپریشن کے بعد آرام کرنے پر مجبور تھے کہ علامہ نے کراچی سے ایک کتاب ''آرام دہ گولی'' بھیجی۔ اس پر نعت رنگ کا تجزیاتی وتنقیدی مطالعہ کا لیبل چسپاں تھا جسے پروفیسر شفقت رضوی کی قلم وفکر کی لیبارٹری نے تیار کیا تھا۔ پھر علامہ کوکب صاحب کا ایک ''تسلی بخش رقعہ'' (جسے میری نرس نے کیپسول کا نام دیا تھا) صفحات میں چھپ چھپا کر بھیجا۔ طبیبوں کا حکم تھا کہ مکمل آرام کریں ''باریش احباب'' کی بیمار پرسی کی آمد دیکھ کر سٹاف نے دروازے پر ''آرام، خاموشی، اور سکون'' کا لیبل لگا دیا تھا۔ مگر علامہ کوکب نورانی کی ''آرام دہ گولی'' میرے لیے سکون دل وجان بنی۔

پروفیسر شفقت رضوی نے میرے رفیق مکرم سید صبیح الدین احمد رحمانی کے ''مجلہ نعت رنگ'' کراچی سے چودہ نعتیہ پھولوں کو سجا کر ایک گلدستہ بنا کر قارئین کو دعوت مطالعہ دی ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ شفقت رضوی کو نعت رنگ کے چودہ شمارے حفظ ہیں۔ وہ جہاں ہاتھ بڑھاتے ہیں مضامین ان کے سامنے دست بستہ حاضر ہوتے چلے آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہیں گے کہ وہ گلستان نعت رنگ کے درمیان ایک بلند تخت پر جلوہ فرما ہیں۔ ہر پھول، ہر پتی، ہر ٹہنی ان کے اشارۂ قلم پر جھکتی چلی آتی ہے اور وہ گلہائے رنگا رنگ کے گلدستے بنا بنا کر اپنے قارئین کی جھولیاں بھرتے جاتے ہیں۔

ہم کتاب پر تبصرہ یا تجزیہ نہیں کر رہے۔ بلکہ اپنے یار مہربان کی اس ''آرام دہ گولی'' کا ذکر کر رہے ہیں جو اپریشن کے بعد ہمارے کمرے میں آئی اور سکون جان بنی۔ اس کتاب میں کہیں کہیں ہمارا بھی ذکر آ گیا۔ جو کوکب نورانی صاحب ''رجال الغیب'' بن کر اپنے بیمار کی آسانی کے لیے نشانات لگا کر ہماری تنہائیوں کے رفیق علالت بنے۔

خدایا! زندہ و پائندہ باشی!

(جہانِ رضا لاہور اگست۔ستمبر ۲۰۰۵ء)

دنیائے اسلام کی ایک نابغہء روزگار شخصیت

امام احمد رضا خان قادری بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

(ترتیب و ترجمہ۔ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی مرکزی مجلس رضا لاہور)

اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۵۶ء۔۱۹۲۱ء) دنیائے اسلام کی ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ انہوں نے زندگی بھر اسلامی موضوعات پر قلم اٹھایا اور دنیا کی دوسری معروف علمی شخصیتوں کی طرح کئی مختلف کتابیں لکھیں مگر ان کا سب سے اہم کارنامہ قرآن پاک کا اردو ترجمہ ہے جسے ''کنز الایمان'' کے نام سے ۱۹۱۱ء میں لکھا گیا تھا اور آج لاکھوں کی تعداد میں چھپ رہا ہے۔ پھر اسلامی قوانین پر آپ کے وہ مقالات (فتوے) ہیں جو آپ نے اپنی پچاس سالہ علمی زندگی میں فتاوٰی رضویہ کے نام سے ترتیب دیے تھے۔ مزید برآں انہوں نے ایک ریاضی دان اور ہیئت شناس سکالر کی حیثیت سے دنیائے علم کے سامنے ایسی کتابیں تصنیف کیں جو اہل فن کے سامنے رہنمایانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ پھر نعت رسول ﷺ پر آپ کا دیوان (حدائق بخشش) ہے۔ جس کا اردو ادب میں آج تک کوئی ثانی نہیں۔

حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمتہ اللہ علیہ ایک ایسے دینی اور علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کی علمی شہرت سارے برصغیر میں چھائی ہوئی تھی۔ اگر چہ ان کی مادری زبان اردو تھی اور ان کی اکثر تحریریں بھی اردو میں ہیں لیکن دنیائے اسلام کے ممتاز علمائے کرام اور ائمہ فقہ کی طرح آپ نے فارسی اور عربی میں بھی قلم اٹھایا اور

اپنی لسانی اور علمی قابلیت کالوہا منوایا۔ وہ ہندی میں، سنسکرت میں حتیٰ کہ انگریزی اور پرتگالی میں بھی ان استفسارات کا جواب دیا کرتے تھے جو انہیں مختلف ملکوں سے مختلف زبانوں میں موصول ہوتے تھے۔

حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمتہ اللہ علیہ یو پی کے ایک قصبہ بریلی میں ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ آپ کی پیدائش کے صرف ایک سال بعد برصغیر کے مسلمانوں کو انگریز کے خلاف جنگ آزادی لڑنا پڑی۔ آپ نے چار سال کی عمر میں قرآن پاک پڑھ لیا تھا، پھر تھوڑے ہی عرصے میں دوسرے علوم پر عبور حاصل کرلیا۔ یہ علوم قدیم اور جدید سائنس سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں مختلف مشرقی لسانی شعبے تھے اور ان علوم کی مختلف شاخوں پر اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا۔ اعلیٰ حضرت کی زندگی پر تحقیق کرنے والوں کا یہ فیصلہ ہے کہ آپ کو پچپن علوم پر عبور حاصل تھا۔ زندگی کے وسطی سالوں میں آپ نے ان موضوعات پر خصوصی توجہ دی۔

(۱) سیدالانبیاء ﷺ کے مقام کی عظمت اور آپ کی ذات کا دفاع۔

(۲) مسلمان معاشرے میں پھیلی ہوئیں بدعات کے خلاف جہاد۔

(۳) حنفی فقہ کی روشنی میں فتوؤں کا اجراء۔

(۴) اسلامی تعلیم وتدریس کی اہمیت کی وضاحت۔

امام احمد رضا خان رحمتہ اللہ علیہ ملک کی عملی سیاسیات میں حصہ نہ لے سکے۔ لیکن آپ نے اپنی پرزور تحریروں کے ذریعے ملک کی آزادی کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ آپ کے فلسفہ سیاست کی بنیاد قرآن اور حدیث پر تھی۔ آپ ہندو مسلم اتحاد اور موالات کے سخت خلاف تھے۔ یہ وہ بنیادی نقطہ ہے جسے ہم نظریہ پاکستان کی اساس

تصور کرتے ہیں۔ آپ نے بڑی جرأت مندی سے یہ بتایا کہ گاندھی کی دھوتی اور انگریزوں کی پتلون مسلمانوں کے بدن پر نہیں سجے گی۔ مسلمان صرف دین کے لباس میں ہی اچھا لگتا ہے اور اسے سرکار دوعالم ﷺ کے زیر سایہ ہی آگے بڑھنا ہوگا۔ آپ نے تحریک خلافت کو بھی مسلمانوں کے خلاف ایک حربہ قرار دیا اور مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ خلافت موومنٹ میں گاندھی کی سیاسی چالیں کس انداز سے کارفرما ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی ہی دراصل خلافت موومنٹ کا بانی تھا اور وہی مسلمانوں کو اپنے وطن اور آزادی وطن سے محروم کرنے کے لیے چالیں چل رہا تھا۔ اس نے تحریک خلافت کے پردے میں جذباتی مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کرلیا تھا کہ وہ ہندوستان کی سرزمین سے اپنی جائیدادیں بیچ کر افغانستان کا رخ کریں۔ اگر اس وقت کے افغان حکمران مسلمانوں کو افغانستان میں داخل ہونے سے نہ روکتے تو آج برصغیر مسلمانوں سے بالکل خالی ہوتا اور ہندو مکمل طور پر بلاشرکت غیرے ہندوستان کے مالک ہوتے۔

حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے ریاضی دان اور معاشی سکالر بھی تھے۔ لیکن یہ بات قابل افسوس ہے کہ اس وقت کی علمی دنیا نے آپ کی طرف توجہ نہ دی اور آپ کے علمی مقام سے انصاف نہ کیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں دنیا نے کینز کے فلسفہ مساوات کی تو تعریف کی لیکن جس شخص نے ۱۹۱۲ء (چوبیس سال پہلے) اس فلسفے کو پیش کیا تھا اس کو نظر انداز کردیا گیا۔ اعلیٰ حضرت نے ۱۹۱۲ء میں دنیا کے مسلمانوں کو اپیل کی تھی کہ وہ اپنا ایک علیحدہ بنک قائم کریں اور سودی نظام کے بغیر آپس میں لین دین کریں۔ لیکن اس وقت بھی مسلمانوں نے آپ کی اس آواز پر لبیک نہ کہا اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۱۹۴۰ء تک ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک بھی بنک وجود

میں نہ آسکا۔ انگریز اور ہندو نے مل کر اس ملک کا اقتصادی اور معاشی نظام سود پر رکھا۔ آپ نے اس وقت سود کے خلاف بہت سی کتابیں لکھیں اور اس معاشی نقطے پر زور دیا کہ بلاسود بنکاری کو فروغ بھی دیا جاسکتا ہے اور عملی طور پر ایک بہتر معاشی نظام قائم ہوسکتا ہے۔ لیکن اس وقت مسلمانوں کے ذہن آپ کے اس فلسفہ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے تھے پھر آپ نے مسلمانوں کو ایک اور تجویز دی کہ وہ صرف مسلمان دکانداروں سے ہی اپنی ضروریات زندگی خریدیں اور ہندو اور انگریز دکانداروں سے مکمل مقاطعہ کریں لیکن اس وقت تک مسلمان معاشرہ آپ کے اس معاشی فلسفے تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔

حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فقہ کے امام، دینی علوم کے ترجمان اور اسلامی سیاست کے مفکر تھے۔ آپ نے بہت سی اصطلاحات پیش کیں، لیکن ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ آپ نے جس چیز کو بنیادی نقطہ بنایا وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق تھا۔ حضور کے عشق کے معاملے میں نہ کبھی مصلحت کوشی کو سامنے آنے دیا اور نہ ہی کسی قسم کی مصلحت کو جگہ دی۔ ہم اعلیٰ حضرت بریلوی کی زندگی کے مختلف کارناموں کے اپنے معاصرین اور ملک کے بلند پایہ مفکرین کے حوالے سے چند نقطے بیان کرتے ہیں۔

شیخ علی بن حسین مالکی مکی لکھتے ہیں۔ ''حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ علم و فضل کا ایک بنیادی نقطہ ہیں اللہ تعالیٰ نے جس وقت مجھے ان کی محبت سے متاثر کیا تو میں نے اپنی روشن آنکھوں سے اس آفتاب معرفت کی شعاعیں دیکھیں، میں ذاتی طور پر آپ کی تحریر اور آپ کی گفتگو کو روشنی کا بحر ناپیدا کنار تصور کرتا ہوں۔ آپ کی علمی روشنیوں سے ساری دنیا جگمگا اٹھی اور یہ وہ روشنیاں تھیں جن سے ہر ملک و ملت کے علم

دوست انسانوں نے استفادہ کیا۔ آپ ایک فاضل یگانہ اور نابغہء روزگار ہستی کے مالک تھے۔ آپ کے شاندار علمی کارنامے آپ کی قابلیت اور ذہانت کی ترجمانی کرتے تھے اور ایسا کیوں نہ ہو آج کی دنیا میں وہ علم کے محور کا مرکزی نقطہ ہیں، وہ علم و فضل کے آسمان کے ستاروں کو روشنی بخش رہے ہیں۔ وہ ملت اسلامی کے لیے روشنی کا مینار ہیں، وہ ان رہنمایان قوم کی بھی رہنمائی کرتے ہیں جو دنیا کے دور دراز حصوں میں لوگوں کو علم و فضل کی خیرات بانٹ رہے ہیں، وہ اپنے دلائل اور شواہد کی تیز تلوار سے گمراہوں اور بے دینوں کی زبان کاٹنے پر قادر ہیں۔ یہ آپ کی شخصیت ہے جس نے ایمانی اور روحانی روشنیوں کے مینار بلند کیے اور یہ آپ کا ہی لقب ہے جسے دنیا آج حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔''

پاکستان سپریم کورٹ کے جج اور چیف الیکشن کمشنر جناب عبدالعلیم صاحب نے لکھا تھا ''حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ساری زندگی اسلام اور مسلمانوں کے لیے وقف کردی تھی۔ آپ کی علمی شخصیت ہمارے اسلاف کی نشانی ہے، آپ ایک تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ ہم دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسلامی تاریخ کا ایک درخشاں باب تھے۔ اعلیٰ حضرت کی علمی بلندی کو یوں سامنے رکھا جاسکتا ہے کہ آپ نے اپنی ساری زندگی ثنائے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں وقف کردی تھی۔ وہ حضور کی ذات اقدس پر حملے کرنے والوں کے خلاف لڑتے رہے، انہوں نے حضور کی سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر مقالات لکھے اور اپنی تقاریر سے لوگوں کے دل و دماغ کو روشن کردیا۔ پھر حضور کی شریعت مطہرہ کو لوگوں میں رائج کرنے کے لیے دن رات ایک کردیا تھا۔ اعلیٰ حضرت جیسے عظیم الشان عالم دین کے قلم سے لکھی ہوئی

کتابیں آج بھی اسلامی دنیا کے اہل علم وفضل کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ان تحریروں سے دل ودماغ روشن ہوتے ہیں اور قیامت تک روشن ہوتے رہیں گے۔''

حکیم محمد سعید صاحب چیئر مین ہمدرد فاؤنڈیشن آف پاکستان کراچی جو ایک عالمی شہرت کے سکالر ہیں لکھتے ہیں'' فاضل بریلوی ایک ہمہ دان شخصیت تھے انہیں اسلامی قوانین پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ سابقہ صدی میں دنیائے اسلام کے جس قدر مقتدر علماء ہوئے ہیں ان میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کا نام نصف النہار آفتاب کی طرح درخشاں ہے۔ آپ کے علم، دینی خدمات اور اعتقادی توضیحات کا دائرہ بے پناہ وسعتوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ آپ نے اسلامی فقہ کی تشریح اور توضیح میں قائدانہ مقام حاصل کیا تھا۔ مسائل کے حل کرنے میں ان کی بے پناہ صلاحیت مثالی تھی۔ وہ اس قدر علمی بلندیوں کے مالک تھے کہ سابقہ ادوار کے فقہاء اور محدثین کے مقالات اور تحریریں ان کے حافظے کے سامنے صف بستہ کھڑی تھیں۔ ان کے سامنے ماضی کے سائنسی تجربات اور میڈیکل سائنس کے سکالرز اپنے تجربات لے کر یوں کھڑے تھے جیسے وہ کسی کمی کو پورا کرنے کے ملتجی ہوں۔ آپ دینی علوم کے ساتھ ساتھ جب ان علوم پر لطیف نکات بیان کرتے تو یہ سکالرز دنگ رہ جاتے۔ آپ کی شخصیت کی مقناطیسیت آج کے میڈیکل سائنس کے سکالروں اور طالب علموں کو یکساں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ آپ کی تحریریں ایسے لوگوں کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ آگے بڑھیں انہیں پڑھیں اور زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے ان پر غور کریں۔ آپ کے مقالات اور تصانیف میں سے ہمارے لیے جو سب سے گراں قدر علمی سرمایہ ہے وہ آپ کا'' فتاوٰی رضویہ'' ہے۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ آپ کے

اس فتاوٰی پر اور دوسری تصانیف پر تحقیقاتی کام کیا جائے۔ ہم آپ کی تحریروں کی روشنی میں خواہ وہ سائنسی ہوں یا دینی معلومات کے بے پناہ خزانے حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم دنیائے علم میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ لکھتے ہیں:'' حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں کی سیاسی آزادی پر یقین رکھتے تھے لیکن وہ اس آزادی میں بت پرستوں اور مشرکین کو اتحاد اور مواخات کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ آپ کی آج تک جتنی کتابیں سامنے آئی ہیں ان کی تعداد ایک ہزار سے تجاوز کر گئی ہے۔ آپ کی شخصیت اور آپ کی تصانیف کا آپ کے ماننے والوں پر اتنا اثر ہے کہ وہ کسی دوسرے ہمعصر سکالر کو خاطر میں نہیں لاتے اور نہ ہی کسی دوسرے سکالر کی تحریریں انہیں مطمئن کر سکتی ہیں۔ تحریک خلافت کے ابتدائی دنوں میں علی برادران (محمد علی جوہر اور شوکت علی) نے آپ سے ملاقات کی تاکہ آپ سے تحریک ترک موالات کے معاہدے پر فتوٰی حاصل کر سکیں۔ امام احمد رضا خان نے فرمایا'' مولانا! تمہاری سیاست اور میرے سیاسی نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے آپ لوگ ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں جب کہ میں صرف مسلم اتحاد اور ان کی برتری پر ہی یقین رکھتا ہوں'' جس وقت امام احمد رضا نے محسوس کیا کہ علی برادران بڑے مایوس اور شکستہ خاطر ہوئے ہیں تو آپ نے فرمایا'' مولانا! میں مسلمانوں کی سیاسی آزادی کے خلاف نہیں ہوں میں تو صرف ہندو مسلم اتحاد کے خلاف ہوں۔''

اس مخالفت کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی یہ دلائل دیتے تھے کہ یہ مذہبی رہنما ہمارے اس اتحاد کو اس لیے اچھا نہیں سمجھتے کہ وہ انگریز کے یہاں سے جانے پر رضا مند نہیں ہیں۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی نے مولانا عبد

البار ی فرنگی محلی کے اس شبہ کو دور کرتے ہوئے ان کی تحریروں اور سیاسی سرگرمیوں کے خلاف تعاقب کیا تھا۔ (ان تعاقبات کی تفصیلات ''تنقیدات وتعاقبات'' نامی کتاب مطبوعہ مکتبہ نبویہ لاہور میں دیکھی جاسکتی ہیں) ایک وقت آیا کہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے اپنی سیاسی غلطیوں کا اعتراف کیا اور لکھا ''میں نے بہت سے گناہ کیے ہیں یہ گناہ دانستہ بھی تھے اور نادانستہ بھی آج مجھے ان پر ندامت ہے میں ان سے لفظی تحریری اور عملی طور پر دستبردار ہوتا ہوں مجھ سے یہ ساری غلطیاں اس لیے سرزد ہوئیں کہ میرے وہم وخیال میں بھی نہ تھا کہ یہ گناہ ہیں اب چونکہ مولانا احمد رضا خان بریلوی جیسے مقتدر عالم دین نے میرے سامنے ان کی وضاحت کی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ اسلام کے خلاف نظریہ ہے لہذا میں ان تمام باتوں سے رجوع کرتا ہوں اب میرے لیے کوئی فیصلہ یا مثال نہیں رہی کہ میں انکار کرسکوں۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ مولانا احمد رضا خان صاحب کے خیالات درست اور صحیح تھے۔''

پروفیسر ڈاکٹر منظور الدین احمد سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی لکھتے ہیں ''حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمتہ اللہ علیہ اس صدی کے مجدد تھے میں آپ کی بہت سی کتابیں لکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ نے واقعی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے۔ میں نے آپ کا فتاوی رضویہ پڑھا۔ پھر آپ کی سو سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابوں کا مطالعہ کیا میں اس بنیاد پر آپ کو مجدد کہنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ جن علمائے کرام نے خصوصاً مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے ارباب علم نے امام احمد رضا کو دیکھا تھا ان کی تحریریں جب میرے سامنے آئیں تو وہ میرے ہم خیال ہو کر آپ کو مجدد ہی مانتے تھے۔

حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ بڑے بڑے علمی موضوعات پر بھرپور دسترس رکھتے تھے۔ وہ سوال کرنے والے کو اسی کی زبان اور اسی کے انداز میں جواب دیتے تھے اگر کسی نے منظوم سوالات بھیجے ہیں تو آپ نے جوابات بھی منظوم ہی دیے۔ اس طرح آپ کے فتوے، نثر، نظم، عربی، فارسی اور اردو میں یکساں دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے آپ کے ''فتاوی رضویہ'' کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا، میں ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ نہایت ہی بلند پایہ تحقیقی اور معیاری تحریر ہے۔ ایک مقام پر تو آپ نے صرف ایک مسئلہ حل کرنے کے لیے ایک سو پچاس علمی ذرائع اور حوالے تحریر کیے ہیں''

ڈاکٹر جمیل جالبی جو کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور ان دنوں مقتدرہ قومی زبان اردو کے چیئرمین ہیں لکھتے ہیں ''حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمتہ اللہ علیہ بڑی ہی بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے ہزاروں اہل علم نے آپ کی ذات سے علمی روشنی حاصل کی۔ آپ کی سب سے ممتاز صفت یہ تھی کہ وہ ایک عاشق رسول ﷺ تھے۔ میرے نزدیک آپ کی یہ صفت آپ کے تمام دوسرے علمی اور عملی اوصاف سے بلند تر ہے آپ نے اپنی کتابوں اور رسالوں میں جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے وہ نبی کریم ﷺ کی محبت ہے۔ ان کا اردو ترجمہ قرآن پاک، ان کی احادیث کی وضاحت، ان کے فقہی نتائج، ان کی شرعی تشریحات پھر ان کے مختلف مسائل پر تحقیقات کو سامنے رکھا جائے تو لفظ لفظ، حرف حرف، نقطہ نقطہ میں حضور نبی کریم ﷺ کی محبت کے انوار جھلکتے نظر آئیں گے۔ آپ کی نعتیہ شاعری (حدائق بخشش) کو سامنے رکھیں تو یہ کوئی روائتی اور رواجی شاعری نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسے شاعر کا کلام

ہے جو حضور نبی کریم ﷺ کے عشق میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ آپ کے دیوان (حدائق بخشش) کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات ماننا پڑے گی کہ امام احمد رضا خان بریلوی نے نہایت خوبصورت انداز میں حضور کی زندگی کو پیش کیا ہے میرا یہ دعوی ہے کہ نعت کی دنیا میں آج تک ایسا کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا جو امام احمد رضا خان بریلوی کے مقابلے میں کھڑا ہو سکے۔''

ڈاکٹر وحید قریشی جو کسی زمانہ میں ''مقتدرہ قومی زبان اردو'' کے چیئرمین تھے اور ان دنوں ''بزم اقبال لاہور'' کے صدر نشین ہیں لکھتے ہیں ''حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی وسعتیں اور فقہی اور تحقیقی گہرائیاں ہمارے اندازہ و بیان سے باہر ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے دنیا کے اہل علم کو متاثر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے پیغامات سے مسلمانوں کو اس وقت آگاہ کیا تھا جس وقت برصغیر میں مسلمانوں کی نہ کوئی سیاسی حیثیت تھی اور نہ ان کا تہذیبی مقام تھا۔ برصغیر پاک و ہند کے تمام مسلمان مختلف تہذیبوں کے بوجھ میں دبے ہوئے تھے وہ احساس کمتری، جہالت اور افلاس کا شکار تھے۔ اعلیٰ حضرت نے اس قوم کو بیدار کرنے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ آج ہمارا ملک بہت ہی خطرناک حالات سے گزر رہا ہے وہ بیرونی اور اندرونی خطرات کی زد میں ہے ان حالات میں یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پیغامات اور تحریروں کو ہر جگہ پھیلا دیں۔ ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ایک منظم طریقہ کار اختیار کریں اور اعلیٰ حضرت کی کتابوں کی اشاعت کو اتنا عام اور عام فہم کر دیں کہ پاکستان کا بچہ بچہ ان سے مستفید ہو سکے''۔ ڈاکٹر وحید اشرف صاحب بڑودہ یونیورسٹی بھارت لکھتے ہیں ''

دنیائے اسلام میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی جنہوں نے اپنے اپنے دور میں لوگوں کو علمی چشموں سے فیضیاب نہ کیا ہو۔ بوعلی سینا، عمر خیام، امام فخر الدین رازی، امام غزالی، البیرونی، فارابی، ابن رشد اور ان جیسی بہت سی مقتدر شخصیتیں گزری ہیں جن کے علمی کارناموں پر اہل علم و فضل رہتی دنیا تک فخر کرتے رہیں گے۔ ایسے ہی لوگوں میں فلاسفر، سائنس دان، ریاضی دان اور ستارہ شناس اپنے اپنے وقتوں میں رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ یونانی فلسفہ نے دنیا کے تمام اہل علم کو متاثر کیا تھا اور ان کے تجربات آج تک انسانیت کی راہنمائی کر رہے ہیں، لیکن یہ بڑی ہی قابل فخر بات ہے کہ ہمارے برصغیر پاک و ہند میں ایک ایسی شخصیت ابھری جس نے اس صدی میں علمی بلندیوں کو اجاگر کر دیا۔ یہ تھے حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ جن کے سامنے دنیا بھر کے اہل علم جھولیاں پھیلائے کھڑے نظر آتے ہیں''

نوٹ: (یہ مضمون سید ریاست علی قادری ''صدر ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی'' نے انگریزی میں لکھا تھا جسے ہم ترجمہ کرنے کے بعد، بشکریہ پاکستان ٹائمز لاہور شائع کر رہے ہیں۔)

(ماہنامہ جہانِ رضا لاہور۔ ستمبر ۱۹۹۱ء)

امام اہلسنت و جماعت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں محدث بریلوی اور فقہ حنفی

حضرات محترم! مجھے "امام اہل سنت و جماعت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی اور فقہ حنفی" پر اظہار خیال کا موقع دیا گیا ہے۔ یہ موضوع علمی اور فنی اعتبار سے اتنا وسیع اور وقیع ہے کہ جس پر لب کشائی کرنا ایسے ہے، جیسے علم وفضل کے بحرالکاہل کی بے پناہ وسعتوں کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی آواز کو پھیلایا جائے۔ پھر ایسی محفل میں جہاں عصر حاضر کے نامور علماء کرام اور فقیہان وقت موجود ہوں وہاں اظہار خیال کرنا اپنی علمی بے بضاعتی کا اشتہار دینا ہے۔

حضرات محترم! "فقہ" عربی ادب میں ایسا لفظ ہے، جسے کسی چیز کو کھول کر نمایاں کرنے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جاہلی ادب میں کسی لطیف چیز کے انشراح اور اس سے نفیس نتائج کے برآمد کرنے کے عمل کو فقہ کہا جاتا تھا۔ اسلام کی روشنیاں آئیں تو قرآن واحادیث کے مضامین کو کھل کر بیان کرنے، اس کے مفہوم کو خوش اسلوبی سے بیان کرنے کے عمل کو فقہ کہا جانے لگا۔ قرآن کریم نے فقاہت کو اہل علم وفضل کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ پھر احادیث کے شارحین اپنی فقاہت سے ہی دلوں کو روشن کرتے رہے ہیں۔

اسلام کی روشنیوں نے حجاز مقدس سے نکل کر کائنات ارضی کے مختلف خطوں کو درخشاں کرنا شروع کیا تو قرآن وحدیث کی علمی اور روحانی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے صحابہ کرام اور ائمہ اسلام نے جو اہم کردار ادا کیا، وہ فقہ کی ابتدائی منزل تھی جسے آگے چل کر حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت احمد بن حنبل، حضرت امام شافعی

اور حضرت امام مالک رضی اللہ عنہم نے بام عروج تک پہنچایا۔ ان ائمہ مذہب نے قرآن واحادیث کے مطالب ومعانی کو کائنات کے گوشے گوشے تک پہنچانے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ فقہ کے ان بلند مراتب ائمہ میں سے حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے قرآن واحادیث کی روشنیاں پھیلانے کے لیے فقہ کے وہ اصول مرتب کیے، جس سے چاردانگ عالم روشن ہو گئے۔ عالم اسلام کے افق پر فقہ حنفی نے اسلامی معاشرہ کی راہنمائی کے لیے بے مثال کردار ادا کیا اور امام اعظم ابو حنیفہ کے تلامذہ اور فیض یافتہ شاگردوں نے فقہ حنفی کی روشنی میں قرآن واحادیث کے مطالب کو دور دور تک پھیلایا۔

برصغیر پاک وہند میں اسلام کا علمی اور روحانی قافلہ فقہ حنفی ہی کی راہوں پر چل کر پہنچا اور اسلامی سلطنت کا مشرقی علاقہ فقہ حنفی کے انوار سے روشن ہوا۔ عالم اسلام کے دوسرے ممالک سے قطع نظر، برصغیر پاک وہند میں فقہ حنفی نے اسلامی معاشرت کے لیے جو قانون وضع کیے، وہ بلا امتیاز مذہب وملت تمام انسانوں کے لیے رحمت ثابت ہوئے۔ اگرچہ برصغیر میں فقہاء اسلام نے صدیوں اپنا علمی کردار ادا کیا مگر بیسویں صدی میں خصوصیت کیساتھ امام اہلسنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ حنفی کو فروغ دینے اور شریعت کے قوانین کو مربوط کرنے میں جو اہم کردار ادا کیا، اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی ان فقہی کوششوں کو دیکھ کر مفکر اسلام علامہ اقبال نے کہا تھا "فاضل بریلوی ہمارے وقت کے امام ابوحنیفہ ہیں"

امام اہل سنت مولانا احمد رضا خاں محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۱ء تک فقہ حنفی کی تدوین وتشریح میں سرگرم عمل رہے انہوں نے

پچاس سے زیادہ علوم پر کتابیں لکھیں مگر فقہ حنفی پر ان کی کتابوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ انہوں نے ایک ایک مسئلہ کو فقہ حنفی کی روشنی میں حل کیا اور اہل علم وفضل کی راہنمائی کی۔ آپ کے فتاویٰ رضویہ کی بارہ، ضخیم اور مبسوط جلدیں فقہ حنفی کا ایک بے مثال انسائیکلوپیڈیا ہیں، جس سے آج ہر مکتب فکر دینی مسائل کے حل کے لیے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔

حضرات محترم! میں دنیائے اسلام کے اس فقیہ اعظم کی اجتہادی اور فقہی تشریحات کی مثالیں بیان کر کے آپ کے ذہنوں کو گراں بار نہیں کرنا چاہتا مگر چند مثالیں پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو تقویت پہنچانے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے فقہی مسلک کے صرف ترجمان ہی نہ تھے بلکہ موجودہ مسائل کو اجتہادی انداز سے حل کرنے میں کمال رکھتے تھے۔ آپ نے تیمّم کے موضوع کو فقہ حنفی کی روشنی میں بیان کرتے ہوئے تین سو گیارہ امور کی وضاحت فرمائی۔ پھر بتایا کہ زمینی تعلق کے پیش نظر ایک سو اکیاسی چیزوں پر تیمم جائز ہے۔ ان ایک سو اکیاسی میں سے چوہتر (۷۴) وہ ہیں جو سابق فقہا نے بیان کی ہیں مگر ایک سو سات وہ ہیں جنہیں اعلیٰ حضرت نے اپنے فقہی اجتہاد سے امام ابوحنیفہ کے مذہب پر بیان کیا۔ اس طرح آپ نے ۱۳۰ ایسی اشیاء کا تجزیہ کیا جو بظاہر زمین کا جزو دکھائی دیتی ہیں مگر ان پر تیمم جائز نہیں۔ عصر حاضر کے ایک نامور دانشور حکیم محمد سعید صاحب دہلوی رئیس ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان نے جب اعلیٰ حضرت کی اس تحقیقاتی کتاب کو پڑھا تو مرکزی مجلس رضا لاہور کو لکھا کہ میں اس ضمن میں اعلیٰ حضرت کی طبی بصیرت پر ہدیہء تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا، جس میں انہوں نے اظہار خیال فرمایا

ہے جو ہمارے خیال میں عام حیثیت رکھتی تھیں۔

خواجہ حسن نظامی دہلوی مرحوم برصغیر پاک وہند میں خانقاہی نظام کے ایک اہم رکن ہی نہ تھے بلکہ ان کا شمار ارباب قلم وعلم میں نمایاں ہوتا تھا۔ وہ بعض سجادہ نشینان وقت کی طرح ''سجدۂ تعظیمی'' کے قائل تھے مگر اعلیٰ حضرت عظیم البرکت نے شریعت محمدی میں غیر اللہ کے لیے ہر قسم کے سجدہ کو حرام قرار دیتے ہوئے ایک مستقل کتاب لکھی جس میں متعدد آیات قرآنی، چالیس احادیث نبوی اور ڈیڑھ سو نصوص فقہ پیش کرتے ہوئے اہل علم وفضل کے لیے راہنمایانہ اصول مرتب کیے اور بتایا کہ شریعت مطہرہ میں اللہ کے بغیر کسی قسم کے سجدے کی اجازت نہیں۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے فقہا کے مختلف طبقات کی تحریروں کو سامنے رکھا اور ان سے فقہ حنفی کی روشنی میں مسائل کا حل پیش کیا۔ آپ کے سامنے مجتہدین فی الشرع، مجتہدین فی المذاہب، مجتہدین فی المسائل، اصحاب تخریج، اصحاب ترجیح، ممیزین اور مقلدین کی بے شمار تحریریں ذہن میں موجود تھیں۔ آپ نے ان تمام طبقات کی تحقیقات وتنقیحات کی روشنی میں فقہ حنفی کی اہمیت کو نمایاں کیا۔

میں اسلامی تاریخ کے ان عظیم الشان فقہاء کا موازنہ تو نہیں کرنا چاہتا مگر میں اس حقیقت کو علیٰ وجہ البصیرت واضح کرنا چاہتا ہوں کہ امام احمد رضا نے علامہ شامی، علامہ طحطاوی جیسے سیکڑوں عظیم المرتبہ فقہاء کی تحریروں پر گفتگو کرتے ہوئے کمال نتائج اخذ فرمائے ہیں۔ برصغیر پاک وہند کے وہ فقہاء جو فتویٰ نویسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے اعلیٰ حضرت کی گرفت کے سامنے طفل مکتب ہی نظر نہیں آتے، بلکہ ''طفلان غلط نویس'' دکھائی دیتے ہیں۔

حضرات مکرم! میں اپنے اس مختصر سے مقالے میں اعلیٰ حضرت کے ان معاقبات کی مثالیں پیش نہیں کرنا چاہتا۔ جہاں آپ نے اپنے ہم عصر فقیہان پاک و ہند کو فقہ حنفی کی چکا چوند روشنیوں میں مبہوت کر کے رکھ دیا تھا۔ آپ نے فقہ امام ابو حنیفہ کی صرف ترجمانی ہی نہیں کی بلکہ اپنے رفقاء اور شاگردوں کا ایک ایسا ”مکتب فقہ“ ترتیب دیا جنہوں نے آپ کے بعد فقہی دنیا میں راہنمایانہ کردار ادا کیا۔ حضرت مولانا امجد علی اعظمی آپ ہی کے دستر خوان فقہ کے خوشہ چیں تھے، جنہوں نے ”بہار شریعت“ جیسی اہم کتاب سترہ جلدوں میں مرتب کی۔ مولانا رکن الدین الوری ”خیابان رضا“ کے خوشہ چیں تھے، جنہوں نے آٹھ جلدوں میں ”رکن الدین“ لکھی۔ علامہ سید ابوالبرکات سید احمد قادری آپ کے ہی دستر خوان علم کے لقمہ چیں تھے، جنہوں نے ”فتاوٰی برکاتیہ“ کی دس جلدیں مرتب کیں۔

فقیہ عصر مولانا محمد نور اللہ صاحب نعیمی بصیر پوری آپ ہی کے فیضان سے تربیت یافتہ تھے، جنہوں نے چھ جلدوں میں ”فتاوٰی نوریہ“ ترتیب دیا۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی آپ ہی کے مکتب فقہ کے طالب علم تھے، جنہوں نے ”فتاوٰی نعیمیہ“ سے ہماری راہنمائی فرمائی۔ مولانا انوار اللہ حیدر آبادی آپ ہی کے زیر نگاہ تھے، جنہوں نے ”گلزار شریعت“ مرتب کی۔

آج ہم فخریہ طور پر امام اہل سنت فاضل بریلوی اعلیٰ حضرت احمد رضا خان محدث بریلوی کو امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی فقہ کا ترجمان اور پاسبان قرار دے رہے ہیں۔ آج جنوبی افریقہ آزاد ہوا ہے تو وہاں کی گورنمنٹ نے اعلیٰ حضرت کے ”فتاوٰی افریقہ“ اور فتاوٰی رضویہ“ کو وہاں کے مسلمانوں کے لیے ”پرسنل لا“ کے فیصلوں کے لیے منظور کیا ہے۔ آج عراق کے صدر صدام حسین نے ”فتاوٰی رضویہ“ کا عربی

میں ترجمہ کرنے کے لیے علماء کرام کا ایک بورڈ تشکیل دیا ہے اور مجھے یہ اعلان کرنے کی اجازت دیں کہ اگر ہم پاکستان میں نظام مصطفیٰ اور نفاذ شریعت میں کامیاب ہو گئے تو ہمارے شرعی مسائل یقینی طور پر ”فتاوی رضویہ“ کی روشنیوں میں حل ہوں گے اور ہمارے دینی مسائل کے حل کے لیے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی تشریحات مینارۂ نور ثابت ہوں گی۔

نوٹ: یہ مقالہ مورخہ ۲۵ نومبر 1995 کو امام اعظم کانفرنس، منعقدہ ہوٹل فلیٹیز لاہور میں پڑھا گیا۔

(ماہنامہ جہانِ رضا لاہور۔ دسمبر ۱۹۹۵ء)

پاکستان میں افکار رضا کے زاویئے

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت شاہ احمد رضا خان بریلوی رحمتہ اللہ علیہ ایک نابغہ روزگار شخصیت کے مالک تھے آپ نے اپنی علمی اور فکری رسائی سے جو تجدیدی کارنامے سر انجام دیئے ہیں اس کا اعتراف دنیا بھر کے اہل علم و دانش کر رہے ہیں۔ یہی تجدیدی کارنامے تھے جن کی وجہ سے دنیائے علم وفکر نے انہیں بیسویں صدی کا مجدد (مجدد مأۃ حاضرہ) تسلیم کیا ہے۔ آپ کی علمی اور اعتقادی خدمات پر ہزاروں کتابیں، لاکھوں مضامین لکھے گئے ہیں۔ ہم اس بے مثال شخصیت کے افکار کی اشاعت کے ان ''زاویوں'' کا ذکر کریں گے۔ جو ہماری یادوں کے گوشوں میں محفوظ ہیں۔

قیام پاکستان سے پہلے ہمیں اتنا شعور نہ تھا کہ ہم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں رحمتہ اللہ علیہ کے علمی مقام تک رسائی حاصل کر سکتے۔ انجمن حزب الاحناف کے تقسیم اسناد کے سالانہ جلسوں میں اعلیٰ حضرت کی نعتیں سنا کرتے تھے۔ بعض علمائے کرام کی تقاریر میں اعلیٰ حضرت کا نام سنتے تھے۔ جب علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمتہ اللہ علیہ (خلیفہ مجاز اعلیٰ حضرت) کی مجالس تک رسائی نصیب ہوتی تو وہ اعلیٰ حضرت کی کوئی نہ کوئی چھپی ہوئی کتاب دکھاتے، پھر جب ہم اپنے استاد مکرم مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی زیارت کو دربار جایا کرتے تو بازار میں کتابوں کی ایک دکان (نوری کتب خانہ) کے اندر بیٹھتے ہمارے استاد گرامی دکان کے مالک سید محمد معصوم شاہ گیلانی نوری رحمتہ اللہ علیہ سے اعلیٰ حضرت کے کسی رسالے کا مطالبہ کرتے تو سید موصوف اعلیٰ حضرت کے

رسالوں کا ڈھیر سامنے لا رکھتے جن سے مولانا محمد نبی بخش حلوائی چند رسالے اٹھاتے، خرید لیتے، اور ہمیں کہتے ''سید معصوم شاہ گیلانی کو اللہ خوش رکھے یہ بریلی سے موتی چن کر لاتے ہیں اور ہماری جھولیاں بھرتے جاتے ہیں''۔ سید معصوم شاہ گیلانی نوری نے اعلیٰ حضرت کے کئی رسالے چھاپے اور اہل سنت کے مطالعہ کے لیے عام کیے۔ ''نوری کتب خانہ'' افکار رضا کی اشاعت کا واحد اشاعتی مرکز تھا جس نے لاہور میں سارے پنجاب کو فکر رضا سے آشنا کیا۔ علامہ سید ابوالبرکات رحمۃ اللہ علیہ بھی اعلیٰ حضرت کے بعض عمدہ اور نفیس رسائل چھاپ کر علمائے اہل سنت میں تقسیم کرتے۔

پاکستان بننے کے بعد ہمیں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی کے نام کا تعارف ہوا کچھ ہمارا علمی شعور بھی بلند ہو گیا تھا کچھ کتابوں کی جستجو ہونے لگی۔ کراچی سے پہلی بار اعلیٰ حضرت کا کنز الایمان ترجمہ قرآن مجید چھپ کر آیا تو ہمارے علماء کرام نے اسکی تعریف کی ہم نے بھی خریدا اور مطالعہ کرنا شروع کیا۔ پھر ''حیات اعلیٰ حضرت'' کی جلد اول چھپ کر آئی تو بہت سے علماء کرام نے اعلیٰ حضرت کی زندگی کے علمی پہلوؤں کو بیان کرنا شروع کیا۔ انہی دنوں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے رفیق علم وقلم سید محمد ایوب قادری رحمتہ اللہ علیہ بریلی سے ہجرت کر کے لاہور پہنچے تو وہاں سے اعلیٰ حضرت کے رسالے ساتھ لائے۔ وہ اپنی بے بضاعتی اور بے سروسامانی کی وجہ سے اعلیٰ حضرت کی کوئی کتاب تو نہ چھپوا سکے مگر کراچی جا کر انہوں نے ''حیات اعلیٰ حضرت'' مؤلفہ مولانا ظفر الدین رضوی کی جلد اول کا پہلا ایڈیشن چھپوانے میں کامیابی حاصل کی۔ ہماری دانست میں ''حیات اعلیٰ حضرت'' سب سے پہلے کراچی ہی میں چھپی تھی۔

''کنز الایمان'' کراچی سے چھپ کر آیا تو لاہور میں علمائے اہلسنت کے ہاں

خوشی کی لہر دوڑ گئی ان کی خواہش تھی کہ اسے کوئی مالدار ادارہ چھپوائے تا کہ عوام تک آسانی سے پہنچے مگر کوئی ناشر اس نئے ترجمے کی طرف قدم نہیں بڑھاتا تھا۔ ''مقبول عام پریس'' چوک دالگراں لاہور ان دنوں اشاعت قرآن کا مرکز تھا۔ علمائے اہل سنت نے انہیں ''کنزالایمان'' چھاپنے پر آمادہ کیا انہوں نے چوب قلم میں جہازی سائز پر ''کنز الایمان'' شائع کر دیا پھر مقبول عام پریس کے تعاون سے ''مکتبہ نبویہ'' لاہور نے ایک ایڈیشن شائع کیا وہ اتنا سستا ایڈیشن تھا کہ دو تین روپے میں کنزالایمان مل جاتا تھا اس ایڈیشن کی اشاعت اور تقسیم میں راقم (اقبال احمد فاروقی) نے دن رات ایک کر دیا تھا۔

پاکستان میں آہستہ آہستہ افکار رضا کی خوشبوئیں پھیلنے لگیں۔ بارگاہ رسالت میں کہی ہوئی اعلیٰ حضرت کی نعتیں دلوں کے دروازوں پر دستک دینے لگیں۔ مجالس نعت میں حدائق بخشش کی روشنیاں پھیلنے لگیں۔ ''سلام رضا'' کی گونج ہر مسجد، ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر قریہ میں سنائی دینے لگی، پہلی بار ہم نے دیکھا کہ

گونج گونج اٹھے ہیں نغمات رضا سے بوستان!

علمائے اہل سنت کے پیہم اصرار پر ''تاج کمپنی'' کے مالک شیخ عنایت اللہ کنزالایمان کو شائع کرنے پر آمادہ ہوئے وہ بادل نخواستہ پہلا ایڈیشن لائے تو لوگوں نے تین ماہ کے اندر اندر سارا ایڈیشن خرید لیا اس نے پانچ ہزار کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ یہ ایڈیشن چھ ماہ کے اندر اندر ختم ہو گیا۔ تاج کمپنی کے اراکین حیران رہ گئے کہ یہ چھپا ہوا خزانہ کیا شائع ہوا لوگ قطار اندر قطار آ کر خرید رہے ہیں۔ تاج کمپنی کا چھپا ہوا کنزالایمان ''سپر ہٹ'' ہوا۔ مولانا شمس الحسن شمس بریلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی نگرانی میں ''حدائق بخشش'' مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی سے پاکستان میں پہلا ایڈیشن

شائع کیا۔ اہل سخن کو اعلیٰ حضرت کے کلام سے شناسائی ہوئی تو ہر طرف سے شور اٹھا۔

بلبل باغ مدینہ تیرے نغموں کو سلام!

''حدائق بخشش'' کا جب ادبی اور تنقیدی جائزہ چھپا تو دنیائے شاعری میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا، پھر اس کے کئی ایڈیشن پاکستان کے مختلف علاقوں سے چھپتے گئے اور دلوں کی حلاوت بنتے گئے۔

حکیم محمد موسیٰ امرتسری ایک علمی خانوادے کے فرد تھے۔ امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تو رام گلی میں مطب جاری کیا اور ساتھ ہی فکر رضا کو عام کرنے کے لیے ۱۹۶۸ء میں ''مرکزی مجلس رضا'' کی بنیاد رکھی۔ چند احباب کو ساتھ ملا کر ''یوم رضا'' منانے لگے۔ روداد یوم رضا چھاپ کر پڑھی لکھی دنیا تک پہنچانے لگے۔ اعلیٰ حضرت کے رسائل چھاپ کر مفت تقسیم کرنے لگے۔ ان کی شبانہ روز کوششوں سے سارے پاکستان میں ایک دھوم مچ گئی۔

وہ چمن میں کیا گیا سارا گلستان کھل اٹھا!

''مرکزی مجلس رضا'' نے چند سالوں کے اندر اندر افکار رضا کے قافلے ہر سمت روانہ کرنے شروع کیے۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری کی روح کو خدا خوش رکھے۔ اس نے اپنی زندگی میں اٹھارہ لاکھ کتابیں چھپوا کر فکر رضا کو عام کیا پاکستان کا ہر پڑھا لکھا شخص امام احمد رضا کی کسی نہ کسی کتاب سے آشنا ہونے لگا۔ کالجوں کے پروفیسر، عدالتوں کے وکلاء، عدلیہ کے جج، مساجد و مدارس کے علماء و خطباء فکر رضا سے سرشار ہونے لگے۔ مرکزی مجلس رضا لاہور نے صرف پاکستان ہی نہیں سارے برصغیر میں اعلیٰ حضرت کی کتابیں پھیلا دیں۔ اب ''فتاویٰ رضویہ'' پاکستان میں آیا تو فقہی

میدان میں اعلیٰ حضرت کی فقاہت نے جھنڈے گاڑ دیئے۔ "مکتبہ نبویہ" لاہور نے
اس سلسلہ میں نمایاں کام کیا، کراچی میں مدینہ پبلشنگ کمپنی اور مکتبہ رضویہ نے اہم
کردار ادا کیا پھر کئی اشاعتی ادارے آگے بڑھے، فتاویٰ رضویہ چھپنے لگا اور اس طرح
فقہی دنیا میں ایک انقلاب آگیا، مرکزی مجلس رضا لاہور کی اشاعتی مہم نے چند برسوں
میں سارے برصغیر میں افکار رضا کا اتنا چرچا کیا کہ لوگ حیران رہ گئے۔ یہ ایک انقلابی
مجلس تھی جس نے واقعی انقلاب برپا کر دیا۔

"مرکزی مجلس رضا" لاہور کی تحریک پر اعلیٰ حضرت کے افکار کو عام کرنے
کے لیے پاکستان میں کئی ادارے قائم ہوئے۔ سید ریاست علی قادری ایک اعلیٰ
سرکاری آفیسر تھے۔ انہوں نے "ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی" کی بنیاد رکھی اور
اعلیٰ حضرت پر بلند پایہ تحریریں سامنے آنے لگیں، ہائی سوسائٹی میں افکار رضا کو پھیلایا
جانے لگا، سید ریاست علی قادری نے افکار رضا کو وزراء، عدلیہ، سیاست دانوں اور
بیوروکریٹ تک پہنچا دیا اور اتنا بڑا کام کیا کہ اہل علم داد دیئے بغیر نہ رہ سکے، ماہر
رضویات ڈاکٹر محمد مسعود احمد مظہری اگرچہ "ادارہ تحقیقات امام احمد رضا" کے معاون
تھے مگر انہوں نے مرکزی مجلس رضا لاہور کے سٹیج سے اتنی بلند پایہ کتابیں شائع کرائیں
جن سے اعلیٰ حضرت کے سیاسی افکار لوگوں کے سامنے پہلی بار آئے۔ ڈاکٹر محمد مسعود
احمد صاحب مظہری کی تحریروں میں تحقیق بھی تھی اور شگفتگی بھی اعلیٰ حضرت پر جب آپ
کی تحریریں سامنے آئیں تو دنیائے علم نے تسلیم کیا کہ دینی ادارے بھی ایسی تحقیق اور
شگفتہ تحریریں سامنے لا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد مسعود احمد مظہری ایک استاد تھے، معلم تھے،
محکمہ تعلیم کے آفیسر تھے۔ ان کے احباب اور شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ جب ان

کے قلم کی خوش خرامی سامنے آئی تو دبستان رضا کا پتہ پتہ، بوٹا بوٹا افکار رضا کی خوشبو لیکر
مہک اٹھا۔ مرکزی مجلس رضا لاہور سے چھپنے والی تحریریں اتنی موثر ثابت ہوئیں کہ اہل
علم نے آپ کو "ماہر رضویات" تسلیم کیا۔

"مرکزی مجلس رضا لاہور" کی کتابی اشاعت کے ساتھ ساتھ ۱۹۹۲ء میں
مجلس کا ماہنامہ "جہان رضا" آسمان صحافت پر جلوہ گر ہوا۔ اس کی ادارت (راقم) پیر
زادہ اقبال احمد فاروقی کے ہاتھ تھی۔ جہان رضا نے دنیائے رضویت پر کام کرنے
والوں سے لوگوں کو آگاہ کیا اعلیٰ حضرت پر لکھی جانے والی کتابوں سے واقف کیا اعلیٰ
حضرت پر ڈاکٹریٹ کرنے والوں سے متعارف کرایا کہ آج دنیائے رضویت میں "
جہان رضا" کے مقالات مضامین اور اداریوں کو

؎ وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں!

لاہور میں "رضا فاؤنڈیشن" کی بنیاد رکھی گئی اس کے صدر محترم جناب مفتی
عبد القیوم ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دار العلوم نظامیہ لاہور تھے۔ انہوں نے اپنی نگرانی
میں سنی علماء کرام کا ایک بورڈ قائم کیا جس کی نگرانی میں "فتاویٰ رضویہ" کی از سر نو
ترتیب و تدوین ہوئی۔

آج پاکستان کے گوشے گوشے میں فکر رضا کے بے شمار زاویئے قائم ہو چکے
ہیں۔ مگر مرکزی مجلس رضا لاہور، رضا اکیڈمی لاہور، رضا فاؤنڈیشن لاہور، ادارہ
تحقیقات امام احمد رضا کراچی، جیسے اداروں نے فکر رضا کی اشاعت میں بڑا اہم کردار
ادا کیا۔ آج ترجمہ قرآن کنز الایمان کے سیکڑوں اشاعتی ادارے دن رات کام کر رہے
ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی تصانیف کی اشاعت کے ہزاروں ناشرین صبح و شام فکر رضا کو عام

کرنے میں مصروف ہیں۔ اہل سنت کی مساجد کے خطیبان خوش زبان ،سنیوں کے جلسوں کے واعظان شیریں بیان، پھر مجالس نعت کے نعت خوانان ہزار داستان تمام فکر رضا کے انوار کو پھیلانے والے زاویئے ہیں۔

الہیٰ تابود خورشید وماہی　　جہان رضویاں را روشنائی

یہ افکار رضا کے زاویئے تھے جن کا ہم نے ذکر کیا مگر فکر رضا کے عوام تک پہنچانے کے لیے ابھی بڑا کام کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی اکثریت اہل سنت وجماعت کے عقیدہ پر قائم ہے۔ حنفی المذہب کی یہ اکثریت علمائے اہل سنت سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ انہیں دینی رہنمائی دیں اور دینی قیادت بہم پہنچائیں۔ اندریں حالات علمائے اہل سنت کا فرض ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور عوام کو فکر رضا پر مشتمل لٹریچر مہیا کرنے کے لیے مزید ادارے قائم کریں۔ برصغیر میں اعلیٰ حضرت امام اہل سنت احمد رضا خان ہی ایک واحد شخصیت ہے۔ جس نے دینی بے راہ روی کے طوفانوں کو روکا اور سنیوں کو ایک نقطہ پر جمع کردیا تھا۔

آج سنیوں کے اندر کئی طبقے پیدا ہوگئے ہیں جو بلاشبہ سنی العقیدہ ہیں مگر ان کی بے راہ روی نے سنی وحدت کو پارہ پارہ کردیا ہے آج ہماری خانقاہیں، غیر اسلامی رسم ورواج کے مراکز بنتی جارہی ہیں۔ آج ہمارے بزرگان دین کے عرس میلوں کی شکل اختیار کرتے جارہے ہیں۔ آج ہمارے روحانی مراکز غیر اسلامی رسم ورواج کی تجربہ گاہیں بنتے جارہے ہیں ان پر فضول رسم ورواج کی حکمرانی ہے جس پر بے پناہ روپیہ ضائع ہورہا ہے آج ہماری عبادت گاہیں اونچے اونچے میناروں اور خوبصورت محراب ومنبر کی نمائش گاہیں بنتی جارہی ہیں مگر نمازی کم ہوتے جارہے ہیں

آج ہماری شب بیداری کے زاویے نعت خوانوں کی زد میں ہیں، جہاں ساری ساری رات روشنیوں، خوش آوازیوں اور انعام واکرام کی بارشوں کی نمائش تو ہوتی ہے مگر شب بیداری کے ثمرات سے محروم ہوتی جارہی ہیں۔ آج ہمارے اغنیاء اور امراء دین کے نمائشی اداروں پر اپنا مال ودھن قربان کرتے ہیں مگر جس چیز کی ضرورت ہے اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلک رضا پر لٹریچر شائع کرکے سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور درس گاہوں تک پہنچایا جائے اور اس کام کے لیے ایک سیکرٹریٹ قائم کیا جائے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ امام احمد رضا کی تمام تصانیف اور ان پر لکھے جانے والی تمام کتابوں پر مشتمل ایک مرکزی لائبریری قائم کی جائے آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ترقی یافتہ میڈیا کا ایک مضبوط نیٹ ورک قائم کیا جائے اور ان میں سے ہر شخص کو وہ تمام چیزیں آسانی سے مل سکیں جو اعلیٰ حضرت کے نظریات کے متعلق ہوں۔

فکر رضا کے ان زاویوں کے علاوہ آج مجالس نعت میں اعلیٰ حضرت کا کلام جس انداز سے پڑھا جارہا ہے اس کی مثال شاید ہی کسی دوسرے نعت گو شاعر کے کلام سے ملتی ہو۔ اعلیٰ حضرت کا نعتیہ کلام روح وقلب کی جان بن کر فضاؤں میں گونج رہا ہے۔ نعت کی کوئی محفل اس وقت تک باوقار نہیں سمجھی جاتی جب تک کلام رضا نہ پڑھا جائے اچھے سے اچھے نعت گو کا کلام اپنی جگہ مگر اعلیٰ حضرت کے کلام کے بغیر بات بنتی نہیں۔

سب ذکر پھیکے جب تک نہ مذکور ہو!　　نمکین حسن والا ”کلام رضا“

آج کلام رضا کی شرحیں لکھی جارہی ہیں۔ آج کلام رضا کی تضمینیں لکھی جارہی ہیں۔ آج کلام رضا کی زمین پر نعتیں لکھی جارہی ہیں یہ ذکر رسول میں فکر رضا کا

رنگ وآہنگ ہے۔ ''سلام رضا'' کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ مصر کے سکالرز عربی میں، یورپ کے عالم انگریزی میں ہندوستانی علماء ہندی میں اور بنگلہ دیش کے شعرا بنگلہ میں سلام رضا کی شرحیں لکھ رہے ہیں۔ کلام رضا کی مقبولیت امام احمد رضا خان کے عاشق رسول ہونے کی علامت ہے اور بارگاہ نبوت میں مقبولیت کی دلیل ہے۔ سعدی شیرازی نے نعت کہی، حضور نبی کریم ﷺ نے خوش ہوکر فرمایا۔ ''سعدیا بازبگو آنچہ بہ دیباچہ گلستان گفتہء'' آج سلام رضا کو پڑھا جاتا ہے تو آواز آتی ہے۔

مجھ سے خدمت کے قدسی کہیں ہاں رضا!   مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ اعلیٰ حضرت کا نام لینے والے تمام علمائے کرام خطبائے عظام اور نعت خوانان خوش کلام کا بھی ایک رابطہ آفس قائم ہو۔ جہاں پر پوری حکمت عملی سے کام لیکر عوام کی راہنمائی کی جائے۔

ہم نے جن اداروں کا اوپر ذکر کیا ہے وہ اپنی بے سروسامانی کے باوجود کام کر رہے ہیں مگر ان مقاصد کو نہیں پا رہے جن کے لیے یہ قائم ہوئے تھے۔ آج وہ بکھری بکھری کشتیوں کی طرح ایک بحر ناپیدا کنار میں سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں انہیں منظم ہوکر مسلک اعلیٰ حضرت کو فروغ دینا چاہیے۔ آج وہ اخبارات، میگزین اور رسالے جو اعلیٰ حضرت کے نظریہ کو عام کرنے میں مصروف ہیں باہمی رابطہ کے ساتھ عوام تک پہنچنے چاہییں۔ ہم یہ گزارشات اس لیے کر رہے ہیں کہ سینوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو قومی مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے فکر رضا کو عام کرسکتے ہیں۔

(ماہنامہ جہانِ رضا لاہور۔ مئی، جون ۲۰۰۴ء)

اعلیٰ حضرت اپنے شاگردوں کے حلقے میں

ملک العلماء مولانا ظفرالدین قادری رضوی بیان کرتے ہیں

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے بے شمار کتابیں لکھیں، تحریری کام کیے، فتوے جاری کیے۔ ان مصروفیات کی وجہ سے انہیں مسند تدریس پر بیٹھ کر شاگردوں کو پڑھانے کا موقع بہت کم ملا۔ پھر بھی آپ نے اپنے شاگردوں کی ایک جماعت تیار کرنے کے لیے تھوڑا سا وقت دیا۔ جسے ہم نہایت اختصار کے ساتھ قارئین ''جہان رضا'' کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

مولانا ظفرالدین رضوی فرماتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت کے زمانے میں سارے برصغیر میں درس وتدریس کا بڑا شور تھا۔ ملک میں بے شمار دینی مدارس کھل رہے تھے۔ اعلیٰ حضرت نے بھی اپنا قیمتی وقت نکال کر مختصر عرصہ کے لیے مسند تدریس کو رونق بخشی۔ دور دور سے طلبہ دوسرے مدارس چھوڑ کر بریلی حاضر ہوتے اور اس چشمہء علم وفضل سے فیضیاب ہوتے۔ اسی زمانے کا ایک واقعہ جناب مولوی محمد شاہ خان عرف تھن خان صاحب بیان فرماتے ہیں کہ ایک دن تین طالب علم نئے آئے اور اعلیٰ حضرت سے پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے دریافت کیا کہ کہاں سے آئے ہو، اس سے پہلے کہاں پڑھتے تھے۔ وہ لوگ بولے دیوبند میں پڑھتے تھے، وہاں سے گنگوہ گئے اس کے بعد یہاں آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ یوں تو طلبہ کو ''ثمہ خیرا'' کا مرض ہوتا ہے یعنی وہاں بہتر پڑھائی ہے اسی لیے ایک جگہ جم کر بہت کم لوگ پڑھتے ہیں۔ بلکہ دو چار جگہ جاکر ضرور دیکھا کرتے ہیں۔ مگر یہ عموماً ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں کی

تعریف انسان سنتا ہے لیکن میرے عقیدہ میں یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ آپ لوگوں نے دیوبند یا گنگوہ میں بریلی کی تعریف سنی اور اس وجہ سے یہاں کے مشتاق ہو کر تشریف لائے ہیں۔ بولے یہ آپ ٹھیک کہتے ہیں اختلاف مذہب اور اختلاف خیال کی وجہ سے اکثر لوگوں کے ہاں بریلی کی برائی ہی ہوا کرتی تھی مگر ٹیپ کا بند ضرور ہوتا کہ مولانا احمد رضا خان قلم کا بادشاہ ہے جس مسئلہ پر قلم اٹھا دیا پھر کسی کی مجال نہیں کہ ان کے خلاف کچھ لکھ سکے۔ یہی دیوبند میں سنا اور یہی گنگوہ میں بھی۔ تو ہم لوگوں کے دلوں میں شوق وذوق ہوا کہ وہیں چل کر علم حاصل کرنا چاہیے جن کے مخالفین بھی اس کے فضل وکمال کی گواہی دیتے ہیں۔ **والفضل ماشهدت به الاعداء:**

اعلیٰ حضرت کے چند نامور شاگرد

اعلیٰ حضرت نے چونکہ باضابطہ مدرس بن کر نہیں پڑھایا تھا جو رجسٹر داخلہ سے طلبہ کا نام معلوم کیا جائے یا فارغ التحصیل طلبہ ہی کا نام رجسٹر فارغ التحصیل سے حاصل کیا جاسکے اس لیے حضور کے شاگردوں میں جو مشہور ہوئے اور تصنیفات وغیرہ سے دینی خدمت کی ان میں بعض لوگوں کے اسمائے گرامی اس جگہ لکھ دینا مناسب ہوگا ۔اعلیٰ حضرت کے تمام شاگردوں میں خصوصیت کے ساتھ فقہ میں کمال اور تصنیفات کی طرف توجہ اور وعظ وتقریر اور مناظرہ کا رنگ ضرور موجود ہے۔

(۱) جناب مولانا مولوی نواب سلطان احمد خان صاحب محلہ بہاری پور بریلی

(۲) جناب مولانا مولوی سید امیر احمد صاحب محلہ ذخیرہ بریلی

(۳) جناب مولانا مولوی حسن رضا خاں صاحب برادر اوسط اعلیٰ حضرت

(۴) جناب مولانا مولوی محمد رضا خان صاحب برادر خرد اعلیٰ حضرت

(۵) جناب مولانا مولوی حامد رضا خاں صاحب

(۶) حجۃ الاسلام صاحبزادہ اکبر اعلیٰ حضرت

(۷) جناب مولانا مولوی حافظ یقین الدین صاحب محلہ ملوکپور بریلی

(۸) جناب مولانا حافظ سید عبدالکریم صاحب محلہ ذخیرہ بریلی

(۹) جناب مولوی نور حسین صاحب بریلی

(۱۰) جناب مولوی حاجی سید نور احمد صاحب چاٹگامی

(۱۱) جناب مولوی واعظ الدین صاحب مصنف ''دفع زیغ زاغ''

(۱۲) جناب مولوی عبدالرشید صاحب عظیم آبادی

(۱۳) جناب مولانا سید شاہ غلام محمد صاحب بہاری

(۱۴) جناب مولوی سید حکیم عزیز غوث صاحب بریلوی

(۱۵) جناب مولوی نواب مرزا صاحب بریلوی

(۱۶) جناب مولوی عبدالاحد صاحب سلطان الواعظین پیلی بھیتی

(۱۷) حضرت مولانا سید شاہ احمد اشرف صاحب کچھوچھوی

(۱۸) حضرت مولانا سید محمد صاحب محدث کچھوچھوی دامت برکاتہم وفیوضہم

ایک وقت آیا کہ اعلیٰ حضرت کے یہ شاگرد آسمان علوم وفضل کے آفتاب وماہتاب بن کر روشنیاں پھیلاتے رہے۔

اعلیٰ حضرت اپنے شاگردوں کو رد وہابیہ کی تربیت دیا کرتے تھے۔

ملفوظات حصہ اول میں ہے ایک روز حضرت مولانا سید احمد اشرف صاحب کچھوچھوی بریلی میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ رخصت کے وقت انہوں نے عرض کی کہ اپنے بھانجے مولوی سید محمد صاحب اشرفی کو میں چاہتا ہوں کہ حضور کی خدمت میں حاضر کردوں۔ حضور جو مناسب خیال فرمائیں، ان سے کام لیں۔ ارشاد ہوا ضرور تشریف لائیں یہاں فتوی لکھیں اور مدرسے میں درس دیں۔ ردوہابیہ اور افتاء دونوں ایسے فن ہیں کہ طب کی طرح یہ بھی صرف پڑھنے سے نہیں آتے انہیں بھی طبیب حاذق کے مطب میں بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ میں بھی ایک حاذق طبیب کے مطب میں سات برس بیٹھا تھا مجھے وہ وقت وہ دن وہ جگہ وہ مسائل اور جہاں سے آتے تھے، اچھی طرح یاد ہیں۔ میں نے ایک بار ایک نہایت پیچیدہ حکم بڑی کوشش وجانفشانی سے نکالا اور اس کی تائیدات مع تنقیحات آٹھ ورق میں جمع کیں۔ مگر جب حضرت والد ماجد قدس سرہ کے حضور میں پیش کیا تو انہوں نے ایک جملہ ایسا فرمایا کہ اس سے یہ سب ورق بے کار ہو گئے۔ وہی جملے اب بھی میرے دل میں پڑے ہوئے ہیں اور قلب میں اب تک ان کا اثر باقی ہے۔ خودستائی جائز نہیں مگر وقت حاجت اظہار حقیقت تحدیث نعمت ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر سے فرمایا: **جعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم** ٥ زمین کے خزانے میرے ہاتھ میں دے دیجیے بیشک میں حفظ والا ہوں اور علم والا ہوں بفضل ورحمت الٰہی پھر بعون وعنایت رسالت پناہی ﷺ افتاء اور ردوہابیہ کے دونوں کامل فن دونوں نہایت عالی فن ہیں۔ یہاں سے اچھا ان شاء اللہ تعالیٰ ہندوستان میں کہیں نہ پایئے گا۔ غیر ممالک کی بابت نہیں کہہ سکتا میں

تو ہر شخص کو بطیب خاطر سکھانے کو تیار رہوں۔ سید محمد اشرفی صاحب تو میرے شاہزادے ہیں میرے پاس جو کچھ ہے وہ انہیں کے جد امجد (یعنی حضور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کا صدقہ وعطیہ ہے۔ آپ کے یہاں موجودین میں تفقہ جس کا نام ہے وہ مولوی امجد علی صاحب میں زیادہ پایئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ استفتا سناتے ہیں اور جو میں جواب دیتا ہوں لکھتے ہیں۔ طبیعت اخاذ ہے طرز سے واقفیت ہو چکی ہے اسی طرح علم توقیت بھی ایسا فن ہے۔ کہ اس کے جاننے والے بھی آج کل معدوم ہیں۔ حالانکہ ائمہ دین نے اسے فرض کفایہ بتایا ہے علماء موجودین میں تو کوئی اتنا بھی نہیں جانتا کہ فلاں دن آفتاب کب طلوع ہوگا اور کب غروب۔ بہت سی عمر گزر گئی تھوڑی باقی ہے۔ جن صاحب کو جو کچھ لینا ہو وہ حاصل کر لیں۔ ''سلونی قبل ان تفقدونی'' حضرت مولانا علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے اور شیخ سعدی علیہ الرحمتہ کا قول بالکل صحیح ہے۔ ''قدر نعمت پس از زوال''

شاگرد کو یہ چاہیے کہ جب کسی چیز کے حاصل کرنے کا ارادہ کرے تو اگرچہ کمالات سے بھرا ہوا ہو اپنے تمام کمالات کو دروازہ پر ہی چھوڑ دے اور یہ جانے کہ میں کچھ جانتا ہی نہیں۔ خالی ہو کر آئے گا تو کچھ پائے گا اور جو اپنے کو بھرا سمجھے گا تو

انائے کہ پرشد دگر چوں پرد !

مکہ سے سید اسماعیل خلیل نے بریلی آکر اعلیٰ حضرت کی شاگردی اختیار کی

اس زمانے میں مکہ معظمہ کے ایک عالم جلیل حضرت سید مولانا اسماعیل خلیل حافظ کتب حرم اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی کی خدمت میں تشریف لائے اگرچہ

ان کی مکہ معظمہ میں اعلیٰ حضرت سے ایک ملاقات ہوئی تھی۔ مگر وہ وہاں سے چل کر بریلی پہنچے اور اعلیٰ حضرت کی شاگردی اختیار کر کے دینی علوم پر عبور حاصل کیا۔ مولانا سید اسماعیل کی اعلیٰ حضرت سے ملاقات اس وقت ہوئی تھی۔ جب وہ حج کرنے کے لیے مکہ مکرمہ گئے تھے۔ آپ فراغ مناسک حج کے بعد کتب خانہ حرم محترم میں حاضر ہوئے پہلے دن اپنے بیٹے حامد رضا کے ساتھ تھے۔ سید اسماعیل ان دنوں محافظ کتب تھے۔ ایک وسیع وجلیل عالم نبیل تھے۔ اعلیٰ حضرت نے ان کی زیارت کی، یہ مکہ مکرمہ کے دیگر اکابر کی طرح اعلیٰ حضرت سے غائبانہ خلوص رکھتے تھے۔ جن دنوں اعلیٰ حضرت نے ''فتاوی حرمین برجف ندوۃ المین'' ۱۲۹۶ھ پیش کیا یہ ردندوہ کے اٹھائیس سوال پر مشتمل تھا۔ اعلیٰ حضرت نے اسے بیس گھنٹے سے بھی کم میں لکھا تھا۔ یہ فتویٰ مولانا سید اسماعیل کی خدمت میں پیش ہوا آپ نے اس پر اپنی گراں بہا تقریظات مزین فرمائیں اور اعلیٰ حضرت کو بے شمار اعلیٰ درجے کے کلمات دعا وثناء سے نوازا اور ایک مبسوط کتاب مع ترجمہ کے عنایت کی۔ جو بمبئی میں ۱۳۱۷ھ میں چھپی۔ اسی دن سے مولانا سید اسماعیل اعلیٰ حضرت کے کمالات کے قائل تھے لیکن انہیں بھی شوق ہوا کہ وہ بریلی میں آئیں اور اعلیٰ حضرت سے استفادہ کریں۔ وہ آئے اور آپ کے شاگرد بنے۔

اعلیٰ حضرت کے دو کم سن شاگرد

جن دنوں ڈاکٹر ضیاء الدین پروفیسر علی گڑھ حساب کے ایک مسئلے میں پریشان تھے، بریلی حاضر ہوئے اور اعلیٰ حضرت کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے بعض دقیق مسائل کا سامنا ہے آپ اس کا حل فرمائیں۔ میں اس مسئلہ کے حل کے لیے غیر

ممالک میں جا رہا تھا۔ مگر آپ کی تعریف سن کر یہاں آ گیا۔ انہوں نے اپنا سوال پیش کیا اعلیٰ حضرت نے فرمایا میرے دو بچے یہاں بیٹھے ہیں ان کے سامنے سوال کریں۔ یہ حل کر دیں گے۔ ڈاکٹر ضیا الدین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ متحیر ہو کر ان دو بچوں کو دیکھنے لگے۔ یہ دونوں بچے اعلیٰ حضرت کے کم سن شاگرد مولوی قناعت علی اور ایوب علی رضوی تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا سوال پیش کیا۔ تو ان دونوں شاگردوں نے اس سوال کو حل کرنے کے لیے پریکٹیکل جواب دیا۔ جس سے وہ مطمئن ہو گئے۔ اس مسئلے کی تفصیلات اور جواب ''حیات اعلیٰ حضرت'' جلد اول میں مل سکتی ہیں۔ جہاں اعلیٰ حضرت نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ڈاکٹر ضیاء الدین کے مختلف سوالات کا جواب دے کر انہیں مطمئن کر دیا تھا۔

اگر چہ اعلیٰ حضرت نے اپنے شاگردوں کو بے شمار علوم سے بہرہ ور کیا تھا۔ مگر ہم اپنے قارئین کو ان حضرات سے متعارف کرانا چاہتے ہیں۔

ان میں سید ایوب علی رضوی، ملک العلماء مولانا ظفر الدین فاضل بہار، علماء لاہور، علماء بدایوں، برصغیر پاک وہند کے ہزاروں شاگردان عزیز، آسمان علم وکمال پر جگمگاتے ستاروں کی طرح روشنیاں پھیلاتے رہے ہیں۔

علم توقیت اور علم تکسیر میں مولانا ابراہیم رضا خاں، سید شاہ غلام محمد بہاری، مولانا حکیم سید شاہ عزیز غوث بریلوی، مولانا سید محمود جان بریلوی، صاحبزادہ شاہ حامد رضا خاں، مولانا نواب مرزا اعلیٰ حضرت سے پڑھ کر کمال درجوں پر پہنچے تھے۔

بریلی کا ایک کمسن شاگرد

مولانا محمد حسین میرٹھی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا دیدارعلی شاہ الور سے بریلی تشریف لائے۔ جماعت کا وقت قریب تھا مسجد کے کنویں پر ایک کمسن لڑکا پانی بھر رہا تھا۔ مولانا دیدارعلی شاہ نے جلدی میں اس لڑکے سے پانی طلب کیا۔لڑکے نے کہا۔مولانا میرے بھرے ہوئے پانی سے آپ کا وضو جائز نہیں۔ اس نے پانی دینے سے انکار کردیا۔مولانا نے غصہ میں کہا جب ہم پانی خود مانگ رہے ہیں تو ناجائز کیسے ہوا۔لڑکا کہنے لگا مولانا مجھے پانی دینے کا اختیار نہیں ہے، نابالغ بچہ ہوں۔مولانا کو اور غصہ آیا ادھر جماعت کھڑی ہوگئی فرمایا تم لوگوں کو جہاں جہاں پانی دیتے ہو ان کے وضو کیسے جائز ہو جاتے ہیں؟ اس نے کہا وہ لوگ تو مجھ سے پانی مول لیتے ہیں۔مولانا کو غصہ آیا خود آگے بڑھے کنویں سے پانی کشید کیا۔وضو کیا۔نماز پڑھنے کے بعد آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔طبیعت موزوں ہوئی تو کہنے لگے،وہ ماشکی بچہ صحیح کہہ رہا تھا۔ بچہ فقہی اعتبار سے درست بات کر رہا تھا۔ پھر آہ کھینچ کر کہنے لگے ''دیدارعلی تم سے تو اعلیٰ حضرت کے ماشکیوں کے بچے بھی زیادہ علم رکھتے ہیں'' یہ اعلیٰ حضرت کا ہی فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی کہ بریلی کے بچے بھی زیادہ علم رکھتے تھے کہ ایک کمسن بچہ بھی فقہ کا مسئلہ صحیح بتاتا ہے آپ سہمے سہمے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور زیر تربیت رہے اور خلافت واجازت حاصل کی۔

(حیات اعلیٰ حضرت مطبوعہ لاہور)

(ماہنامہ جہانِ رضا لاہور۔ جولائی ۲۰۰۵ء)

اعلیٰ حضرت محدث بریلوی علماء کرام کی مجالس میں

(۱)

امام اہل سنت، مجدد دین وملت، عظیم البرکتہ، رفیع الدرجۃ، محی السنۃ ماحی الفتنۃ شیخ الاسلام والمسلمین، عمدۃ المحققین، تاج الفحول المدققین، غیظ المنافقین، قاطع الملحدین، قامع المرتدین، سمو المکانۃ، اعلیٰ حضرت، مولانا الحاج قاری الشاہ احمد رضا خان بریلوی رضی اللہ عنہ اپنے دور کی اسلامی دنیا میں روشنی کا مینار تھے۔آپ کا سنہ ولادت ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء اور سال وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء ہے۔آپ کی یہ پینسٹھ سالہ زندگی برصغیر پاک وہند میں انگریزی دور اقتدار میں گزری۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ایشیا اور براعظم افریقہ کے تمام ممالک واقوام یورپ کی نوآبادیات کا حصہ بن چکے تھے۔اس طرح عالم اسلام کا کثیر حصہ غلامی کی سیاہیوں میں گھرا ہوا تھا۔ برصغیر پاک وہند ایسٹ انڈیا کمپنی اور پنجاب سکھوں کے دور استبداد سے گزرا۔ جسے تاریخ کا ایک سیاہ باب مانا جاتا ہے۔اعلیٰ حضرت کی پیدائش کے ایک سال بعد مسلمانانِ برصغیر نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی لڑی، مگر ناکام رہے۔اس ناکامی کے بعد انگریز نے جس شدت کے ساتھ مسلمانوں پر مظالم توڑے، اس کی مثال قوموں کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ بایں ہمہ علماء دین نے اپنے مناصب، اعزازات، جائیداد اور مال ومنال سے محرومی کو تو قبول کرلیا۔مگر اپنی علمی اور اعتقادی رائے کی حفاظت سے دستبردار ہونا قبول نہ کیا۔ چنانچہ حالات کی شدت کے باوجود دین سے وابستگی اور اپنے آقا ومولیٰ ﷺ کی محبت کے جذبے کو زندہ رکھتے گئے۔وہ دور دراز شہروں، دیہات اور جنگلات

میں بھی دین مصطفیٰ کی شمع کو روشن رکھے رہے خصوصاً اعلیٰ حضرت کا علمی خانوادہ بریلی جیسے حریت پسند شہر میں قیام پذیر رہا اور علم دین کی ضیاؤں کو پھیلاتا رہا۔

(۲)

امام اہل سنت کی چشم شعور وا ہوئی۔ تو بریلی کا مکتب علم و فکر برصغیر کے تشنگان علوم اسلامیہ کو چشمہ فیض بن کر سیراب کر رہا تھا۔ آپ کے والد ماجد مولانا نقی علی خان (م۱۲۹۷ھ) تایا حافظ کاظم علی خان اور شاہ رضا علی خان (م۱۲۸۶ھ) رحمتہ اللہ علیہم بریلی کی علمی اساس تھے۔ حضرت مولانا نقی علی خان رحمتہ اللہ علیہ کے تینوں صاحبزادے مولانا حسن رضا خان (م۱۳۲۶ھ) مولانا محمد رضا خان اور ہمارے مجدد مآتہ حاضرہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی (م۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) رحمتہ اللہ علیہ اس خانوادۂ علمیہ کے روشن چراغ تھے۔ اس خاندان نے برصغیر کے اہل علم کو نہ صرف متاثر کیا تھا۔ بلکہ اپنی علمی اور نظریاتی درخشاں روشنیوں کی مقناطیسی قوت سے جذب کرنا شروع کر دیا تھا۔ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے طالب علمی کی وادی میں قدم رکھا۔ تو ہر طرف سے مردم شناس نگاہیں اٹھیں۔ سب سے اول مرزا غلام قادر بیگ بریلوی، مولانا نقی علی خان (والد مکرم) اور مولانا عبدالعلی رامپوری (م۱۳۰۳ھ) نے درسیات میں آپ کی تربیت میں بڑی محنت سے کام لیا۔ حضرت سید شاہ آلِ رسول مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (م۱۲۹۶ھ) نے اپنے جن تین خلفاء کو ارشاد و ہدایت کا فریضہ سپرد کرتے ہوئے فخر کیا تھا ان میں حضرت مولانا سید ابوالحسین احمد نوری (م۱۳۲۴ھ) حضرت اشرفی میاں کچھوچھوی (م۱۳۵۵ھ) اور اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی قدس سرہم کے اسماء گرامی خصوصی طور پر ایوان قادریت پر نصب ہیں۔ پاک و ہند سے آگے بڑھ کر حرمین الشریفین (ارض حجاز

دس) میں شیخ الاسلام احمد زینی دحلان شافعی قاضی القضاۃ مکہ مکرمہ (م۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ ء) شیخ حسین صالح جمل اللیل امام مسجد حرام اور الشیخ عبدالرحمٰن سراج مفتی احناف مکہ مکرمہ (م۱۳۰۱ھ) جیسے شہرۂ آفاق مشائخ نے آپ کی روحانی تربیت میں نمایاں حصہ لیا۔

(۳)

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کے علمی کمالات کی شہرت کے آفتاب کی شعاعیں ابھی عالم اسلام کے افق پر طلوع ہی ہوئی تھیں، کہ آپ دنیا کے گوشے گوشے سے اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ آپ کی مشہور تصنیف ''الدولتہ المکیتہ'' پر داد تحسین پیش کرتے ہوئے حضرت علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی (م۱۳۵۰ھ) مولانا عبدالحق الہٰ آبادی مہاجر مدنی (م۱۳۳۳ھ) اور شیخ الائمہ حرم ابوالخیر بن عبداللہ مرداد (م۱۳۳۵ھ) قدس سرہم نے تو شاندار تقاریظ لکھیں۔ قیام حرمین شریفین کے دوران آپ کی ذہانت و ذکاوت کے اعتراف کے طور پر شیخ الخطبا عبداللہ بن عباس صدیقی قاضی مکہ (م۱۳۴۳ھ) شیخ سید اسماعیل خلیل محافظ کتب حرم (م۱۳۳۸ھ) اول شیخ العلماء صالح کمال مفتی مکہ و قاضی جدہ (م۱۳۳۲ھ) رحمتہ اللہ علیہم نے اعلیٰ حضرت کے اعزاز میں دی جانے والی ایک دعوت استقبالیہ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے، اہل مکہ کو آپ کے کمالات علمیہ سے آگاہ کیا۔ آپ کی روحانی اور علمی قابلیت کا یہ اثر تھا کہ حرمین الشریفین کے اکثر اہل علم آپ سے بیعت ہوئے اور محدث جلیل سید عبدالحی بن عبدالکبیر الکتانی، شیخ عابد بن حسین مفتی مالکیہ اور شیخ محمد مرزوقی امین الفتوی مکہ مکرمہ جیسے اکابر علماء نے تو آپ سے سلسلۂ قادریہ میں خرقہ خلافت حاصل کیا۔ آپ کے

تجدیدی کارناموں اور فقہ میں اہم فیصلوں کے پیش نظر سید حسین بن عبدالقادر طرابلسی، شیخ موسیٰ علی شامی ازہری اور الحاج محمد کریم اللہ مہاجر مدنی (خلیفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی) نے آپ کو مجدد کے لقب سے سرفراز فرمایا۔

(۴)

آپ کے وجود مسعود نے بریلی کو اہل علم وفکر کا مرکز بنا دیا تھا۔ برصغیر کے گوشہ گوشہ سے اہل علم آپ کی ملاقات کو آتے۔ خط کتابت سے استفسارات کرتے۔ دینی معاملات میں راہنمائی حاصل کرتے۔ فقہی مشکلات میں آپ کی تحریروں سے استفادہ کرتے اور مزید وضاحت کے لیے حاضر خدمت ہوتے۔ اعلیٰ حضرت ایسے اہل علم کے لیے دیدہ ودل فرش راہ کرتے۔ علمائے کرام کے لیے اعزاز واکرام کے تمام لوازمات مہیا کرتے اور اہل علم کی قدر افزائی کرتے۔ آپ کے پسندیدہ اور محبوب علماء اہل سنت میں سے مفتی ارشاد حسین رام پوری (م ۱۳۱۱ھ) مولانا سید محمد عمر حیدر آبادی (م ۱۳۳۰ھ) اور علامہ احمد حسن کانپوری (م ۱۳۲۲ھ) کے اسماء گرامی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ یہ حضرات آپ کے ممدوح بھی تھے۔ اور مداح بھی۔

(۵)

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بریلی کے مکتب علمیہ میں بیٹھ کر برصغیر کے ہزاروں علماء کرام کی اعتقادی اور فقہی تربیت کی اور اپنی تحریروں سے ایک جہان علم کو متاثر کیا۔ آپ کے معاصرین میں سے سیکڑوں جلیل القدر علماء اہل سنت نے ہمیشہ آپ کو ہی مرجع جانا۔ اگرچہ ایسے علماء کرام کی ایک طویل فہرست ریکارڈ میں موجود ہے جنہوں نے آپ سے اکتساب علم کیا مگر ہم چند حضرات کے اسماء گرامی ہدیہء قارئین کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا عبدالمقتدر بدایونی، مولانا عبداللہ بدایونی، مولانا عزیز الحسن پھپھوندوی، مولانا مصباح الحسن پھپھوندوی، مولانا عبدالصمد پھپھوندوی، مولانا ہدایت اللہ، مولانا سلامت اللہ، مولانا عنایت اللہ رام پوری، مولانا محمد عادل کانپوری، مولانا عبداللہ کانپوری، مولانا مشتاق احمد کانپوری، مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی، مولانا عبدالکافی الہ آبادی، مولانا فاخر الہ آبادی، مولانا نثار احمد کانپوری، مولانا ریاست علی شاہ جہاں پوری، مولانا ظہور الحسن رام پوری، مولانا احمد حسن امروہی مفتی کرامت اللہ دہلوی اور سید شاہ عبدالغنی بہرامی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

(۶)

آپ کی شبانہ روز علمی کاوش کا یہ نتیجہ نکلا کہ برصغیر میں آپ کے حلقہء تلامذہ اور حوزۂ تربیت میں ایسے ایسے علماء کرام پیدا ہوئے جنہوں نے مختلف فنون میں ایک نام پیدا کیا۔ مولانا یٰسین اختر مصباحی دامت برکاتہم العالیہ نے اپنی گراں قدر تصنیف ''امام احمد رضا اور رد بدعات ومنکرات'' کے دیباچہ میں ایسے حضرات علام کا ایک جائزہ پیش کیا ہے جو امام اہل سنت کے دستر خوان علم سے مختلف فنون میں بہرہ ور ہوئے۔ چنانچہ علماء متبحرین میں سے مولانا وصی احمد سورتی (م ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) مولانا حامد رضا بریلوی (۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء) علامہ شاہ ابوالبرکات سید احمد قادری لاہور (م ۱۴۰۰ھ) مفکرین اور مدبرین میں سے پروفیسر مولانا سید سلیمان اشرف بھاگلپوری (م ۱۳۵۲ھ) مولانا سید احمد اشرف کچھوچھوی (م ۱۳۸۳ھ) صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی (م ۱۳۶۷ھ) فقہا میں سے صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی (م ۱۳۶۷ھ) مؤلف بہار شریعت، فقیہ العصر مولانا سراج احمد کانپوری (م ۱۳۴۲ھ) فقیہ اعظم مولانا محمد شریف،

حضرت مولانا دیدار علی شاہ الوری (م ۱۹۵۴ء) مبلغین میں سے مولانا احمد مختار میرٹھی (م ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء) مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی (م ۱۹۵۴ء) مولانا فتح علی قادری (م ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) مصنفین میں مولانا سید محمد ظفر الدین بہاری (م ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) مولانا عمر الدین ہزاروی (م ۱۳۷۹ھ/۱۹۵۹ء) مولانا محمد شفیع بیسلپوری (م ۱۳۳۸ھ) مدرسین میں سے مولانا رحم الٰہی منگلوری (م ۱۳۶۲ھ) مولانا رحیم بخش آروی (م ۱۳۴۴ھ) مولانا غلام جان ہزاروی (م ۱۳۷۹ھ) سیاست دانوں میں سے مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری (م ۱۳۸۰ھ) مولانا یار محمد بندیالوی (م ۱۳۶۷ھ) مفتی اعجاز ولی خان رضوی (م ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء) خطباء ومناظرین میں سے مولانا سید ہدایت رسول رام پوری (م ۱۹۱۵ء) مولانا حشمت علی لکھنوی (م ۱۳۸۰ھ) مولانا محبوب علی لکھنوی (م ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء) شعراء، وادباء میں سے مولانا حسن رضا خان (م ۱۳۲۶ھ) مولانا سید ایوب علی رضوی (م ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء) مولانا امام الدین قادری (م ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء) ارباب طب وحکمت میں سے مولانا عبدالاحد پیلی بھیتی (م ۱۳۵۲ھ) مولانا سید عبدالرشید عظیم آبادی اور مولانا عزیز غوث بریلوی، اصحاب نشر واشاعت میں سے مولانا محمد حبیب اللہ قادری (م ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) مولانا ابراہیم رضا جیلانی (م ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء) مولانا حسنین رضا خان بریلوی (۱۳۵۱ھ) ارباب ثروت میں سے قاضی عبدالوحید عظیم آبادی (۱۳۶۶ھ) حاجی لعل خان مدراسی (م ۱۹۳۱ء) سید محمد حسین میرٹھی اور ارباب تصوف میں سے مولانا شیخ الاسلام ضیاء الدین قادری مدنی اور شہزادۂ امام احمد رضا مفتی اعظم ہند مصطفیٰ رضا خان صاحب قادری (ان دونوں بزرگوں کے ہزار ہا مریدین ان کی روحانی تربیت کا زندہ ثبوت ہیں) کے اسماء گرامی گلستان سنیت کی رونق

ہیں۔ نور اللہ مرقدھم وبرد اللہ مضجعھم

(۷)

جہاں ان معاصر علماء اہل سنت نے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اکتساب فیض کیا۔ وہاں برصغیر کے لاکھوں پڑھے لکھے مسلمانوں نے خط کتابت کے ذریعہ استفسارات کا ایک سلسلہ جاری رکھا۔ بایں کثرت کار اور مصروفیت آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ کسی عامی کے سوال کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے اس کے جواب میں بلا جواز تعویق اختیار کی ہو۔ ہر زبان ہر انداز اور ہر موضوع پر لوگوں نے علمی سوالات کیے اور ان کے وافی اور کافی جوابات پائے۔ علاوہ ازیں اعلیٰ حضرت عظیم المرتبت نے ان حضرات کو مخاطب کرنے میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ جو کسی ایک مسئلہ میں بھٹکے ہوں یا اعتقادی ناہمواری کا شکار ہوئے ہوں۔ معاصر شخصیتوں میں سے مولانا عبدالحی فرنگی محلی (م ۱۳۰۴ھ) عقائد کی شاہراہ پر جونہی لغزش پا کا شکار ہوئے اعلیٰ حضرت کے قلم انتباہ نے انہیں سہارا دیا۔ ۱۹۱۹ء میں تحریک ترک موالات۔ تحریک خلافت اور ہندو سے مواخات کے چرچے ہوئے۔ سیاسی تحریکوں کا ایک طوفان اٹھا۔ بڑے بڑے علماء بھی ان طوفانوں کی زد میں آئے۔ آپ نے ایک لحہ ضائع کیے بغیر ایسے تمام حضرات کی صحیح سمت راہ نمائی کی، خط لکھے، رجسٹریاں کیں، ہدایت نامے جاری کیے، رسالے لکھے، اشتہار بھیجے، خلفاء وتلامذہ کے وفود بھیجے اور کوشش کی کہ اہل علم کے یہ ستون وقت کی دیمک سے بچ جائیں۔

(۸)

مولانا عبدالباری فرنگی محلی (م ۱۳۴۴ھ) مولانا عبدالماجد بدایونی

(م ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء) مولانا محمد علی جوہر (م ۱۹۳۱ء) اس وقت کے سیاسی علماء
اہل سنت میں سر برآوردہ مانے جاتے تھے۔ آپ کی توجہ کا نتیجہ تھا کہ یہ حضرات
سلامتی فطرت اور اخلاص قلب کی بنا پر اپنی لغزشوں سے تائب ہوئے اور خطاؤں
سے رجوع کر کے توبہ کرتے گئے۔ دوسری طرف ابن عبدالوہاب نجدی کی تحریک
وہابیت کے مسموم اثرات نے بعض علمائے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا ان
میں سید احمد رائے بریلوی، شاہ اسماعیل دہلوی اور ان کے معتقدین اور متبعین کی
ایک خاصی تعداد تھی۔ آپ نے ان کی دینی اور فکری گمراہی پر پہلے تو تنبیہ کی،
خسران آخرت سے ڈرایا، افہام و تفہیم کا موقع دیا مگر جب ان معاندین نے انکار
ہی کر دیا تو آپ نے برملا مقابلہ کیا، رد میں کتابیں لکھیں، ان کی اعتقادی
گمراہیوں کو عیاں کیا تا کہ عام لوگ ان کے مسموم اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔
نجدی نظریات سے متاثر علماء کے علاوہ اکابر دیوبند میں سے بعض حضرات نے
بھی عقائد اہل سنت سے ہٹ کر ایک محاذ قائم کیا۔ ان میں مولوی محمد قاسم
نانوتوی (م ۱۲۹۷ھ) مولوی رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) شیخ الہند محمود حسن
دیوبندی (م ۱۳۳۹ھ) مولوی اشرف علی تھانوی (م ۱۳۶۲ھ) مولوی خلیل احمد
انبیٹھوی (م ۱۳۴۶ھ) مولوی انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۰ھ) مولوی حسین احمد
مدنی (م ۱۳۷۷ھ) مولوی مرتضیٰ حسن چاند پوری اور امام الہند مولوی ابوالکلام
آزاد جیسے ذہین و فطین لوگ سرفہرست تھے۔ ان حضرات کو علیحدہ علیحدہ افہام و تفہیم
کا موقع دیا گیا (مولوی اشرف علی تھانوی اور رشید احمد گنگوہی کے نام خطوط تو زیر
نظر مجموعہ میں بھی ہیں) مگر مذہبی ضد نے ان حضرات کو موقع نہ دیا کہ وہ حق کی

بات پر غور کرتے اور اسے قبول کرتے۔

(۹)

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کی ضخیم تحریروں کے شناسا اہل علم اس بات سے
بخوبی واقف ہیں کہ آپ کے فتاوی، رسائل، تالیفات، ملفوظات، اور اکثر دیگر
تصانیف کسی نہ کسی استفسار کا جواب ہیں اور انہیں مکتوبات یا خطوط کے ذخیرہ سے باہر
نہیں رکھا جا سکتا۔ مگر زیر نظر مجموعہ "کلیات مکاتیب رضا" میں ہم صرف ان مکتوبات کو
شامل اشاعت کر رہے ہیں جو آپ نے ذاتی حیثیت سے لکھے۔ بیشتر خطوط
(مکتوبات) آپ کے تلامذہ خلفاء اور ہم مسلک علماء کرام کے نام ہیں۔ مگر بعض خطوط
ان معاندین کے نام بھی ہیں جنہیں اصلاح احوال کے لیے مخاطب کیا جاتا رہا ہے۔
ان خطوط سے اعلیٰ حضرت کی ذاتی محبت، قلبی ہمدردی، احباب کی خبر گیری، دوستوں
کے رنج و غم میں شرکت، اہل محبت کو اعتماد میں لے کر
گوش بہ نزدیک دلم آر کہ آوازے ہست کہنا آپ کی وسیع النظری فی کی عمدہ مثال ہے

(۱۰)

سابقہ صفحات کے مطالعہ سے قارئین کے سامنے اس وقت کے دینی، علمی
اور نظریاتی ماحول کا ایک نقشہ سامنے آ گیا ہوگا۔ برصغیر کی سیاسی اور سماجی تحریکوں سے
ہٹ کر علمی اور نظریاتی معرکہ آرائیوں کا ایک دور تھا۔ جس سے پورا مسلم معاشرہ دوچار
تھا۔ فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی اس ماحول میں اہل علم و فضل کے دائرہ پرکار
کا مرکزی نقطہ تھی جہاں ہزاروں قسم کے استفسارات اور سوالات آتے اور اعلیٰ حضرت
ایک ایک کا جواب دیتے۔ سیکڑوں علماء کرام، صوفیہ عظام، اساتذہ، قانون دان اور

ذہین تلامذہ کے لیے آپ کی ذات آخری منزل تھی۔ جہاں انہیں علمی شکوک وشبہات کی تسلی ہوتی اور ان کے علم وخرد کو فروغ ملتا۔ ہم نے آپ کے معاصرین، متاثرین ، معتقدین اور معاندین کا تذکرہ اسی لیے کیا ہے۔ تاکہ آپ کے حاشیہ خیال میں یہ نکتہ ثبت رہے کہ اس زمانے میں امام اہل سنت کی شخصیت ہی مرکز علم وکمال تھی۔ معاصرین ہمیشہ آپ کی علمی راہنمائی سے بھرپور استفادہ کرتے رہے اور عرب وعجم کے علماء وفقہا نے آپ کے کمالات کے اعتراف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔

خطوط میں سے اکثر وبیشتر تاہنوز محنت کش بار طباعت نہیں ہوئے تھے اور یوں ہم یہ دعوی کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اعلیٰ حضرت سے محبت رکھنے والے اہل نظر کے لیے ہم ایک ''گلدستہ ء تازہ'' اور مطالعہ کی نگاہ گلچین سے ''محفوظ تحفہ'' پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

لگا رہا ہوں مضامین تازہ کے انبار خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

نوٹ: (یہ تقریظ ہے بعنوان ''صاحب مکتوبات'' جو فاروقی صاحب نے ''کلیات مکاتیب رضا'' پر لکھی۔ یہ کتاب ڈاکٹر شمس مصباحی نے مرتب کی اور دار العلوم قادریہ صابریہ برکات رضا، کلیر شریف (ہندوستان) سے ۲۰۰۵ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔)

(ماہنامہ جہان رضا لاہور، فروری ۲۰۰۶ء)

سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے چند رفقاء

حضرت سید ابو الحسن علی ہجویری معروف بہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ اولیاء کرام میں ایک ہر دلعزیز اور محترم شخصیت تھے۔ آپ نے اپنی جوانی میں عالم اسلام کی سیر وسیاحت میں ایک لمبا عرصہ گزارا۔ خصوصا خراسان جو ان دنوں نصف جہان تھا کے اولیاء کرام سے استفادہ کیا۔ روحانیت کی تربیت واشاعت میں یہ خطہ خیابان روحانیت کہلاتا تھا جہاں اولیاء اللہ کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ خراسان کے ایک ایک شہر اور ایک ایک قصبے میں بزرگان دین کی روشن خانقاہیں تھیں جہاں سے روحانیت کی ضیاء پھوٹتی تھی۔

جسٹس پیر کرم شاہ بھیروی رحمۃ اللہ علیہ نے کشف المحجوب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ حضرت سید ابو الحسن ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب کشف المحجوب میں لکھتے ہیں ''مجھے اس سیاحت میں خراسان کے تین سو اولیاء اللہ سے مصافحہ کی سعادت نصیب ہوئی تھی اور حاضری کا شرف ملا۔ ان اولیاء کرام میں دنیائے اسلام کے جلیل القدر مشائخ اور ارباب کرامت تھے۔ ہم داتا گنج بخش کی اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں جو آپ نے اپنے پیر ومرشد ابو الفضل ختلی کی زبانی فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرے پیر ومرشد حضرت حصری نے خراسان کے ایک جنگل میں اپنے ہم عصر اولیاء کرام کو دعوت دی۔ میں نے دیکھا کہ دنیا کے گوشے گوشے سے اولیاء اللہ کے کاروان آنے شروع ہوئے۔ ہر ایک ولی اللہ ایک تخت پر بیٹھا فضا میں اڑتا چلا آرہا ہے اور ہر ایک کے ساتھ سو سو زیر تربیت بزرگ آرہے ہیں۔ میرے پیر ومرشد نے فضا سے اڑنے اور اترنے

والے کسی صاحب کرامت بزرگ کی طرف توجہ نہ کی مگر ایک بزرگ جو پیدل چل کر پہنچے تھے۔ ان کے پاؤں کے جوتے ٹوٹ چکے تھے۔ لباس غبار آلود تھا، چہرہ سفر کی سختیوں سے گرد آلود تھا۔ آپ آگے بڑھے استقبال کیا اور بتایا انہیں کسی کرامت کی پروا نہیں بلکہ کرامتیں خود ان کی تلاش میں رہتی ہیں۔

خراسان کی سرزمین میں صاحب کرامت اولیاء اللہ کی اتنی کثرت ہے معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں صدی کا اسلامی معاشرہ روحانیت کی تربیت میں بے حد خوش قسمت تھا۔ پھر حضرت داتا گنج بخش جن اصحاب کی نورانی مجالس اور محافل میں نشست و برخاست رکھتے تھے وہ کتنے صاحب فکر و نظر تھے۔ آپ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ میرے ایک دوست بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ خراسان کے ایک علاقہ کے گورنر نے آپ کو تیس ہزار درہم بطور نذرانہ بھیجے۔ آپ اس وقت ایک حمام میں غسل فرما رہے تھے۔ باہر آئے، نذرانہ قبول کیا اور کھڑے کھڑے غربا و مساکین میں تقسیم کر دیا۔ ایثار و غریب پروری کی یہ مثالیں اہل اللہ کے ہاں ملتی تھیں۔

حضرت داتا گنج بخش کشف المحجوب میں لکھتے ہیں:

''ایک بوڑھے درویش کو کوفہ کے بازار میں دیکھا جو کئی دنوں سے بھوکے اور پیاسے تھے اور سفر کی پریشانیوں سے نڈھال تھے۔ ہاتھ پر ایک خوبصورت چڑیا بٹھا رکھی تھی اور آواز لگا رہے تھے'' ہے کوئی جو یہ چڑیا خرید لے تا کہ میں کھانا کھا سکوں'' لوگ ان کے ارد گرد جمع ہو گئے اور انہیں سمجھانے لگے آپ اللہ کے نام پر روٹی مانگیں لوگ دیں گے۔ آپ نے فرمایا'' میں روٹی کے لیے خدا کا نام نہیں بیچ سکتا''۔

حضرت ابو القاسم امام قشیری حضرت داتا گنج بخش کے استاد مکرم تھے۔ آپ

اپنے زمانہ کے نادر الوجود اور بلند قدر ولی اللہ تھے۔ زمانے کے حالات و واقعات سے ماہر تھے۔ دنیا کے واقعات پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ ہر موضوع پر بڑی عمدہ گفتگو فرمایا کرتے۔ آپ کی تصانیف و تالیفات اہل علم و عرفان کے لیے روحانی دولت کا سامان تھیں۔ صاحب ''خزینۃ الاصفیا'' نے آپ کا سنہ وصال 465ھ لکھا ہے۔ حضرت داتا گنج بخش نے آپ کے علمی اور روحانی انوار سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ آپ لکھتے ہیں کہ مجھے ایک مسئلہ درپیش تھا۔ میں نے اس کے حل کے لیے بڑی تگ و دو کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر میں اپنے استاد گرامی کی خدمت میں ''طوس'' پہنچا۔ حضرت امام قشیری اس وقت اپنی مسجد میں اکیلے بیٹھے مسجد کے ستون کو مخاطب کر کے وہ مسئلہ سمجھا رہے تھے جس کی تلاش میں مجھے اتنا لمبا سفر کرنا پڑا۔ میں آپ کے پاس بیٹھ گیا آپ ستون سے ہم کلام رہے۔ جب آپ گفتگو کے بعد خاموش ہوئے تو میں نے سلام عرض کیا اور دریافت کیا'' حضرت ستون سے گفتگو کا کیا معنی؟'' آپ نے فرمایا ابھی ابھی اس ستون نے مجھ سے یہ مسئلہ دریافت کیا تھا میں اس کی وضاحت کر رہا تھا۔ حضرت داتا گنج بخش فرماتے ہیں کہ آپ نے میرا مشکل مسئلہ حل کر دیا تھا اور میں مطمئن ہو گیا۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے پیر و مرشد حضرت شیخ ابو الفضل ختلی اپنے وقت کے بلند پایہ شیخ طریقت اور زبردست عالم تفسیر و احادیث تھے۔ آپ حضرت حصری کے محرم راز مرید تھے۔ آپ نے زندگی کے ساٹھ سال بیابان و جنگلات میں بسر کیے۔ لوگوں سے دور رہے اور عالمانہ لباس اور مشائخ کا جبہ و دستار نہیں پہنا۔ حضرت داتا صاحب فرماتے ہیں میں نے ساری عمر اتنا نفیس اور دبدبے والا بزرگ نہیں دیکھا۔

وہ دمشق کے قصبہ ''بیت الجن'' میں رہتے تھے۔ لوگ دور دراز سے چل کر آپ کی خدمت
میں حاضر ہوتے تو آپ کی توجہ سے بے پناہ فائدہ اٹھاتے۔ حضرت داتا گنج بخش لکھتے
ہیں ایک دن میں اپنے پیرو مرشد کو وضو کرا رہا تھا۔ میرے دل میں خیال آیا جب اللہ
تعالیٰ نے ہر ایک کی تقدیر اور مقدر لکھ دیا ہے تو پھر یہ نمازیں، روزے، ریاضتیں اور
استاد، پیرو مرشد کی خدمات کا کیا فائدہ؟ حضرت نے میرے دلی خدشات کو پالیا اور
ہی فرمایا: ''بیٹا! تمہارے دل میں جو خیالات آرہے ہیں میں ان سے واقف ہوں۔ یاد
رکھو اس دنیا میں ہر کام کا ایک سبب ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اپنی قربت اور
عظمت سے نوازتا ہے تو اسے پہلے گناہوں سے توبہ کی توفیق دیتا ہے۔ پھر اسے اپنے
بندے کی خدمت میں لگا دیتا ہے وہ خلق خدا کی خدمت کر کے اللہ کا محبوب بن جاتا
ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اعزازات حاصل کرتا جاتا ہے اور یہی نوشتہ
تقدیر ہے''۔ داتا صاحب فرماتے ہیں کہ میرے پیرو مرشد ابو الفضل ختلی وصال سے
پہلے اپنے گھر ''بیت الجن'' میں تشریف فرما تھے۔ میں بھی آپ کے حجرے میں موجود
تھا۔ حضرت کا سر میرے پہلو میں تھا اور میری نگاہیں آپ کے چہرے پر تھیں۔ اس
طرح میں نے عالم روحانیت کے سورج کو غروب ہوتے دیکھا۔ آپ نے نزع کے
عالم میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''بیٹے! دنیا کی تمام چیزیں خواہ اچھی ہوں یا
بری، اللہ نے بنائی ہیں۔ تم اچھی چیزوں کو اپنا لو مگر بری چیزوں سے جھگڑا مت کرو کیونکہ
یہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں''۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ ایک سفر کے دوران چین میں فرغانہ کے قصبہ
میں جا پہنچے۔ فرغانہ کے پاس ہی ایک گاؤں تھا۔ جس کا نام ''ساتک'' تھا۔ وہاں ایک

بزرگ رہتے تھے۔ جن سے آپ کو ملنے کا اشتیاق تھا۔ داتا صاحب لکھتے ہیں یہ بزرگ او
تاد کے منصب پر فائز تھے۔ اہل اللہ انہیں ''اوتاد الارض'' کہا کرتے تھے۔ مقامی
بزرگ لوگ آپ کو ''باب العمود'' کہہ کر یاد کیا کرتے تھے۔ آپ جس گھر میں رہتے
تھے۔ وہاں آپ کی ضعیف العمر بیوی فاطمہ کے علاوہ اور کوئی نہ رہتا تھا۔ میں اتنی
دور سے چل کر صرف اس بزرگ کی زیارت کو آیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہوئے فرمایا ''تم کیوں
آئے ہو؟'' میں نے عرض کی حضور کے چہرہ انور کی زیارت کو حاضر ہوا ہوں۔ فرمانے
لگے بیٹا! یہ سفر و سیاحت بچوں کا کھیل ہے اب مجھے ملنے کے لیے سفر کی ضرورت نہیں
جہاں توجہ دو گے مجھے سامنے پاؤ گے۔ اسی اثنا میں آپ نے بیوی فاطمہ کو آواز دے کر
مہمان کے لیے کچھ لانے کو کہا۔ وہ ایک طشتری میں نہایت عمدہ انگور اور تر کھجوریں
لائیں۔ حالانکہ نہ وہ انگور کا موسم تھا نہ وہاں تازہ کھجوریں ملتی تھیں۔ میں ان کی تواضع کا
آج تک لطف محسوس کرتا ہوں۔

حضرت عبداللہ رودباری صوفیہ کرام میں بلند مقام والے بزرگ تھے۔
دریائے دجلہ کے کنارے ایک گاؤں ''صور'' میں رہتے تھے۔ بڑے صاحب کرامت
اور ماہر علوم شریعت تھے۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو اپنی ابتدائی زندگی میں
دیکھا تھا۔ آپ کا ایثار و تقویٰ اس قدر قوی تھا کہ آپ اپنے مرید کو بھی ایثار اور سخاوت کا
نمونہ بنا دیتے تھے۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ آپ کا ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ آپ اپنے
رئیس اور امیر مرید کے گھر آئے۔ گھر دنیوی اشیا سے بھرا پڑا تھا مگر مرید گھر میں موجود نہ
تھا۔ آپ نے غربا و مساکین کو بلایا اور مرید کا سارا گھر لٹا دیا۔ ہر چیز کو غربا میں تقسیم
کر دیا۔ مرید آیا اس نے گھر کو خالی پایا۔ حضرت مرشد کو دیکھا تو اطمینان حاصل ہوا اور

اللہ کا شکر ادا کیا کہ

اب بے نیاز گردش دوراں ہوئے تو ہیں

مرید کی بیوی نے اپنے زیورات اور ریشمی ملبوسات بھی حضرت عبداللہ کے حوالے کر دیں۔ یہ بھی گھر کا سامان ہے اسے بھی مساکین میں تقسیم کر دیں۔ مرید نے دیکھا تو بیوی نے ہنس کر کہا یہ کیا تکلف ہے۔ بیوی نے کہا جو کچھ شیخ نے کیا وہ "جود" ہے اور جو کچھ ہم نے کیا وہ تکلف ہے۔ جود و تکلف دونوں اللہ کو پسند ہیں۔ یہ تھے مرشد اور یہ تھے مرید سب کچھ اللہ کی راہ پر لٹا کر مطمئن تھے۔

حضرت الشیخ ابوالقاسم گورگانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے بے مثال بزرگ تھے۔ اپنے دور کی لاثانی شخصیت۔ آپ کی توجہ نے ہزاروں طالبان حق کو واصل باللہ کر دیا تھا۔ شیخ ابو علی فارمدی جیسے صاحب کرامات بزرگ آپ کے خلیفہ تھے۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی مجالس سے بڑا روحانی فیض پایا تھا۔ آپ "کشف المحجوب" میں لکھتے ہیں کہ ایک دن مجھے حضرت کی مجلس میں حاضری کا اتفاق ہوا تو میں نے اپنے احوال و مقامات بیان کرنا شروع کیں۔ میں جواں سال تھا اور مراحل سلوک طے کر رہا تھا۔ اور اپنے تجربات اور احوال بیان کرتے وقت بڑا خوش تھا۔ اپنی منازل طے کرنے پر غرور کا اظہار بھی کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ حضرت میری باتیں سن رہے ہیں مگر بڑے سکون اور خاموشی سے۔ میرے دل میں خیال آیا غالباً آپ کو میری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ بڑے بزرگ ابتدائی تجربات اور مشکلات سے ناواقف ہوتے ہیں اور ہمارے احوال کی قدر نہیں کرتے۔ حضرت نے میرے ان قلبی خدشات کو بھانپ لیا اور فرمانے لگے "بیٹا! یہ انکساری اور عاجزی تمہارے لیے نہیں ہے یہ تمہارے

احوال و مقامات کے لیے ہے۔ میں تو اس ذات کے لیے عجز کر رہا ہوں جو احوال کو تبدیل کرنے والا ہے۔ میں تو ہر طالب کے لیے بھی انکسار اور عجز اختیار کرتا ہوں جو مقامات سلوک سے گزرتا ہے"۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ میں حضرت کی بات سن کر دم بخود ہو گیا مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔ آپ نے فرمایا "بیٹے! طریقت میں جب بندے کو ان حالات سے گزرنا ہوتی ہے تو اس کو اس کے گمان میں بند کر دیا جاتا ہے جب انسان اپنے آپ میں بند ہو جاتا ہے، وہ اپنی نفی کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ میں فنا ہو کر اپنے تمام گمانوں اور دعوؤں سے خالی ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر اس کے سامنے بس اللہ کی ذات ہی ہوتی ہے جس کی اطاعت کرتا ہے"۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس دن کے بعد جب میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا تو خاموش بیٹھا رہتا اور اپنے احوال بیان کرنے کی بجائے اسرار و رموز سے دامن بھرتا۔ میں نے آپ کی مجالس سے وہ اسرار و رموز پائے کہ اگر بیان کروں تو دریا ٹھاٹھیں مارنے لگیں۔

شیخ ابواحمد المظفر بن حمدون خراسان کے ایک صوبے کے گورنر تھے۔ جذب حقیقی نے اپنی طرف کھینچا تو تخت شاہی پر ہی مقامات و مراتب ملے جو سالوں کی ریاضتوں اور مجاہدات سے نہیں ملتے۔ اقتدار اور حکومت پر رہتے ہوئے آپ نے مقامات سلوک حاصل کیے۔ سلطان المشائخ شیخ ابوسعید ابوالخیر فرمایا کرتے تھے۔ "ہم تو اللہ کی بندگی اختیار کر کے اس تک پہنچے مگر خواجہ مظفر کو تاج و تخت میں بیٹھے بیٹھے دولت روحانیت مل گئی، ہم مجاہدہ کرتے رہے وہ مشاہدہ سے بلند مقام ہو گئے"۔ حضرت داتا گنج بخش فرماتے ہیں۔ اگر چہ مجھے حضرت ابواحمد المظفر کی مجالس سے زیادہ استفادہ کا موقع

نہیں ملا مگر آپ کے بیٹے خواجہ احمد نے مجھے بتایا کہ ایک دن خواجہ مظفر کے پاس سیتاپور
سے چند ایسے ولی اللہ آئے جنہیں اپنی اولیائی پر بڑا ناز تھا۔ ایک نے مجلس میں کہا، پہلے
فنا ہے پھر بقا۔ شیخ خواجہ مظفر نے فرمایا کہ اگر فنا ہے تو بقا کی ضرورت ہی کیا ہے بقا قائم
ہوگی تو فنا ختم ہوگی۔ حضرت داتا گنج بخش فرماتے ہیں، میں نوعمر تھا مجھے سفر کی گرمی نے
ستایا ہوا تھا۔ میں طویل سفر کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لباس گرد آلود تھا۔
چہرے اور سر کے بال پراگندہ تھے۔ مجھے دیکھ کر فرمانے لگے ابوالحسن! اپنی قلبی حالت
بیان کرو اور بتاؤ کہ تمہاری کیا تمنا ہے؟ میں نے عرض کی، حضرت میرا دل چاہتا ہے کہ
سماع سنوں، آپ نے اپنے ایک خادم کو حکم دیا کہ گھر سے قوالوں کو بلا لاؤ۔ قوال
آئے سماع شروع ہوا۔ کئی لوگ مجلس میں جمع تھے۔ میرے اندر جوانی کی آگ بھڑک
رہی تھی۔ باطنی ارادت کی وجہ سے سماع سے بڑا لطف اندوز ہوا۔ حضرت نے مجھے
پوچھا ''سناؤ ابوالحسن مجلس سماع کیسی رہی؟'' میں نے عرض کی حضور بڑا لطف آیا۔ سفر کی
تھکان جاتی رہی اور روح کو تازگی ملی۔ کچھ عرصے کے بعد میرا جوش اور سماع کا اشتیاق
ٹھنڈا پڑنے لگا تو آپ نے مجھے اپنے پاس بلایا اور فرمایا۔ ابوالحسن ایک وقت آئے گا
کہ قوالی اور کوے کی آواز میں تمہیں کوئی فرق محسوس نہ ہوگا کیونکہ سماع کا اشتیاق اسی
وقت تک رہتا ہے جب تک انسان کو مشاہدہ حاصل نہیں ہوتا۔ مشاہدے کے بعد سماع
اور دوسری ریاضتیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے احباب میں شیخ زکی ابن علا شیخ ابوجعفر
صیدلانی، شیخ ابوالقاسم سری، شیخ الشیوخ ابوالحسن ابن سابعہ، ابواسحاق، شہریار، ابو
الحسن علی بن بکران، شیخ شفیق فرج زنجانی، شیخ ابوطاہر مکشوف، شیخ عبداللہ جنیدی، خواجہ

حسن سمنانی، شیخ محمد بن سلیح، خواجہ ابوجعفر، محمد الحواری، خواجہ محمود نیشاپوری، خواجہ رشید،
مظفر ابوسعید، شیخ احمد نجار سمرقندی اور ابوالحسن ابی طالب الاسود جیسے جلیل القدر صوفیہ
عصر کے اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ ان بزرگان دین کے علاوہ سیکڑوں باکمال صوفیہ
آپ کے دوست تھے جو دنیائے تصوف میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے رہے ہیں۔
یہ حضرات شام، عراق، فارس، آذربائیجان، طبرستان، کرمان، خراسان، ماوراءالنہر غزنی
اور ایران کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔

حضرت حماد اور شیخ ابوسعید آپ کے خصوصی دوست تھے جلیس مجالس اور
شریک سفر و حضر تھے۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ غزنی سے لاہور آئے تو آپ بھی
حضرت کے ہمرکاب تھے۔ قیام لاہور کے دوران آپ کے ساتھ رہے، حضرت داتا گنج
بخش رحمۃ اللہ علیہ کی معرکہ آرا کتاب کشف المحجوب شیخ ابوسعید کی فرمائش پر لکھی گئی تھی بلکہ
فاضل مصنف نے آپ کے بعض سوالات کے جواب میں آپ کو مخاطب فرما کر یہ گراں
مایہ کتاب ترتیب دی۔ شیخ ابوسعید ایک بلند پایہ عالم اور صوفی تھے۔ وہ ایک زیر تربیت
سالک کی حیثیت سے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہے۔ لاہور میں
ابتدائی دنوں میں جن مصائب اور ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑا اس میں شیخ ابوسعید
نہ صرف برابر کے شریک تھے بلکہ حضرت داتا گنج بخش کے لیے ایک رفیق غمگسار رہے،
ان مشکلات کے بعد جن کامیابیوں نے حضرت داتا گنج بخش کے قدم چومے ان میں
شیخ ابوسعید کا باقاعدہ حصہ ہے۔

صاحب کشف المحجوب نے اپنی کتاب میں جہاں تصوف کے اسرار و رموز کو
بیان کیا ہے وہاں آپ نے اپنے سفر اور بزرگان دین سے ملاقاتوں کی تفصیل بھی بیان

کی ہے پھر جن بزرگان دین سے استفادہ کیا ہے ان کا تذکرہ بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ صرف افراد ہی نہیں آپ نے اکثر بزرگان دین کے مزارات سے بھی استفادہ کیا اور روحانی برکات حاصل کیں۔ آپ اپنی کتاب میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ مجھے بعض مشکل مسائل کا سامنا تھا۔ میں نے بڑی کوشش کی مگر میری قلبی مشکلات حل نہ ہوسکیں۔ میں حضرت بایزید بسطامی کے مزار پر تین ماہ تک ٹھہرا رہا مگر مسائل اور مشکلات جوں کی توں رہیں۔ آخر میں نے خراسان جانے کا ارادہ کیا اور پھر ''کش'' کے ایک قریبی گاؤں میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس گاؤں میں کسی ولی اللہ کا مزار تھا۔ اس خانقاہ پر کئی گدڑی پوش صوفیہ کرام قیام پذیر تھے۔ میں نے اس دن ایک کھردری گدڑی پہنی ہوئی تھی۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا، صرف ایک کوزہ اور ایک ڈنڈا تھا۔ ان صوفیوں نے مجھے اس لباس میں دیکھا تو حقارت سے نظر انداز کر دیا اور کہنے لگے تم ہم میں سے نہیں ہو۔ میں واقعی ان میں سے نہیں تھا۔ رات کا ایک حصہ گزرا تو مجھے کہنے لگے تم اس اونچی جگہ نہ رہو۔ وہ خود ایک چبوترے پر جا بیٹھے۔ انہوں نے مجھے ایک باسی، اور بدبودار سوکھی روٹی دی اور خود اعلیٰ قسم کے کھانے کھانے لگے۔ مجھے ان کے کھانوں کی خوشبو آرہی تھی۔ اور ان کے چٹخاروں کی آواز سنائی دے رہی تھے۔ وہ کھانا کھاتے رہے اور مجھ پر طنز بھی کرتے جاتے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ خربوزے کھانے لگے اور خربوزوں کے چھلکے مجھ پر پھینکتے جاتے اور قہقہے لگاتے جاتے۔ میں نے دل میں کہا اے اللہ! اگر یہ لوگ تیرے نیک بندوں کے لباس میں نہ ہوتے تو میں ان کی وہ خبر لیتا کہ وہ یاد رکھتے۔ اس کے باوجود ان کی زبانیں طنز کرنے اور ہاتھ چھلکے پھینکنے سے نہ رکے۔ میں ان کی یہ حرکات برداشت کرتا رہا۔ اپنے نفس کی انا کو دباتا

رہا۔ ان کی ملامت پر ضبط کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس برداشت کی وجہ سے میری قلبی مشکلات آسان فرمادیں اور میرے مسائل حل ہوگئے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ بعض مجہول اور جاہل قسم کے لوگوں کو اپنے ساتھ کیوں رکھتے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے دوران سفر کئی ایسے اولیاء اللہ سے ملاقات کی جو واقعی اللہ کی راہ میں درویش بے نوا کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ آپ کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ میں نے ایک بیابان میں ایک ایسے شخص کو دیکھا جو سال میں چالیس چالیس روز متواتر کھائے پیے بغیر رہتا تھا۔ شیخ دانش ابومحمد باغری رحمۃ اللہ علیہ جب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو میں وہاں موجود تھا۔ سابقہ ستر اسی دن سے آپ نے کچھ نہ کھایا تھا۔ پھر اتنے عرصہ میں آپ نے ایک نماز بھی قضا نہیں کی تھی۔ میں نے ایک درویش کو دیکھا جو اسی دن تک روزے سے رہا اور تمام نمازیں باجماعت ادا کرتا رہا۔ مرو کے علاقہ میں مجھے ایسے دو بزرگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ایک کا نام مسعود تھا اور دوسرے کا شیخ ابو علی سیاہ تھا۔ حضرت مسعود نے شیخ ابوعلی سیاہ کو بلایا اور کہا آؤ آج سے چالیس دن کا چلہ کریں اور کچھ نہ کھائیں اور نہ پئیں۔ ابوعلی سیاہ نے جواب دیا کہ میرے پاس آجائیں اور ہر روز خوب پیٹ بھر کر مرغن کھانا کھائیں مگر چالیس روز تک ایک ہی وضو سے تمام نمازیں ادا کریں۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہزاروں مردان خدا کو ملتے تھے اور ان کی مجالس وصحبت سے استفادہ کرتے تھے۔

(قومی ڈائجسٹ لاہور، حضرت علی ہجویری نمبر مئی ۲۰۰۱ء ''جہانِ رضا'' لاہور مئی ۲۰۰۷، پندرہ روزہ سائبان لاہور یکم نومبر ۲۰۰۷ء)

کشف المحجوب کی حکایات

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کی قوت برداشت

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت لکھی ہے کہ حضرت ابراہیم ادھم سے ان کے ایک دوست نے پوچھا:

''تم کبھی اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہوئے ہو؟''۔

فرمانے لگے: ''مجھے زندگی میں دوبار کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ میں جن دنوں خراسان کا بادشاہ تھا، میرے دل میں آیا کہ میں تنہا سفر کروں، میرے کپڑے میلے کچیلے تھے، بال بکھرے ہوئے تھے، حجامت بڑھی ہوئی تھی...... میں ایک کشتی میں سوار ہوا اور کشتی کے ایک کونے میں بیٹھ گیا، مجھے کوئی نہ پہچانتا تھا، جو شخص مجھے دیکھتا حقارت کی نظر ڈالتا، کشتی میں بیٹھے بعض لوگ میرا مذاق اڑانے لگے، مجھے دیکھ کر مذاق کر کے حقارت آمیز قہقہے لگاتے۔ میں خاموشی سے برداشت کرتا رہا، اس کشتی میں ایک مسخرہ بھی سوار تھا، وہ میرے ساتھ بڑے بے ہودہ مذاق کرتا اور تمسخر اڑاتا، لوگ اس کی باتیں سن کر خوش ہوتے اور تالیاں بجاتے...... اب وہ مسخرہ اٹھا، میرے پاس آ کر میرے سر کے بال نوچنے لگا، منہ پر چپیڑیں مارتا، کشتی میں بیٹھے سارے لوگ خوش ہوتے، مگر میں یہ ساری چیزیں برداشت کرتا اور کچھ نہ کہتا اب وہ مسخرہ اور تیز ہو گیا۔ اس نے میرے سر پر پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ میں خاموشی سے برداشت کرتا رہا...... کشتی والے خوش ہوتے رہے، جب کشتی کنارے لگی تو اس برداشت کی وجہ سے مجھ پر اللہ کی رحمت کے دروازے کھل گئے''

''اسی طرح ایک بار میں ایک گاؤں میں گیا، سخت بارش ہو رہی تھی، سخت سردی تھی، میری گدڑی بھیگ رہی تھی، سردی اور ٹھنڈک نے میرے جسم کو شل کر دیا تھا، میں ایک مسجد میں نہانے کے لیے بڑھا تو مسجد سے لوگوں نے مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا، اس طرح میں نے دوسری مسجد کا رخ کیا، وہاں بھی پناہ نہ ملی...... تیسری مسجد کی طرف بڑھا وہاں بھی لوگوں نے داخل نہ ہونے دیا...... آخر کار میں ایک حمام کے پاس آیا، بھٹی کے ساتھ بیٹھ گیا، کپڑے سکھانے کی کوشش کی، مگر بھٹی کے دھوئیں نے میرے کپڑے سیاہ کر دیے، چہرہ سیاہ ہو گیا، کچھ وقت گزرا، اللہ کی رحمت کے دروازے کھل گئے، یہ سختیوں کو برداشت کرنے کا ثمرہ تھا''......

سختیاں برداشت کرنے سے اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے بعض مشکلات نے آگھیرا...... بڑی کوششیں کیں مگر میری مشکلات حل نہ ہوئیں...... ایسے حالات میں حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہوا، مجھے جب بھی ایسی مشکلات پیش آتیں میں حضرت کے مزار پر چلا جاتا...... مگر اس بار کئی دن گزر گئے۔ چلہ کشی بھی کی، تین ماہ تک مزار پر رہا، مگر میری مشکلات کا حل نہ نکلا...... اب میں نے خراسان کا سفر اختیار کر لیا، میں سفر کرتا ایک گاؤں جا پہنچا، وہاں ایک خانقاہ تھی، خانقاہ میں صوفیوں کی ایک جماعت ٹھہری ہوئی تھی، میں نے ایک کھردری اور میلی سی گدڑی پہن رکھی تھی، دوسرے مسافروں کی طرح میرے پاس سامان نہیں تھا، بس ایک لوٹا اور ایک لاٹھی تھی...... ان لوگوں نے مجھے نہ پہچانا بلکہ حقارت کی نگاہوں سے دیکھنے

لگے......وہ اپنے رسم ورواج کے مطابق باتیں کرتے جاتے ،بعض اوقات مجھے دیکھ کر
میرے متعلق سست باتیں بھی کرجاتے ،کبھی کبھی مذاق بھی کرتے ،مگر میں ان کے رویہ
کو برداشت کرتا رہا، انہوں نے ساری جگہ پر قبضہ کرلیا اور مجھے ایک دریچے کے پاس
بیٹھنے کو کہا اور خود سامنے کے ایک چبوترے پر بیٹھ گئے......مجھ پر ترس کھا کر ایک سوکھی
روٹی دی، جس پر پھپھوندی لگی ہوئی تھی مگر خود وہ عمدہ کھانا کھاتے رہے جس کی خوش بو
میری بھوک کو بھڑکاتی رہی......کھانا کھانے کے بعد انہوں نے خربوزے کھانے
شروع کردیے اور خربوزوں کے چھلکے مجھ پر پھینکتے...... یہ ان کی دل لگی تھی، وہ
خربوزوں کے چھلکے میرے سر پر پھینک کر قہقہے لگاتے......میں ان کی ساری حرکات کو
برداشت کرتا رہا اور اللہ کے سامنے عرض کی:

''اے اللہ! میں صوفیہ کے لباس میں ہوں اور تیرے محبوب بندوں کا لباس
پہنا ہوا ہے اب میں انہیں جواب میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا''......

ان کی بے ہودہ گفتگو بڑھتی گئی اور وہ مذاق میں زیادہ بے باک ہوگئے۔ میں
یہ سب کچھ برداشت کرتا گیا، قریب تھا کہ دامن صبر ہاتھ سے چھوڑ دیتا مگر مجھے اللہ نے
برداشت کی ہمت دی، صبح ہونے سے پہلے ہی مجھ پر اللہ کی رحمت کے دروازے کھل
گئے، میری مشکلات ختم ہوگئیں۔۔

حضرت ساقئی کوثر ﷺ کی عنایت

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ امام ابوحنیفہؒ کا ایک واقعہ لکھتے ہیں
کہ جن دنوں امام نوفل بن حبانؒ کا انتقال ہوا میں نے خواب میں دیکھا کہ قیامت بر

پا ہے، لوگ میدان حشر میں حساب گاہ میں کھڑے ہیں، میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو
میری نظر حضور نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور پر پڑی، آپ حوض کوثر کے کنارے پر جلوہ
فرما ہیں، آپ کے دائیں بائیں بہت سے بزرگ کھڑے ہیں، جنہیں میں پہچانتا تھا،
ایک سفید ریش بزرگ حضور ﷺ کے رخسار مبارک پر اپنے خوبصورت رخسار ملائے
نظر آئے ان کے پاس ہی حضرت نوفل بھی کھڑے دکھائی دیے، حضرت نوفل نے مجھے
دیکھا تو میرے پاس خود چلے آئے۔ میں نے عرض کی:

''مجھے پانی کے چند گھونٹ مل جائیں گے''؟

فرمایا: ''آج تو صرف حضور ﷺ کی اجازت سے ہی پانی ملتا ہے''

حضور ﷺ نے مجھے دیکھا اور اپنی انگشت مبارک سے اشارہ فرمایا، مجھے
پانی مل گیا۔ حضرت نوفل نے ایک پیالہ بھر کردیا، میں پیتا گیا مگر پیالہ لبالب بھرا رہا۔
میں نے حضرت نوفل سے پوچھا:

''حضور ﷺ کے رخسار مبارک پر رخسار رکھنے والے کون بزرگ ہیں؟

فرمایا: ''یہ حضرت سیدنا ابراہیم خلیل اللہؑ ہیں، دیکھو بائیں جانب حضرت سیدنا ابوبکر
صدیق کھڑے ہیں، میں مختلف بزرگوں کے متعلق پوچھتا گیا، میں سترہ بزرگوں کے
متعلق پوچھ سکا، تو میری آنکھ کھل گئی''۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے دوستوں میں سے ایک بزرگ حضرت احمد
حماد سرخسی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہوئے ہیں، وہ بڑے بلند پایہ ولی اللہ تھے۔ حضرت داتا
گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حماد سرخسی سے پوچھا کہ اپنی توبہ کا ابتدائی
واقعہ تو سنائیں، جس نے آپ کی زندگی بدل کر رکھ دی اور انقلاب آ گیا۔ آپ نے بتایا

کہ میں ایک بار سرخس کے بیابانوں میں دور نکل گیا اور اپنے اونٹوں کو دور دراز علاقوں میں لے جا کر چراتا رہا، خود میں یوں کرتا کہ بھوک اور پیاس کو برداشت کرتا، اپنا کھانا دوسروں کو کھلا دیتا اور کئی کئی دن بھوکا رہتا، میں اللہ کے اس فرمان کا سہارا لیتا:

ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ

''مسلمان اپنی جانوں پر ایثار کرتے ہیں اگرچہ انہیں تنگی ہی ہو''

مجھے اس آیت کی وجہ سے وہ لوگ بہت اچھے لگتے جو دوسروں کو کھلا کر خود صبر و قناعت کرتے ہیں، میں اسی آیت کریمہ کی راہ نمائی میں اپنا کھانا دوسروں کو کھلا دیتا اور خود بھوکا پیاسا رہتا۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ اس جنگل میں ایک شیر نمودار ہوا، وہ بھوکا تھا، میں اسے دیکھتا رہا، اس نے میرے ایک اونٹ پر حملہ کر کے اس کا پیٹ چیر پھاڑ ڈالا، میں نے اسے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے اس شیر کی حرکت دیکھتا رہا، شیر اگرچہ بھوکا تھا مگر وہ اونٹ کو چیر پھاڑ کرنے کے بعد خود گوشت کھائے بغیر ایک ٹیلے پر جا بیٹھا اور زور سے دھاڑا، اس کی آواز سن کر جنگل سے کئی درندے باہر نکل آئے اور اس اونٹ کا گوشت کھانے لگے، ان جانوروں میں چیتے، بھیڑیے لومڑ اور گیدڑ قسم کے مختلف جانور تھے، وہ اونٹ کا گوشت کھاتے رہے، جب سارے جانور سیر ہو کر چلے گئے تو شیر ٹیلے سے نیچے آیا اور بچا ہوا گوشت کھانے لگا، ابھی اس نے ایک ٹکڑا کھایا تھا کہ ایک لنگڑی لومڑی نمودار ہوئی، شیر گوشت چھوڑ کر پھر ٹیلے پر جا بیٹھا، جب وہ لنگڑی لومڑی پیٹ بھر کر گوشت کھا کر چلی گئی تو شیر ٹیلے سے دوبارہ نیچے آیا اور بچا کھچا گوشت کھانے لگا اور کھا کر چلا گیا...... میں یہ سارا نظارا دیکھ رہا تھا اور شیر کے ایثار کی تعریف

کر رہا تھا، جب میں لوٹنے لگا تو شیر نے مجھے دیکھ لیا اور کہا (جسے میں ہی سمجھتا تھا):

''اے احمد! لقمہ کا ایثار تو کتے بھی کر لیتے ہیں، مرد وہ ہے جو اپنی جان اور زندگی اللہ کی راہ میں قربان کر دے''

میں اس دن سے اپنی ذات کی بجائے دوسروں کو کھلانے میں خوشی محسوس کرنے لگا ہوں۔

حضرت خضر علیہ السلام اسرار الٰہیہ کے محافظ ہیں

حضرت ابوبکر وراق رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے بہت بڑے ولی اللہ ہوئے ہیں۔ وہ ایک دن حضرت علی بن علی حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے ابوبکر وراق کو کچھ کاغذات دیے اور کہا کہ انہیں دریائے جیحوں میں ڈال آؤ...... جب باہر آئے تو حضرت وراق نے کاغذات پر نظر ڈالی تو ان میں معارف و اسرار کا ایک خزانہ بند تھا، وہ انہیں گھر لے گئے اور محفوظ کر لیا، دوسرے دن وہ حضرت حکیم ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مجلس میں گئے تو آپ نے پوچھا:

''کاغذات دریا میں ڈال آئے اور تم نے ڈالنے کے بعد کیا دیکھا؟''

عرض کی کچھ نہیں، ان کاغذات کو پانی بہا کر لے گیا۔ آپ نے فرمایا:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے انہیں دریا میں نہیں ڈالا، جاؤ! انہیں دریا میں ڈال کر آؤ''

کاغذات جب دریا میں ڈالے گئے تو دریا کی لہروں میں سے لوہے کا ایک صندوق نکلا اس کا ڈھکنا کھلا، سارے کاغذات اس میں سما گئے اور صندوق پانی کی تہ میں چلا گیا۔

آپ نے سارا واقعہ آ کر حضرت حکیم کو بتایا اور پوچھا کہ حضرت اس میں کیا راز تھا؟

آپ نے بتایا: ''بیٹا! ان اوراق پر اولیاء و مشائخ کے علوم کے اسرار لکھے تھے، جو عام آدمیوں کی بلکہ اہل علم و فضل کی ذہنی دسترس سے بھی بلند تر تھے، حضرت خضر علیہ السلام نے یہ کاغذات محفوظ کرنے کے لیے مجھ سے مانگ لیے تھے''

مصائب میں اللہ کا شکر ادا کرنے والے لوگ

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ کی رضا پر مطمئن رہنے اور اسے ہر حالت میں قبول کرنے کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عبادت گزار بندہ تھا، جسے اللہ نے چار سو سال سے بھی زیادہ زندگی عطا کی تھی اور وہ چار سو سال تک ایک ہی وادی میں عبادت کرتا رہا...... ایک دن اسے خیال آیا کہ اگر اللہ تعالیٰ یہ پہاڑ نہ بناتا تو اس کے بندوں کو چلنے پھرنے میں آسانی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے پیغمبر کے ذریعہ اس عابد کو تنبیہ فرمائی کو تم نے عبادت کرتے کرتے ہمارے معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا ہے، لہذا آج سے تمہارا نام نیک بندوں کے دیوان سے نکال دیا گیا ہے۔ اور اشقیا اور بد بخت لوگوں کے دفتر میں لکھ دیا گیا ہے...... اس عابد نے یہ بات سنتے ہی مایوس ہونے کی بجائے خوشی کا اظہار کیا اور سجدۂ شکر بجالاتے ہوئے اس پیغمبر کو عرض کی:

''شکر ہے، میں اللہ کے کسی دفتر میں شمار و قطار میں تو آ گیا ہوں، آپ اپنے اللہ سے میرے لیے ایک سفارش کریں کہ اے میرے اللہ! میں خوش قسمت ہوں کہ تو نے اپنے ایک دیوان میں میرا نام لکھا ہے مگر ایک عرض ہے کہ دوزخ میں پھینکتے وقت مجھے اتنا جسیم اور موٹا کر دے کہ میرے سوا تیرا کوئی گناہ گار بندہ اس دوزخ میں نہ آ سکے اور میں اکیلا

ہی تیرے بندوں کے بدلے عذاب میں جلتا رہوں اور تیرے سارے گناہ گار بندے میری وجہ سے جنت میں چلے جائیں، میں تیری رضا پر مطمئن ہوں اور تیرے حکم پر راضی ہوں''

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو فرمایا:

''میرے اس بندے کو بشارت دو کہ تو نے ابتلا اور مصیبت میں بھی میرا شکر ادا کیا ہے اور میری رضا پر قائم رہے ہو، اب قیامت کے دن تجھے جنت میں داخل کیا جائے گا بلکہ تو جس کی شفاعت کرے گا اسے بھی بخش دیا جائے گا''۔

اللہ کی رضا کا کتنا بلند مقام ہے، اس کی رضا پر زندگی گزارنے والے اسے بے حد پسند ہیں، '' رضی اللّٰہ عنھم و رضو اعنہ '' انہی لوگوں کا مقام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ؓ نے اللہ کی رضا پر راضی ہو کر وہ مقام حاصل کیا جس پر فرشتے بھی رشک کرتے تھے، اولیاء اللہ بھی اللہ کی رضا پر قائم رہتے ہیں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دریائے نیل کو پیغام

کشف المحجوب میں سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا تاریخی واقعہ لکھا ہوا ہے کہ حضرت سیدنا فاروق اعظم کی خلافت کے دوران مصر فتح ہو چکا تھا...... مصر میں دریائے نیل سارے ملک کو سیراب کرتا تھا مگر مصریوں کے ہاں ایک روایت بنی ہوئی تھی کہ جب تک ہر سال ایک خوب صورت دوشیزہ کو قتل کر کے بطور نذرانہ اس میں نہ پھینک دیا جاتا، اس کی روانی جاری نہیں رہتی تھی۔ یہ صورت حال سیدنا عمر فاروق اعظم ؓ کی خدمت میں پہنچائی گئی، آپ نے ایک رقعہ لکھا:

"اے دریائے نیل! اگر تم خود رکتے ہوتو رکے رہو، لیکن اگر تم خدا کے حکم سے جاری رہتے ہوتو میں اس خدا کا بندہ عمر تجھے حکم دیتا ہوں کہ رواں ہو جاؤ"۔ جب یہ رقعہ دریائے نیل میں ڈالا گیا تو دریا کا پانی رواں دواں ہو گیا اور پھر کبھی نہ رکا، نہ خشک ہوا:

آں کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ او

بحروبر در گوشہ دامانِ او !

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ ان لوگوں کی راہ نمائی کے لیے لکھا ہے جو صحابہ کرام کی کرامات کے منکر ہیں...... آپ بتانا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ کے غلام جب کسی چیز کو حکم دیتے ہیں تو وہ سر تسلیم خم کر دیتی ہے...... غلامانِ رسول کی بادشاہی کائنات ارضی کے ذرہ ذرہ پر نافذ ہے اور ان کے اشاروں سے دریا رواں دواں رہتے ہیں۔

حضرت بایزید بسطامی پر رحمت کے دروازے کھل گئے

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا واقعہ لکھا ہے۔ جس میں شریعت کی اتباع کی اہمیت سامنے آتی ہے...... آپ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک ولی اللہ کی شہرت سنی تو بسطام سے چل کر اس کی زیارت کے لیے گیا، میں اس ولی اللہ کی مسجد میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر سے نکل کر مسجد میں آ رہے تھے اور کلی کر کے مسجد کے اندر کھڑے کھڑے قبلہ رخ ہو کر منہ سے پانی پھینک رہے تھے...... میں نے سوچا کہ ولی اللہ تو شریعت رسول کے احکام کا احترام کرتے ہیں، یہ کیسا ولی اللہ ہے؟...... چنانچہ میں ملے بغیر ہی واپس آ گیا، مگر مجھے اس کی اس حرکت پر دکھ ہوا اور اس ولی اللہ پر ترس آیا کہ وہ شریعت کے احکام سے اجتناب

خبر ہے...... میں نے اس کی ہدایت کے لیے اللہ سے دعا کی...... مجھے اسی رات حضور ﷺ کی زیارت ہوئی، آپ ﷺ نے مجھے دیکھ کر فرمایا: "بایزید! آج تو نے وہ کام کیا ہے جس کی برکت سے تم ولایت کے ایک خاص درجہ پر فائز ہو گئے ہو"۔

اس خواب کے بعد مجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازے کھل گئے۔

ہم نے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب "کشف المحجوب" سے یہ چند واقعات بیان کیے ہیں۔ ان واقعات کی روشنی میں ہم اپنے قارئین سے التماس کرتے ہیں کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی پر نظر ڈالیں اور اپنے آپ کو ان بزرگانِ دین کے واقعات کی روشنی میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ یہ ایسی حکایات ہیں، جن کی روشنیاں ہماری راہ نمائی کرتی ہیں اور ہم زندگی کی تاریکیوں سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی رضا کی روشنیوں میں سفر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

("جہانِ رضا" لاہور اپریل ۲۰۰۶ء)

دُرودِ پاک کے خیابانوں میں چند لمحات

قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے حبیب مکرم ﷺ کو ایک بشارت کا اعلان فرمایا ہے: ان اللّٰہ وملائکتہٗ یصلّون علی النّبی "میں اور میرے فرشتے میرے نبی پر درود پڑھتے ہیں" اس بشارت کے بعد ایک حکم نافذ فرمایا "یا ایہا الذین آمنوا صلو اعلیہ وسلّمو اتسلیما" اے اہل ایمان تم میرے محبوب پر درود اور سلام پیش کیا کرو جیسا سلام پیش کرنے کی شان ہے۔" اس فرمان کی روشنی میں کائنات ارضی پر رہنے والے اہل ایمان سرکار دو عالم کی بارگاہ میں صلوٰۃ وسلام کے تحفے بھیج رہے ہیں ان کی تعداد، ان کا شمار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے انداز میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق صلوٰۃ وسلام کے تحائف پیش کرتا ہے۔ مگر آج کی محفل میں ہم موجودہ زمانہ کے چند عاشقان رسول کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ جو مختلف انداز میں بارگاہِ رسالت میں اپنے تحائف درود وسلام پیش کرتے ہیں۔

الحمد للہ! مجھے زندگی کے ابتدائی دور میں دود پاک کے ایسے باغوں میں رہنے کا موقع ملا ہے جہاں ہر طرف سرکار دو عالم ﷺ پر درود وسلام کی خوشبو دار ہوائیں چلتی ہیں اور دل ودماغ کو معطر ومعنبر کرتی جاتی ہیں۔

میرے استاد گرامی مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمتہ اللہ علیہ (م:۱۹۴۴ء) نے دہلی دروازہ لاہور کے باہر ستی کوتوالی کے ساتھ آج سے اسی (۸۰) سال پہلے ایک دو منزلہ مسجد تعمیر کی تھی۔ جس میں آپ کے شاگرد، دینی علوم حاصل کرتے تھے اور

سالکانِ راہِ طریقت تربیت پاتے تھے۔ ان دنوں میں عمر عزیز کے بارہ سال گزار چکا تھا۔ اور گلستان و بوستان کے دیباچے پڑھا کرتا تھا۔ میرے استادِ گرامی کا معمول تھا کہ خود تورات کا اکثر حصہ سرکار دو عالم کی بارگاہ میں ہدیہ درود وسلام پیش کرنے میں مصروف رہتے مگر فجر کی نماز کے بعد تمام اساتذہ، زیر تربیت سالکانِ مجذدیہ اور طلبہ، درود پاک کے لیے ایک حلقہ بناتے اور کھجوروں کی ہزاروں گٹھلیوں پر درود شریف پڑھتے۔ اس حلقہء درود کی برکت سے ہمارے لیے طعام، لباس اور دوسری ضروریات خزانہ غیب سے پوری ہوتی رہتی تھیں اس وقت مجھے درود پاک کے روحانی فیوضات کا شعور تو نہ تھا۔ مگر میں محسوس کرتا تھا کہ ہر شخص درود پاک کی وجہ سے مجھے محبت کی نگاہ سے دیکھتا اور مجھے یوں محسوس ہوتا کہ

ان کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیے ہیں!

ہمارے استاد نے پندرہ جلدوں میں "تفسیر نبوی" پنجابی اشعار میں لکھی۔ قرآن میں جہاں جہاں ذکر رسول آیا اس مقام پر سرکار دو عالم ﷺ پر درود شریف کے فضائل کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا۔ پھر آپ نے دو مستقل کتابیں "شفاء القلوب" اور "اظہار انکار المنکرین من صلوٰۃ المحبّین" لکھیں جن کے کئی کئی ایڈیشن چھپے اور دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچے۔

مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد گرامی پیر عبد الغفار شاہ قادری کاشمیری تھے جو لاہور شہر کے درمیان اپنے مدرسہ غوثیہ میں طلبہ کی کثیر تعداد کو دینی علوم سے سرفراز فرمایا کرتے تھے۔ پیر عبد الغفار شاہ رحمۃ اللہ علیہ کشمیر سے آئے تھے ان کا معمول تھا کہ وہ کثرت سے درود شریف پڑھتے۔ اس طرح ان کے شب و روز درود پاک کے

باغوں کی خوبصورت کیاریوں میں گزرتے۔ انہوں نے تیرہ مجلدات حضور کی بارگاہ میں درود و سلام پر ترتیب دی تھیں اور انہیں چھپوا کر لوگوں میں تقسیم کرتے تھے۔ آپ نے اپنے مدرسہ غوثیہ کی پیشانی پر لکھا تھا: "لنا شغلا فی الصلوٰۃ الرسول اللہ"۔ "ہماری زندگی کے شب و روز تو سرکار دو عالم ﷺ پر درود شریف کے سائے میں گزرتے ہیں"

آپ کا معمول تھا کہ آپ ہر جمعرات کی صبح کو اپنے احباب کو دریائے راوی کے کنارے لے جاتے اور ایک وسیع حلقہ بنا کر سب مل کر درود شریف پڑھتے۔ کئی بار تو ایسا ہوتا کہ اس حلقے میں سو سو حضرات سے زیادہ لوگ درود پڑھنے کے لیے دریا کے کنارے پر پہنچ جاتے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ "دریائے راوی پر حضرت خضر علیہ السلام کا گزر رہتا ہے اور وہ درود پاک کی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں اگر ظاہر آنکھوں سے ان کی زیارت نہ بھی ہو تو بھی ان کی موجودگی کا احساس ہر درود پڑھنے والے کو ہوگا"۔

میں نے حضرت پیر عبدالغفار شاہ صاحب کی زیارت تو نہیں کی تھی مگر جب میں نے ان کے وصال کے بعد ان کی ذاتی لائبریری دیکھی تو اس میں دس ہزار سے زائد درود پاک کی کتابیں موجود تھیں۔ ان کی ایک کتاب "خزائن البرکات" جو بڑی تقطیع پر ہزار صفحات پر خوبصورت قلم سے لکھی ہوئی تھی، میں نے اس کی زیارت کی تھی۔ اس میں بڑے شاندار، نادر و نایاب درود پاک درج تھے۔ افسوس یہ کتاب رجال الغیب کی طرح ایسی غیب ہوئی کہ آج تک نظر نہیں آئی۔ اور یہ غنچہ ناشگفتہ ہی رہا اور زیب محفل اہل محبت نہ بن سکا۔

پیر صاحب کا معمول تھا کہ درود پاک جہاں سے ملتا وہاں سے حاصل کر لیتے میرے استاد فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت کو کسی نے بتایا کہ کوہ ہمالیہ کے دامن میں نیپال کے پرے ایک مرد خدا رہتے ہیں ان کے پاس ایک ایسا درود پاک ہے جو کسی کے پاس نہیں ہے۔ آپ نے اپنے بیٹے محمد اشرف کو بھیجا اور اس درود پاک کے حاصل کرنے کے لیے اس نے بڑا لمبا سفر کیا۔ آپ کا بیٹا دو سال تک سفر میں رہا اور پہاڑوں، وادیوں اور برفانی گھاٹیوں سے گزرتا گیا۔ پھر جا کر اس نے یہ خوبصورت پھول لا کر اپنے والد کی خدمت میں پیش کیا۔

مجھے کئی ایسے دوست ملے ہیں جو حضور نبی ﷺ کی درود شریف کی وادیوں میں سیر کرتے دکھائی دیے۔ میں جب ان کی زیارت کرتا ہوں تو مجھے ان کے چہرے کھلتے ہوئے گلاب کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی باتوں سے خوشبو آتی ہے۔ ان کی صحبت کے چند لمحات دل کو تازگی بخشتے ہیں وہ جب میرے پاس تشریف لاتے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ

میرے دل کی انجمن میں شمع بن کے آ گئے

کبھی کبھی وہ مجھ سے روٹھ جاتے ہیں تو یہ بھی ان کی ادائے دلنوازی ہوتی ہے، ان کی شان بے نیازی ہوتی ہے مگر پھر خود ہی راضی ہو کر میرے پاس آ جاتے ہیں۔

یہ دراصل درود پاک کی خصوصیت ہے جو انسان کو تکبر اور نفرت سے پاک کر دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے میں نہ ان سے جدا ہونا پسند کرتا تھا نہ وہ مجھ سے ناراض رہنا گوارا کرتے تھے۔

آج سے بیالیس سال قبل ایک صاحب (اب نام یاد نہیں رہا) مشرقی

پاکستان سے آئے اور مجھے عام کاغذ پر تیس جلدوں میں درود پاک کا مطبوعہ مجموعہ دے
گئے۔ جس کا نام ''مجموعہ صلوٰۃ الرسول'' تھا۔ یہ ایک شاہکار محبت تھا جو حضرت مولانا
عبدالرحمٰن چھوہروی رحمۃ اللہ علیہ، عاشقِ رسول، فنافی الصلوٰۃ الرسول نے مرتب کیا تھا۔ غالباً
وہ مشرقی پاکستان میں تشریف لے گئے تھے ان کے نیازمندوں نے یہ مجموعہ عام کاغذ
پر شائع کیا تھا اور اس کی خوشبو سارے عالم کا جریدہ بن کر اہل دل کو معطر کرتی گئی۔ تیس
جلدوں کا یہ مجموعہ انیس سو پچانوے میں ان کے صاحبزادہ سید محمد طاہر شاہ چھوہروی کی
کوششوں سے دوبارہ بڑے خوبصورت انداز میں چھپ کر سامنے آیا۔ تو حضور نبی کریم
ﷺ کے درود کی خوشبوؤں نے سارے عالم کو مہکا دیا۔

کس کی زلفوں کی مہک لائی ہے بطحا سے نسیم   دل و جاں وجد کناں جھک گئے بہر تعظیم

اس درود پاک کا ترجمہ شیخ الحدیث مولانا محمد اشرف صاحب سیالوی نے کیا
اور اس پر نظر ثانی علامہ ممتاز احمد سدیدی نے کی۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ ساری
دنیا میں پھیلی۔ میرے دو عزیز دوست ایس ایم سعید اور ایس ایم شفیق ماہتاب انڈسٹریز
، ساہیوال کی دلی خواہش تھی کہ یہ خوبصورت تحفہ ان کی طرف سے سرکار دو عالم ﷺ
کی بارگاہ میں پیش کیا جائے۔ انہوں نے کوشش کی مگر کسٹم پر نجدی مطوعوں نے ہر بار
روک دیا۔ الحمد للہ! ان احباب کی طرف سے یہ تحفہ جب خود لے کر میں سرکار کے
دربار میں حاضر ہوا تو بارگاہ رسالت میں پیش کیا اور اسے قطب مدینہ مولانا ضیاء
الدین قادری رضوی کی لائبریری میں محفوظ کر دیا گیا۔

حضرت علامہ الشیخ یوسف نبہانی رحمۃ اللہ علیہ عاشق رسول تھے انہوں نے اپنی گراں
قدر تصانیف میں درود پاک پر بڑی خوبصورت کتابیں لکھی ہیں ہمیں ان کی ایک کتاب

''افضل الصلوٰۃ علیٰ سید السادات'' بڑی پسند آئی۔ ہمارے بھائی حکیم محمد اصغر فاروقی
مرحوم نے عربی سے اردو میں بڑا خوبصورت ترجمہ کیا۔ جس پر خلیل احمد رانا نے ایک
خوبصورت مقدمہ لکھا۔ اس مقدمے میں انہوں نے عصر حاضر کے مشاہیر کے درود
پاک پڑھنے کے واقعات لکھ کر ثابت کیا کہ درود پاک کی بہاریں آج بھی ہماری روح
اور دل کو زندگی بخشتی رہتی ہیں اور اس کے اثرات اور برکات آج بھی ہماری راہنمائی
کرتے ہیں۔

ہمارے ایک عزیز دوست مشہور سکالر بشیر حسین ناظم وزارت مذہبی امور
حکومت پاکستان میں ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر رہے ہیں۔ کئی سال تک وہ
دیار حبیب کی حاضری دیتے رہے ہیں۔ وہ نعت خوان رسول ہیں اور اہل محبت کی
مجالس کو اپنی نعت خوانی سے پُر رونق بنا دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں حضور نبی
کریم ﷺ پر درود شریف پڑھنے کا معمول بنا لیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اب تک
میں نے چار کروڑ ساٹھ لاکھ بار حضور کی بارگاہ میں درود پاک پیش کیا ہے''۔

یہ عظمتیں ہیں مقدر کسی کسی کے لیے!

ایسے لوگوں سے دوستی رکھنا ان سے محبت کرنا حضور نبی کریم ﷺ کے
خیابان محبت میں داخل ہونے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

میرے ایک کرم فرما ممبئی (انڈیا) میں رہتے ہیں اسم گرامی کیپٹن عبدالستار
احمد بارگر کر ہے۔ انہوں نے اپنے پیرو مرشد شیخ الحدیث حبیب البشر خیری (رنگون)
رحمتہ اللہ علیہ کی ترتیب کردہ کتاب ''صل علیٰ محمد'' ۱۹۹۴ء میں ممبئی (انڈیا) میں شائع
کی۔ کتاب کیا تھی سرکار دو عالم کی بارگاہ کا ایک گلستان تھا جو مہکتا ہوا اہل محبت کے

دلوں کو معطر کرتا گیا۔ ہم نے اس کتاب کا عکس جمیل پاکستان میں شائع کیا۔ اور ''تحفہ درود شریف'' کے نام سے اسی ہزار جلدیں خوبصورت انداز میں شائع کر کے مفت تقسیم کیں۔ یہ ''تحفہ درود شریف'' جہاں جہاں گیا مدینہ کی وادیوں سے نسیم خلد کے جھونکے لے کر گیا اور ہر جگہ دلوں کے غنچے کھل اٹھے۔

آج سے دس سال قبل ہمیں اردو بازار میں درود شریف پر ایک بڑی خوبصورت کتاب ملی، پڑھی تو دل کے غنچے کھل اٹھے۔ لکھنے والے نے قدم قدم پر حضور کی بارگاہ میں پھول نچھاور کیے تھے سطر سطر سے بوئے نسیم مدینہ آتی تھی۔ دل میں خیال آیا کہ پوچھوں یہ کون شخص ہے؟ جو میرے آقا کے درود پاک کے باغیچوں کی خوشبو لے کر ہمیں خوش کر رہا ہے۔ خط لکھا تو چند دنوں بعد ایک خوبصورت اور خوش لباس نوجوان ہمارے پاس آپہنچا۔ اور فرمایا: ''میں ہوں نذیر احمد ضیاء نقشبندی جس نے وہ کتاب لکھی، جسے پڑھ کر آپ نے مجھے خط لکھا تھا''۔ خوش آمدید کہا۔ استقبال کیا۔ مرحبا کہا۔ ہاتھ چومے اور مل کر دل خوش ہو گیا۔

حضور کی بارگاہ میں ایسے پھولوں کے گلدستے پیش کرنے والے ان دنوں کمشنر انکم ٹیکس تھے مگر حضور کی بارگاہ میں درود کی سوغات پیش کر کے میرے دل کے قریب آ گئے۔ آج تک نذیر احمد ضیاء نقشبندی میرے دل کی گہرائیوں کی محبت کی ان وادیوں میں رہتے ہیں جہاں حضور کے درود پاک کی معطر ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ انہوں نے ''اوراد فتحیہ'' مرتب کیا ہے ''دلائل الخیرات'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ان تمام سرفرازیوں کے باوجود ہمیں اپنی ملاقاتوں سے نوازتے رہتے ہیں اور جب وہ مزار حضرت داتا گنج بخش کی زیارت کے لیے آتے ہیں تو چند لمحوں کے لیے حضور پاک

کے درود پاک کی خوشبوؤں سے ہمیں حصہ دے کر جاتے ہیں۔

سید ممتاز شاہ میرے حضور کے باغوں میں درودوں کے گلدستے لے کر گھومنے والے درویش صفت آفیسر ہیں۔ درود کا یہ رشتہ انہیں ہمارے دل کے قریب لے آیا ہے۔ وہ آڈٹ ڈیپارٹمنٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ انہیں حضور کے درود سے اتنا عشق ہے کہ ان کی ذاتی لائبریری میں تین ہزار سے زیادہ درود پاک کی کتابیں موجود ہیں جنہیں آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور قرار دیتے ہیں۔ وہ جہاں جاتے ہیں درود پاک پر کتاب تلاش کرتے ہیں اور لے آتے ہیں اور ان کتابوں کو ایسے افسروں کے گھروں پر خیابانِ مصطفیٰ کے پھول دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب نے اپنے خطاباتی اور علمی ادارہ ''منہاج القرآن لاہور'' میں ایک ''گوشہ درود'' بنایا ہے۔ جس میں درود پڑھنے والے حضرات سکون سے درود کے اوراد پڑھتے ہیں۔ یہ نہایت اہم گوشہ ہے۔ جس میں وظیفہ درود پڑھنے والے چند روز ''اعتکاف'' کی نیت سے آتے ہیں اور درود شریف پڑھتے جاتے ہیں۔ ہم نے ابھی تک اس گوشہ درود کی زیارت تو نہیں کی۔ لیکن ہمیں اپنی محرومی کا خیال آتا ہے۔

اگرچہ حضور ﷺ پر درود پڑھنے والوں کی تعداد کسی شمار میں نہیں آتی اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس نور سے منور رہتا ہے مگر ہم صرف اپنے چند احباب کا ذکر اس لیے کر رہے ہیں کہ ہمارے نام بھی ان حضرات کے رجسٹر میں درج ہو جائیں جو حضور کے درود کو زندگی کا معمول بنائے ہوئے ہیں اور ہمیں بھی ان خوشبوؤں سے کچھ حصہ مل جائے جن سے ان کے دل و دماغ روشن ہیں۔

علامہ اقبال اپنی بے پناہ سیاسی اور علمی مصروفیات کے باوجود حضور کی بارگاہ میں درود شریف کا نذرانہ پیش کرتے تھے اور اس کام کو اپنی تمام سیاسی اور علمی بلندیوں کا ذریعہ جانتے تھے۔ آپ کے درود پڑھنے کا ایک ایمان افروز واقعہ کتابوں میں درج ہے۔ ۱۹۳۸ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج پنجاب کے استاد ڈاکٹر عبدالحمید ملک نے حضرت علامہ اقبال سے پوچھا کہ آپ ''حکیم الامت'' کیسے بن گئے؟ آپ نے فرمایا یہ مشکل کام نہیں آپ چاہیں تو آپ بھی بن سکتے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا میں نے حضور کی بارگاہ میں ایک کروڑ مرتبہ درود شریف پڑھا ہے۔ تم بھی پڑھو۔ حکیم الامت سے بلند مرتبہ پاؤ گے۔

انفرادی طور پر ہر مسلمان درود پاک کو اپنے اپنے انداز میں پڑھتا ہے۔

ہزاروں درود و ہزاروں سلام علیک السّلام یا نبی السلام

(ا۔ ''جہانِ رضا'' لاہور مئی ۲۰۰۷ء

۲۔ العقیقہ۔ لاہور۔ اکتوبر، نومبر ۲۰۰۷ء)

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا محمد نبی بخش نقشبندی المتخلص بہ ''حلوائی لاہوری'' قدس سرہ العزیز (متوفی یکم نومبر ۱۹۴۴ء) انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے دوران قطب الارشاد شہر لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کی اور ایک سنی العقیدہ جید عالم دین کی حیثیت سے علمی دنیا میں متعارف ہوئے۔ ایک قادر الکلام پنجابی شاعر کی حیثیت سے شہرت سخن وری پائی۔ ایک مفسر قرآن حکیم کی حیثیت سے اہل علم وفضل سے داد و تحسین حاصل کی۔ اپنی نظریاتی اور ناقدانہ طرز نگارش میں ممتاز ہوئے۔ تبلیغی مساعی کی وجہ سے پنجاب بھر میں تبلیغی فرائض کو سرانجام دیتے رہے۔ سادہ بود و باش کی وجہ سے فقیر بے نوا بنے اور ریاضت ومجاہدہ کی بنا پر ''سلسلہ نقشبندیہ'' کے مشائخ عصر سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ ایک مدرس، معلم، مفسر اور سالک راہ طریقت ہونے کی وجہ سے ہزاروں شاگردوں، متعلموں، قارئین، مریدین اور عقیدت مندوں کے ممدوح ومحبوب رہے۔

۱۹۳۷ء میں حضرت مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی درسگاہ دور و دراز کے طلبہ کو دعوت علم دے رہی تھی۔ دہلی دروازے کے باہر کوتوالی کی شمالی دیوار کے ساتھ آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی جو دو منزلی ہے۔ یہی مسجد آپ کی خانقاہ تصوف تھی، درسگاہِ طلبہ تھی ادارۂ تصنیف وتالیف تھی اور مرکز رشد وہدایت تھی۔ اس درسگاہ میں ان دنوں تقریباً تیس طلبہ علم دین حاصل کرتے تھے۔ ہر روز سیکڑوں علماء کرام ملاقات کو آتے۔ دینی موضوعات پر گفتگو کرتے۔ آپ کے خیالات سے بہرہ اندوز ہوتے۔ ذکر وفکر کے رسیا اسی مسجد کی راتیں زندہ رکھتے۔ صبح کی نماز کے بعد حضور پر

نور پر درود کا حلقہ ہوتا جس میں طلبہ وعلماء ، مسافر و درویش، فقیر وامیر، مہمان
ومیزبان سب شریک ہوتے ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت کی مجلس میں بیٹھنے والے لوگ
فقیر بھی تھے اور بے نظیر بھی۔

تیری محفل میں بیٹھنے والے   آدمی بے نظیر ہوتے ہیں!

حضرت مولانا کی خالی از تکلف اور سادہ زندگی ایک فقیر بے نظیر کی مثالی زندگی تھی۔
مجلس میں بیٹھتے تو امتیاز کہ وہ مہ نہ ہوتا۔ خود گفتگو کم کرتے مگر لوگوں کو بات کرنے کا
زیادہ موقع دیتے۔ لباس عام قصوری لنگی، سفید ململ کا کھلا کرتا، سر پر سفید درویشانی
ٹوپی، نرم اور سرخ کھال کی ''گامے شاہی'' جوتی، لوگ دور دور سے آتے، علم واسرار کی
جھولیاں بھر کر اٹھتے۔ سالکان طریقت روحانی تربیت پاتے۔ علماء مسائل اعتقادیہ پر
گفتگو کرتے طالب علم ''قال اللہ وقال الرسول'' کی دولت سے مالا مال ہوتے۔

۱۹۳۹ء میں آپ ''تفسیر نبوی پنجابی'' کی پندرہ مبسوط جلدوں کی تالیف اور
طباعت سے فارغ ہو چکے تھے اور بعض حصوں کے کئی کئی ایڈیشن زیور طبع سے آراستہ ہو
کر پنجاب بھر میں پھیل چکے تھے۔ یہ تفسیر ایک طرف علم وفضل کا خزینہ تھی، پنجابی شاعری
کا ایک ذخیرہ تھی، دوسری طرف اپنے دور کے دینی فتنوں اور اعتقادی ناہمواریوں
کا جواب تھی۔ آپ نے نظریاتی اختلافات کو ہوا دینے والے مؤلفین کا بڑا زوردار جواب
دیا۔ ''تفسیر محمدی پنجابی'' کے مباحث کو رد کیا۔ دلپذیر کے نظریات پر تنقید کی۔ تفسیر نعمانی
پر گرفت کی۔ علماء دیوبند کے نظریات کی چھان پھٹک کی، فتنہء مرزائیت کے جواب میں
کتابیں لکھیں اور نیچری تاویلات کی قلعی کھول کر رکھ دی۔ تفسیری کارناموں سے ہٹ کر
آپ نے بعض مسائل پر مستقل کتابیں لکھیں جو ہزاروں کی تعداد میں زیور طباعت سے

آراستہ ہو کر اہل علم کے مطالعہ میں آئیں۔ صحابہ کرام کی ذات بابرکات کو ہدف تنقید
بنانے والے رافضی، خصوصاً حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے
شیعوں کے جواب میں النار الحامیہ لمن ذم المعاویہ لکھی۔ اسمٰعیل دہلوی کے
عقائد کے رد میں ''شموس الوہابیہ'' لکھی۔ مساجد میں فتنہ برپا کرنے والے وہابین کے
خلاف ''اخراج الوہابین من المساجد المسلمین'' لکھی۔ نبی مکرم کے درود پاک کے
منکرین اور مانعین کے جواب میں اظہار انکار المنکرین من الصلوۃ المحبین
لکھی۔ پھر اہل محبت اور خلوص کے دلوں کو حضور نبی مکرم ﷺ کے درود پاک کی اہمیت
اور فضیلت سے روشن کرنے کے لیے کتاب شفاء القلوب پنجابی شعروں میں لکھی۔
نعتوں کے کئی مجموعے لکھے پنجابی، فارسی، عربی اور اردو میں مولود شریف، مناقب اور حمد و
ثنا پر بہت سے رسالے لکھے۔

۱۹۴۰ء کے اوائل میں آپ کے سامنے نظریاتی مباحث پر دو کتابیں آئیں۔
ایک ''انوار آفتاب صداقت'' جسے فضل احمد انسپکٹر لودھانوی نے لکھا اور طبع کرایا۔ اور
دوسری کتاب جاء الحق وزھق الباطل جسے مفتی احمد یار خاں صاحب نعیمی قدس
سرہ (مؤلف تفسیر نعیمی) نے گجرات سے شائع کیا۔ یہ دونوں کتابیں دیوبندی نظریات کا
زبردست جواب تھیں اور اہل سنت کے نقطہ نظر کی ترجمانی کی ایک کامیاب کوشش تھی۔
حضرت مولانا ان دونوں کتابوں سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ دونوں فاضل مؤلفین
کے پاس خود سفر کر کے گئے، ہدیہ تبریک پیش کیا، داد تحسین دی، حوصلہ افزائی کے لیے کئی
کئی جلدیں خرید کر عوام میں تقسیم کیں۔ پھر یہ محسوس کیا کہ تمام اختلافی امور پر ایک مبسوط
اور بھرپور کتاب لکھنے کی ابھی ضرورت ہے۔ چنانچہ آپ نے ''الامتیاز بین الحقیقت

والجاز'' کا مسودہ تیار کرنے میں کئی سال وقف کر دیے۔ ہزاروں حوالے کی کتابیں سامنے رہیں اور کم از کم دو سو اختلافی مسائل کے نظریات کو تقابلی جائزہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس مفید کتاب کا تقریباً تین ہزار صفحات پر پھیلا ہوا مکمل مسودہ ابھی تک اشاعت پذیر نہیں ہو سکا۔ مگر اس کا ایک حصہ چھپ کر سامنے آچکا ہے۔

تصنیف و تالیف کی دنیا سے ہٹ کر آپ نے ایک سالک طریقت کی حیثیت سے وقت کے مشائخ کی خدمت میں تربیت حاصل کی۔ معمولات اولیا کو اختیار کیا۔ مجاہدہ و ریاضت کی منزلیں طے کیں۔ اپنے پیرو مرشد حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری ہاشمی، خلیفہ خاص حضرت دائم الحضوری رحمۃ اللہ علیہ سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ ان کے وصال کے بعد حضرت پیر سید جماعت علی شاہ ثانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے زانوئے عقیدت تہ کیا، منازل سلوک طے کیں اور پھر خرقہ خلافت حاصل کیا۔ یہ دونوں مسائخ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی معروف شخصیتیں تھیں۔ ان حضرات کا روحانی فیضان مولانا محمد نبی بخش حلوائی کی زبان قلم کی وساطت سے ہزاروں طالبان حق تک پہنچا۔ سیکڑوں مریدوں نے، آپ کے زیر نگاہ رہ کر تربیت حاصل کی، مقامات سلوک طے کیے۔ شب بیداری قیام اللیل، کثرت درود اور معمولات اولیاء نقشبند کی نعمت حاصل کی۔ آپ کے شاگردوں نے نہ صرف اعتقادی اور نظریاتی پختگی حاصل کی بلکہ محبت رسول اور عشق مصطفےٰ کی نورانیت سے اپنے سینوں کو منور کیا۔

آپ لاہور کے ارائیں خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لاہور شہر کے اندر جہاں ان دنوں اکبری منڈی ہے، آپ کا اپنا مکان تھا۔ نولکھا کے مواضعات میں زمین تھی۔ دریا کے کنارے پر کنویں تھے۔ آپ نے ابتدائی دور میں پیشہ ''حلوہ سازی''

اختیار کیا ساتھ کے ساتھ علم دین بھی حاصل کرتے رہے۔ آپ کے دوسرے بھائی (مہر قادر بخش) کھیتوں میں سبزیاں اگاتے، شہر لاتے اور بیچتے۔ آپ حلوہ بناتے لوگوں کو کھلاتے۔ کھلاتے کھلاتے اللہ اور رسول کی باتیں سناتے۔ عام لوگوں میں بیٹھ کر مسائل دین ذہن نشین کرتے۔ مخلوق خدا مانوس ہوتی۔ حلوہ خورانی اور شیریں بیانی، دونوں شکم و قلب کو مطمئن کرنے والی چیزیں تھیں۔ پیٹ کی بھوک اور دل کی بے چینی کا علاج تھا۔

نگاہ کے تیر سے گر بچ گیا شکار کوئی
تو بڑھ کے زلف نے اس کو اسیر دام کیا

آپ کی دکان سے حلوہ کھانے والے اور ساتھ ساتھ محبت رسول میں ڈوبی ہوئی باتیں سننے والے آج تک حضرت حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے انداز گفتگو کو یاد کرتے ہیں۔

دکان سے جو بچتا، گھر کے مختصر اخراجات میں کام آتا یا کتابوں کی اشاعت میں صرف ہو جاتا۔ پھر آپ نے اپنے حصہ کی زمین اور باغات بیچ کر اللہ کا گھر بنالیا۔ ایک وقت آیا کہ مکان بیچ کر ''تفسیر نبوی'' کی اشاعت میں روپیہ لگا دیا اور تفسیر پنجاب کے دیہات اور قصبوں میں بانٹ دی۔ زمین بیچی، اللہ کا گھر بنالیا۔ مکان بیچا، اللہ کا کلام چھپوایا اور تقسیم کر دیا۔

یہ عظمتیں ہیں مقدر کسی کسی کے لیے

آج کوئی ایسی مثال ڈھونڈیں لاہور کے زمینداروں میں، آرائیوں میں، عالموں میں، پیروں میں، حتیٰ کہ عصر حاضر کے فقیروں میں جو مولانا حلوائی کی مثال ہو۔ میں اس زمانے میں بھی حضرت کی مجالس میں رہا۔ ان حالات کا عینی شاہد رہا۔ ان محافل کا خاموش مبصر رہا۔ میں نے علماء کرام کو آپ کے پاس آتے دیکھا اور حضرت

کے سامنے علمی مباحث میں مصروف پایا۔ مشائخ کو دیکھا تو حضرت کو ان کی پابوسی پر مفتخر پایا۔ نعت خوانوں کو دیکھا تو آپ کی مجالس کو مجلس ذکر میں بھرپور پایا۔ وظیفہ دل کے متوالوں کو آپ کے حلقہ درود پاک میں محو پایا۔ شب بیدار مسجد کے در و دیوار کو زندہ رکھتے اور واعظان خوش بیان مسجد کے محراب و منبر کو آباد رکھتے۔

آپ نے حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک کی کثرت سے، قلب و جگر میں جو کیفیتیں پائیں، آپ کے خامہ محبت نے پنجابی شعروں کی زبان میں بیان کر دیں۔ قرآن و احادیث سے استدلال کیا کہ حضور کی بارگاہ میں درود پیش کرنا ہی ایمان کی جان ہے۔ درود کے متعلق احکام شرعیہ کی وضاحت کی۔ درود پاک کے فضائل بیان کیے۔ درود پاک کے آداب بیان کیے، پھر اہل ایمان کے دلوں پر درود پاک کے جو تاثرات مرتب ہوتے، جو کیفیتیں قلب و جگر کی زینت بنتیں، انہیں لطیف حکایات میں بیان کیا۔ آپ نے اپنے آقا و مولا کی نعت و ثنا میں ڈوب کر اپنے قارئین کو دعوت مطالعہ دی ہے۔ بعض مقامات پر تو مؤلف علام، پنجابی ادب کے موتی رولتے جاتے ہیں اور پھولوں کی لڑیاں دربار مصطفٰے میں نچھاور کرتے جاتے ہیں۔

نبی کریم کی کائنات ارضی پر آمد آمد ہے۔ میلاد مصطفٰے کے انتظار میں آپ زمین کے گوشے گوشے اور ذرے ذرے کو چشم براہ پاتے ہیں اور پھر پنجابی زبان میں کیا منظر کشی کرتے ہیں:

کھل گئے در ہفت فلک دے خوشی ملائک کردے
ہشت بہشت سنگار کیتو نے بھاگوں خیر بشر دے
بدل چڑھے بہار فصل دے وسے مینہ کرم دے

گرد غبار زمین دی بیٹھی وقت گئے پھر غم دے
جھاڑو دے کے باد صبا نے دور کیتے ککھ کنڈے
فراش فضل دے فرش وچھائے مخمل سبز سوہندے
باغ بہار شگوفے ڈالیاں خوش رنگ نکلے سارے
سوہے، ساوے، سبز، سنہری، پھل دیون چمکارے
سنکے عید بہار درختاں سبز پوشاک لگائی
سرو اتے ہو ہو دی بنسری قمری آن وجائی
رکھے تاج درختاں سر تے وچھیا تخت پھلاں دا
کر کے صفاں کھلے رُکھ تکدے سارے راہ سجن دا
انگوراں سر سجدے سٹے ویلاں سیس نوائے
شاخاں میوے دار درختاں سبھناں ادب کمائے
باد نسیم معطر ہو کے گلاں پھلاں وچ آئی
ہووے مبارک آگھر گھر ہن گزریا وقت جدائی
تارے جھک آئے دل دھرتی تے وسدے اوگھنارے
چن سورج سائبان بنایا، موتی جڑ کے تارے

یہ جذبات، عشق و محبت کے بغیر بیان نہیں کیے جاسکتے۔ یہ مسرت دلی عقیدت کے بغیر سامنے نہیں آسکتی۔ یہ انداز وجدان و محبت کے بغیر اپنایا ہی نہیں جاسکتا۔

(''جہانِ رضا'' ماہ جنوری ۲۰۰۵ء)

یہ محفل جو آج سجی ہے، آپ بھی آئیں، بات سنائیں!

علی الصبح فون کی گھنٹی بجی۔ آواز سنی۔ تو امریکا سے سید منور علی شاہ بخاری بول رہے تھے۔ بڑی میٹھی آواز، بڑی شیریں گفتگو، اور بڑی نرم نرم باتیں۔ ''جہان رضا'' ملنے پر خوش ہو رہے تھے۔ ایک ایک صفحہ پر تبصرہ فرما رہے تھے۔ ایک ایک مضمون کا تجزیہ کر رہے تھے۔ ایک ایک لفظ کو تول تول کر بیان کر رہے تھے۔ ہمیں ان کی باتوں نے خوش کام کیا اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ امریکہ کی ایک دور دراز ریاست سے نہیں بلکہ حضرت داتا گنج بخش لاہور کے دربار کے برآمدے میں بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ سید منور علی شاہ بخاری، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے عشاق میں سے ہیں۔ ان کی تحریریں، ان کی کتابیں، ان کی نعتیں انہیں ازبر یاد ہیں۔ وہ ''جہان رضا'' سے محبت کرتے ہیں کیونکہ یہ وہ مجلّہ ہے جو اعلیٰ حضرت کے نظریات اپنے دامن میں سمیٹ کر چار دانگ عالم میں پھیلاتا رہتا ہے۔ وہ ''افکار رضا'' سے اس لیے پیار کرتے ہیں کہ وہ فاضل بریلوی کی باتوں کو مشرق و مغرب تک پہنچاتا ہے۔ انہوں نے ''جہان رضا'' کے پندرہ سالہ شماروں کو اپنے سامنے والی الماری میں سجا رکھا ہے۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت کی تصانیف سے اپنے کتب خانہ کو گلزار بنا رکھا ہے۔ انہوں نے امریکہ میں بسنے والے پاکستانی، ہندوستانی اور بنگلہ دیشی حضرات کے لیے ''مرکز تعلیمات رضا'' قائم کر دیا ہے۔ اور پکار پکار کر کہتے ہیں۔ آؤ! تاج دار بریلوی کی باتیں سنو۔

وہ باتیں کرتے جا رہے تھے میرے فون کی گھڑی نے مجھے آگاہ کیا کہ

بخاری صاحب کی باتیں سنتے سنتے تیس منٹ ہو گئے ہیں۔ مگر ان کی باتیں زلف یار کی طرح لمبی ہوتی جا رہی ہیں خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔ (0209)36899415

صبح ہوئی علامہ کوکب نورانی کا ''تیز رو قاصد'' آیا۔ کراچی سے ایک لفافہ لایا۔ لفافہ کھولا تو اس میں سے علامہ کوکب نورانی کے خوش خرام قلم سے اعلیٰ حضرت کے اولین سیرت نگار مولانا محمود جان جودھپوری پر لکھا ہوا سوانحی خاکہ برآمد ہوا۔ علامہ کوکب نورانی ہمارے مخلص دوست ہیں۔ ''جہان رضا'' کے لیے کبھی کبھی ''نفاست نامے'' عطا فرماتے ہیں۔ کبھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں جنوبی افریقہ گئے تو اعلیٰ حضرت کی منظوم سیرت ''ذکر رضا'' جو ۱۹۲۱ء میں چھپی تھی لیکر آئے اور حکم دیا کہ اسے زیور طباعت سے آراستہ کر کے ''دنیائے رضا'' میں پھیلایا جائے۔ یہ ان کی خصوصی عنایت ہے اور ہم اسے ''یکے از تبرکات اعلیٰ حضرت'' جان کر چھپوا رہے ہیں۔ اہل محبت کے مطالعے کے لیے صلائے عام دے رہے ہیں۔

علامہ کوکب نورانی کی شخصیت اپنی ذات میں ایک انجمن ہے۔ وہ اپنے والد گرامی مولانا محمد شفیع اوکاڑوی مرحوم کے جانشین ہیں۔ مسجد گلزار حبیب کراچی کی تعمیر و توسیع میں مصروف ہیں۔ دنیائے اسلام میں ایک سنی سکالر کی حیثیت سے اپنا شہرہ منوا چکے ہیں۔ ورلڈ میڈیا پر اہل سنت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کا قلم گلباری نہیں بعض اوقات گلبہار بن جاتا ہے۔

(021-7216532)

ڈاک کیا آئی ''مجلس رضا'' میں بہار آگئی۔ ہندوستان سے کنزالایمان (دہلی) جام نور (دہلی) الاشرفیہ (مبارک پور انڈیا) افکار رضا (ممبئی) اعلیٰ حضرت

(بریلی انڈیا) آ پہنچے۔ مجلہ فقہ اسلامی (کراچی) کاروان قمر (کراچی) المظہر (کراچی) ریاض العلم (اٹک) رضائے مصطفیٰ (گوجرانوالہ) اہلسنت (گجرات) ندائے اہلسنت (لاہور) کنز الایمان، نور العرفان، سوئے حجاز، سبیل الرشاد، النعیمیہ، عرفات (لاہور) آ پہنچے۔ الحسن (پشاور) آواز حق (پشاور) معارف رضا (کراچی) السعید (ملتان) انیس اہلسنت (فیصل آباد) الحقیقہ (شکرگڑھ) نعت رنگ (کراچی) النعیم (کراچی) نور الحبیب (بصیر پور) لانبی بعدی (لاہور) فیض عالم (بہاولپور) دعوت تنظیم الاسلام (گوجرانوالہ) الجامعہ (جھنگ) آستانہ (کراچی) سیدھا راستہ (لاہور) نور الاسلام (شرقپور) سبیل ہدایت (لاہور) جانِ رحمت (سانگلہ ہل) المصداق (حیدرآباد) ضیائے اسلام (حیدرآباد) شمس الاسلام (بھیرہ) مصلح الدین (کراچی) الملنکیہ (اوکاڑہ) محدث (لاہور) الاشراق (لاہور) جہانِ چشت (کراچی) ضیائے حرم (بھیرہ) قطار در قطار آ پہنچے۔ یہ ماہنامے اسلامی سنی صحافت کے گلہائے رنگا رنگ ہیں۔ ہماری محفل میں بیٹھے ہوئے ایک عزیز رضوی سکالر اٹھے اور محبت بھری آواز میں بولے۔ ”یہ سارے رسالے مجھے پڑھنے کے لیے دے دیں۔“ ابھی ہم نے ”ہاں“ نہیں کی تھی کہ وہ علمی اور ادبی پھولوں کا ٹوکرا اٹھائے چلتے بنے۔ ہم انہیں دیکھتے رہے اور تڑپتے رہے۔

پیتا بغیر اذن کے کب تھی میری مجال
دانستہ چشم یار کی شہ پا کے پی گیا!

ایک زمانہ تھا کہ ہم اعلیٰ حضرت امام اہلسنت کا ایک حلقہ سجایا کرتے تھے۔ فکر رضا پر بات کرنے والے جمع ہوتے اور ذکر رضا پر گفتگو کرتے۔ جہانِ رضا میں

لکھنے والے دور دور سے ہماری مجلس میں آتے اور مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرتے تھے۔ اب ان کے دیکھا دیکھی دوسرے حلقوں کے کئی احباب بھی آنے لگے ہیں۔ لاہور کے نامور عالم دین مفتی محمد خان قادری صاحب خطیب جامع مسجد رحمانیہ شادمان لاہور، تشریف لے آئے ان کے ساتھ ہی ”سوئے حجاز“ کے ایڈیٹر عزیز محترم محبوب الرسول قادری آ گئے۔ مفتی محمد خان قادری نے آج سے دس سال قبل ہماری فرمائش پر ”سلام رضا“ کی شرح لکھی تھی جسے رضوی حلقوں نے بے حد پسند کیا۔ مفتی صاحب درجنوں کتابوں کے مصنف اور بیسیوں کتابوں کے مترجم ہیں۔ ان کی تحریریں علمی حلقوں میں دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ وہ ”جامعہ اسلامیہ“ کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ ”کاروان اسلام“ کے قائد ہیں۔ پھر علمائے اہلسنت میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ ہمارے پاس تشریف لائے۔ ہماری علمی خدمات پر ہدیہ تحسین پیش کیا اور حوصلہ افزائی کی۔ پھر بتایا کہ وہ اپنی تدریسی مصروفیات کے باوجود ”تفسیر کبیر“ کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ انہیں مکہ مکرمہ کے عظیم سنی عالم دین محمد مالکی علوی، پیر طریقت محمد امیر شاہ صاحب قادری الگیلانی، علامہ فیض احمد اویسی بہاولپوری کے جواں سال صاحبزادے کی وفات پر اظہار ملال کرتے پایا۔ وہ کسی اجلاس میں جانے والے تھے ہمیں سر راہ نوازتے گئے۔ ان کے جانے کے چند منٹ بعد ”جمعیت علمائے پاکستان“ کے سابق صوبائی سیکرٹری سردار محمد خان لغاری، پیر خادم حسین شرقپوری، سید مزمل حسین شاہ، چودھری محمد افضل ایڈیٹر ”لانبی بعدی“ آ گئے۔ سیاسی صورت حال پر گفتگو کرتے رہے۔ یہ سیاسی لوگ ہیں۔ سیاسیاتِ حاضرہ پر معلومات بہم پہنچاتے رہے۔ وہ ابھی اٹھے ہی تھے کہ ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی ناظم جامعہ

نعیمیہ تشریف لے آئے۔ وہ کسی خاص اجلاس میں جا رہے تھے۔ چند لمحوں کے لیے ہمارے پاس رک گئے۔ دینی مدارس پر حکومتی خشمناکیوں پر اظہار خیال کرنے لگے اور علمائے کرام پر آئے دن جو سختیاں ہو رہی ہیں، اس کا تذکرہ کرتے رہے اور یہ کہہ کر اٹھ گئے کہ میں تفصیلات پھر بتاؤں گا۔

عزیزم مولانا صفی الرحمن رضوی ابھی طالب علم ہیں وہ ''جہانِ رضا'' کو صفحہ اول سے آخر تک پڑھ کر آئے تھے۔ وہ صفحہ صفحہ پر تبصرہ کرتے گئے ہمارا دل خوش ہوتا گیا انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس فاضل بریلوی کی ایک سو پچاس تصنیفات موجود ہیں ہم نے محسوس کیا کہ جواں سال طالب علم اعلیٰ حضرت بریلوی سے اتنی محبت کرتے ہیں ہم نے انہیں ایک سال کے لیے۔ ''جہانِ رضا'' اعزازی طور پر جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔

پروفیسر عبدالرؤف قریشی ہمارے مخلص احباب میں سے ہیں۔ وہ ہر روز جانِ محفل بن کر ہمارے پاس بیٹھتے ہیں لاہور کے نامور خطیب ہیں اور پیغام قرآن کے جلسوں میں تقریر کرتے ہیں۔ وہ ہمیں قومی درد کے واقعات سناتے ہیں اور مسلمانوں کی بے بسی پر گفتگو کرتے ہیں اور ہمیں غمگین کر دیتے ہیں۔ وہ ایک زمانہ تک علامہ ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے حلقہ احباب میں رہے مگر اب اپنے طور پر ''غلبہ اسلام'' پر تقریر کرتے ہیں۔

حضرت پیر محمد حسن شاہ گیلانی نوری سجادہ نشین خانقاہ چک سادہ (گجرات) تین ماہ تک دیار حبیب میں رہے واپسی پر تشریف لائے تو ''شہر محبت'' کی باتیں سنا تے رہے ہم جب ''شہر محبت'' میں حاضری دیتے تھے حضرت کی مجالس میں رہتے،

تھے۔ اس سال ہماری شکستہ پائی آڑے آئی نہ جا سکے۔ اسکے باوجود انہوں نے بارگاہ مصطفیٰ میں ہماری کئی بار حاضری لگوائی وہ مدینہ پاک کی باتیں سنا رہے تھے اور ساتھ ساتھ ان احباب کا تذکرہ کرتے جاتے تھے جنہوں نے بارگاہ مصطفیٰ میں ہمیں یاد کیا تھا۔ دیار حبیب سے واپس آنے والے دوسرے احباب نے بھی ہمیں اپنی زیارت سے مستفیض کیا ہم نے ان سے کہا!

'' آنے والو! یہ تو بتاؤ شہر مدینہ کیسا ہے'' ؟

صاحبزادہ محب اللہ نوری، سید ریاض الحسن گیلانی سینئر ایڈوکیٹ سپریم کورٹ، ملک عبدالمجید سانگلہ ہل، سید صبیح رحمانی (ایڈیٹر نعت رنگ) حافظ محمد اصغر (میزبانِ دستر خوانِ مصطفیٰ مدینہ منورہ) حاجی انعام اللہ اور ان کے بیٹے، اسلام آباد سے دس افراد کا قافلہ، احمد فاروقی ابن رشید فاروقی اور پنجاب کے ایک سو سے زیادہ علمائے کرام آ کر ملے جو دیار محبت سے سرفراز ہو کر آئے تھے۔

مولانا محمد عالم مختار حق ایک محقق کتاب دوست ہیں۔ وہ کتاب دوست ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے بھی دوست ہیں۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم کے دیرینہ احباب میں سے ہیں ''جہانِ رضا'' کے اشاعتی معاون ہیں۔ ہفتہ کی ہر صبح حکیم محمد موسیٰ مرحوم کے مطب پر جاتے ہیں اور ہمارے پاس بھی آتے ہیں۔ مختلف علمی موضوعات پر رہنمائی فرماتے ہیں۔ ''حیات اعلیٰ حضرت'' کی ترتیب اور ڈاکٹر مختار الدین احمد کے خطوط کی اشاعت میں رہنمایانہ کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف اور مقدمہ نویس ہیں۔ وہ ہماری محفل میں تشریف لائے علمی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے انہیں ''ذکر رضا'' کی اشاعت سے خاصی دلچسپی ہے وہ

ان دنوں میاں جمیل احمد شرقپوری کے جلیس مجالس ہیں۔ پروفیسر محمد اقبال مجددی کی کتاب "مقامات معصومیہ" کی اشاعت کے نگران ہیں۔ وہ ڈاکٹر محمد مسعود احمد مظہری صاحب کی کتاب "جہانِ مجدد الف ثانی" کی اشاعت کی راہیں دیکھ رہے ہیں ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ "جہانِ رضا" کے صفحات کی نگرانی کرتے ہیں اور جب "جہانِ رضا" چھپ جاتا ہے تو اس کی غلطیوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ فون نمبر: 042-7576978

"جہانِ رضا" کے دفتر میں اگرچہ علمائے کرام کی محفل میں آنا جانا لگا ہوا تھا مگر ہم نے اپنے استاد گرامی، مفسرِ قرآن، مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے سالانہ عرس کی تقریبات میں بھی جانا تھا۔ آپ کا عرس ۱۴ ذیقعد بمطابق ۲۷ دسمبر ۲۰۰۴ء ظہر کی نماز کے بعد آپ کی تعمیر کردہ مسجد نبویہ بیرون دہلی دروازہ لاہور منعقد ہو رہا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد مسجد میں سالانہ عرس کی تقریبات شروع ہوئیں۔ پہلے قرآن خوانی ہوئی، ختم قادریہ ہوا، ختم خواجگاں ہوا، نعت ومناقب کی محفل جمی، نماز عصر کے بعد مزار مبارک پر چادر پوشی ہوئی، پھولوں کے گلدستے سجے اور سلام پیش کیا گیا۔

نمازِ مغرب کے بعد علمائے کرام کی تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ ثناء اللہ بٹ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں نعت سنائی۔ آغاز بیان مولانا محمد صادق قادری صاحب کے الفاظ سے ہوا۔ فاضل نوجوان پروفیسر علامہ غلام مصطفیٰ صاحب مجددی نے تقریب کا آغاز کیا اور مولانا محمد نبی بخش حلوائی کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی۔ حضرت علامہ مجددی صاحب نے مولانا حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی پنجابی تفسیر کی ایک جلد کا اردو ترجمہ کیا تھا جو چھپ چکا ہے۔ آپ نے حضرت کی تفسیری خصوصیات کا جامع

الفاظ میں تذکرہ کیا۔ حضرت مولانا محمد شہزاد مجددی نے عالمانہ انداز میں صاحب مزار کی اعتقادی خدمات کو ہدیۂ تحسین پیش کیا۔ مفتی محمد خان صاحب قادری ناظمِ اعلیٰ دار العلوم اسلامیہ لاہور نے علمائے دین کی موجودہ معاشرہ میں ضرورت پر اچھی گفتگو کی۔ حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی کے شاگرد عزیز مولانا محمد عالم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند علامہ صاحبزادہ حامد رضا صاحب وزیر اوقاف حکومت آزاد کشمیر خصوصی طور پر تشریف لائے تھے۔ انہوں نے اپنے والد گرامی کی یاد کو تازہ کر دیا۔ اور حضرت مولانا نبی بخش حلوائی اور مولانا باغ علی نسیم رحمتہ اللہ علیہما کی علمی اور اعتقادی خدمات پر روشنی ڈالی۔

مجلس کے اختتام سے ذرا پہلے پروفیسر علامہ غلام مصطفیٰ مجددی، ایم اے سٹیج پر دوبارہ تشریف لائے۔ انہوں نے "تفسیر نبوی پنجابی" کی نسبت سے پنجابی زبان میں ایک تلمیحاتی منقبت سنائی۔

دین نبی سرور دا راکھا ، دل دا نور اُجالا
ونڈ گیا عشق حلاوت سوہنا " حلوہ ونڈن والا"
سخن جدھے تلواراں وانگوں وردے کفر دے اُتے
چاپ جدھے قدماں دی سن کے جاگے سُنی ستے
" لاثانی دا دلبر جانی " واقف راز " قصوری "
نقشبنداں دا نقش جہاں وچ ، صاحب ساز حضوری
عالم ، عامل، صوفی ،زاہد، عارف تے " حلوائی "
دولت دین دنی دی جس نے پاک مدینیوں پائی

"باغ علی" والا کے جس نے وچ "نسیم" چلائی
پھل وی ویکھے ایس چمن دی کردے پھرن جدائی
"فاروقی" وی جس دا منگتا عالم خدمت کردے
"گوجرے والے صوفی" آکے جس دا پانی بھردے
سدا بہار رہوے اس "باغے" وگے "نسیم" سوہانی
اسی غلام تے ایہہ آقا نیں واہ وا شان سہانی
پاک "نبی" نے رب توں لے کے ایہہ پھل "بخشیا" سانوں
مہک کھلا رے رہتیاں والی بخشے اہل وفا نوں

یاد رہے کہ اس سجی ہوئی محفل میں راقم (پیرزادہ اقبال احمد فاروقی) علمائے کرام کا تعارف کرانے، مہمانان گرامی کو خوش آمدید کہنے، شرکائے محفل کا شکریہ ادا کرنے، پھر جستہ جستہ اپنے پیرومرشد کی بارگاہ میں ہدیۂ تحسین پیش کرنے میں مصروف رہا۔

("جہانِ رضا" ماہ جنوری ۲۰۰۵ء)

پرائیویٹ باتیں

"جہان رضا" کے قارئین عید ملنے آگئے

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی "خوش آمدید" کہتے رہے

عید آئی تو تیری یاد آئی   چاند دیکھا تو تیری یاد آئی
غنچے چٹکے تو تیری یاد آئی   صبح پھوٹی تو تیری یاد آئی

عید آئی تو پیارے پیارے دوستوں کی یادیں آنے لگیں۔ پھر ان کے پیغام آنے لگے۔ بعض بڑے باہمت نکلے خود چلے آئے...... ہم نے اپنے ایسے دوستوں کے مسکراتے چہرے دیکھے تو دل جھوم اٹھا۔

ہماری عید تو ہے جب کہ دیکھیں تیرے ابرو کو
ہلال عید کو اے ماہ جبیں دیکھا تو کیا دیکھا!

ہمارے دوستوں میں سے عزیز "محمد نواز کھرل" بڑے پیارے دوست ہیں بڑی محبت کرتے ہیں۔ بڑے خلوص سے ملنے آئے۔ وہ آئے تو یوں محسوس ہوا۔

ہلال عید بر اوجِ فلک ہویدا شد!

وہ نوعمر ہیں اور دبلے پتلے جسم کے مالک ہیں۔ اسی لیے ہم انہیں "ہلال عید" کہہ کر یاد کرتے ہیں ورنہ ہم انہیں "بدر چہاردہ شب" بھی کہہ سکتے تھے اور اگر مزید بات بڑھاتے تو یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ

تم چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو
جو کچھ بھی ہو خدا کی قسم لاجواب ہو

وہ آئے۔اور نوٹنگم ''برطانیہ'' سے چھپنے والا میگزین ''ایمز انٹرنیشنل'' کا تازہ خوبصورت شمارہ لے آئے۔ میگزین کیا لائے ہمیں بھلا دینے والے دوستوں عبدالرزاق ساجد، تجمل گورمانی، صاحبزادہ فضل الرحمٰن اوکاڑوی کی یادیں ساتھ لیتے آئے۔ مربی ومحسن علامہ سید ریاض حسین شاہ کی چار رنگی تصویر اور صد ہزار رنگی باتیں لیکر آئے۔ پھر عرصہ سے ہمارے بھولے ہوئے بکھرے ہوئے، دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے، دوستوں کی یادوں کے پھولوں کا ایک باغیچہ لے کر پہنچے۔ جن کی خوشبوؤں سے دل کے غنچے کھل اٹھے۔ مفکر اسلام ڈاکٹر پیر سید عبدالقادر شاہ جیلانی آف لندن کی خوبصورت تحریر اور تصویر ''جماعت اہلسنت پاکستان'' کے ناظم اعلیٰ سید ریاض حسین شاہ کی تقریر با تصویر کا تحفہ اٹھا کر لائے۔ مدت ہوئی تھی مولانا غلام رسول چک سواری کو دیکھے۔ محمد نواز کھرل انہیں بھی ''ایمز'' کے صفحات پر برطانیہ سے اٹھا کر لے آئے۔ فرمانے لگے:

بخوبی لاف می زد گل، بہ پیشت بستہ آوردم!

عزیزم کھرل نے کئی دوستوں کی یادیں تازہ کر دیں۔ صاحبزادہ غلام ربانی افغانی برطانیہ سے، علامہ عبدالرزاق ساجد کے ساتھ باتیں کرتے آ پہنچے۔ ان کے ساتھ پیر زادہ سردار احمد قادری بھی آئے۔ مولانا بوستان القادری کو کبھی دیکھا نہ تھا۔ ہاں حضرت علامہ عمر حیات الحسینی آف بوسن ملتان کے قلم نے انہیں ''گلستان بوستان'' بنا کر دنیا میں پھیلا دیا۔ اور ہم اُن سے متعارف ہو گئے۔

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری   کہ از بوئے دلآویز تو مستم

کھرل صاحب نے بتایا۔ علامہ بوستان القادری مجاہد ملت بھی ہیں اور سفیر

اسلام در برطانیہ بھی ہیں۔ ابھی احباب کے ہجوم سے باہر نہ نکلے تھے۔ کہ پیر سید منور حسین شاہ جماعتی کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیا تو ''شہر محبت مدینہ منورہ'' میں ان سے ملاقاتیں یاد آئیں تو دل خوش ہو گیا۔ ''جماعت اہلسنت پاکستان'' کے مرکزی امیر سید مظہر سعید کاظمی اور ہمارے فاضل دوست علامہ عبدالنبی کوکب کے برادر عزیز قاضی مصطفیٰ کامل، پھر اپنے پرانے کرم فرما سابق وزیر با تدبیر حاجی حنیف طیب صاحبزادہ حامد سعید کاظمی کو کراچی۔ ملتان۔ لاہور سے ساتھ ملا کر آ گئے۔

محمد نواز کھرل کو کن الفاظ میں داد دی جائے اور ان کی محبت کا کس انداز میں شکریہ ادا کیا جائے کہ وہ ہمارے اہل سنت کا اتنا بڑا قافلہ ساتھ لے کر

ع میرے دل کی انجمن میں حسن بن کر آ گئے

سب سے پیارا تحفہ میرے عزیز از جاں عمران چودھری کو برطانیہ سے بلا کر لے آئے۔ ان کا مسکراتا ہوا چہرہ ان کے ''مجلہ مشرق ومغرب'' کی طرح روشنیاں بکھیرتا ہوا آ گیا۔

محمد نواز کھرل جو ہمارے جلسوں کی آواز ہیں، نے ''ایمز'' کے آخری صفحہ پر سیدنا غوث الاعظم جیلانی رضی اللہ عنہ کی ایک کرامت جلی حروف میں لکھی ہے کہ ''حضرت غوث اعظم نے ایک مرغی کی ہڈیوں پر ہاتھ رکھا اور ''قم باذن اللہ'' کہا تو وہ مرغی زندہ ہو گئی''۔ ہم نے کھرل صاحب سے پوچھا ''سنیوں کی مرغیوں کی ہڈیوں پر جناب غوث پاک کب ''قم باذن اللہ'' کہہ کر ہاتھ پھیریں گے۔ تاکہ یہ مرغیاں بھی زندہ ہو جائیں!''

عزیز من مولانا محمد صلاح الدین سعیدی جنہوں نے چوری چوری ہماری

تحریریں مرتب کر کے ''باتوں سے خوشبو آئے'' کے نام سے ایک کتاب شائع کر کے دنیائے اہل سنت میں پھیلا دی تھی، مسکراتا ہوا چہرہ لے کر عید مبارک کہنے آ گئے۔ وہ گئے تو ''تحریکِ غلبہء اسلام'' کے ناظم اعلیٰ پروفیسر عبدالرؤف قریشی تشریف لے آئے۔ صاحبزادہ سلیم حماد سجادہ نشین حضرت داتا گنج بخش اپنی زنبیل میں برکات اٹھائے آ گئے۔ پھر ''نعت رنگ'' کراچی کے ایڈیٹر سید صبیح الدین رحمانی اور علامہ کوکب نورانی کی آوازیں موبائل سے گونجنے لگیں اور عید کا پیغام سنا کر دل خوش کرتی گئیں۔ امریکہ کی ریاستوں سے سید منور حسین شاہ بخاری، محمد حسین امام، محمد عثمان نوری، علامہ ظفر اقبال نوری نے عید کے پیغامات بھیجے۔ سید محمد حسن شاہ الگیلانی نوری بھی بارگاہِ مصطفیٰ میں بیٹھے عید مبارک کہہ رہے تھے۔ بریلی سے پروفیسر عبدالنعیم عزیزی، علی گڑھ سے ڈاکٹر مختار الدین احمد، ممبئی سے رضا اکیڈمی کے ناظم اعلیٰ سعید نوری، ''افکارِ رضا'' کے زبیر قادری، ڈاکٹر محمد جابر شمس مصباحی، عبدالستار بار گر کی آوازیں موبائل کے راستے آئیں اور دل کو خوش کرتی گئیں۔ الحاج عبدالستار ''صل علی محمد'' کی پانچ خوبصورت جلدیں تحفہ عید بنا کر لائے۔

''جہان رضا'' کے بے شمار قارئین نے ہر شہر، ہر صوبے، ہر علاقے سے عید کی خوشی کے پیغامات بھیجے اور ہمیں ممنون فرمایا۔

عمرہ کرنے اور دیار حبیب کی زیارت کے بعد ہمارے رفیق قلم محترم محمد عالم مختار حق بذات خود عید کے مبارک تحائف لے کر آ گئے۔ صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرقپوری نے ''عید مبارک'' کے ساتھ کئی قسم کے ''تبرکات'' عطا فرمائے اور یہ تبرکات ''تحائف شیر ربانی'' تھے جو ہمارے سارے اہل وعیال اور عید پر آنے والے مہمانوں

کی خوشیوں میں اضافہ کرتے رہے۔ ابھی تک اہلِ محبت کے سیکڑوں ''تہنیت نامے'' ہمارے موبائل کے خفیہ خانوں میں محفوظ ہیں اور جب کبھی ہمارا دل اُداس ہوگا تو ہمیں اپنی پیاری آوازوں سے خوش دل کر دیں گے۔

ہماری والدہ مرحومہ اور ہمارے چھوٹے بھائی فیض احمد فاروقی مرحوم لاہور کے قبرستان میانی میں حضرت طاہر بندگی رحمۃ اللہ علیہ کے احاطے میں آرام فرما ہیں۔ زیارت کو گئے تو مرحومین میں سے کئی احباب جو ہمارے پرانے کرم فرما تھے۔ قبروں سے اٹھے اور دوڑے دوڑے ہمارے پاس آ پہنچے۔ ان سے ملیں یہ ہیں نادر و نایاب کتابوں کے تاجر مولانا شمس الدین، اور یہ ہیں خطاط العصر محمد صدیق الماس رقم۔ اور یہ ہیں مولانا غلام محمد ترنم، مفتی اعجاز ولی خان اور اعلیٰ حضرت کے خلیفہ مولانا محمد جان ہزاروی، پھر اپنے یار غم گسار محمد اکرام حسین مجددی رامپوری، یہ سب قبرستان میانی میں آرام فرما ہیں۔ ہمیں دیکھ کر عید کی خوشیاں لے کر جمع ہو گئے اور اپنے مسکراتے ہوئے چہروں سے ہمارے دل کو خوش کرتے رہے۔ وہ اتنے خوش تھے کہ کئی بار خیال آیا کہ ان کے ساتھ ہی بیٹھے رہیں اور اگر موقع ملے تو ان کے ساتھ ہی رہیں۔ ہم نے دبے لفظوں میں ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ اگر ہم آپ کے ساتھ آ جائیں تو ہمارے ساتھ کیسا سلوک ہوگا۔ ایک صاحب نے آگے بڑھ کر کہا:

؎ بیا بیا کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

دوسرے نے کہا:

بیا بیا کہ ہم قبریں کشادہ رکھتے ہیں

''خفتگانِ خاک میانی'' کا ایک میلا لگا ہوا ہے۔ یہ سارے لوگ قبروں سے

نکل نکل کر اپنے اپنے عزیزوں کے تحائف قبول کر رہے ہیں۔ دعائیں دے رہے ہیں۔ اظہار مسرت کر رہے ہیں۔ بعض اپنے نہ آنے والے عزیزوں کی راہیں تک رہے ہیں اور یاد کر کے اُنھیں پیغام دے رہے ہیں:

بیا بگورِ عزیزانِ خویش گزرے کن !

پچھلے دنوں آسمانِ رضویت کے کئی ستارے غروب ہو گئے اپنے عزیزوں، عقیدت مندوں اور شاگردوں کی آہوں اور سسکیوں کی پروانہ کرتے ہوئے عالم بقا کو پہنچ گئے۔ ہمارے پیارے دوست، عالم دین، محقق، معلم اور مصنف علامہ عبدالحکیم شرف قادری داغ مفارقت دے گئے۔ ابوالنور علامہ محمد بشیر کوٹلی لوہاراں پچانوے سال کی عمر میں راہی ملک بقا ہوئے۔ بریلی شریف میں خانوادہ اعلیٰ حضرت کے گل سر سبد حضرت علامہ تحسین رضا خان چلے گئے۔ لاہور سے مولانا عبدالغفور نقشبندی بھی داغ مفارقت دے گئے۔ ہمارے مہربان قدردان بزرگ جناب شوکت حسن خان کراچی کی اہلیہ محترمہ انتقال فرما گئیں۔ مرحومہ حضرت مولانا اختر رضا خان الازہری بریلی شریف کی ہمشیرہ تھیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے؟

(جہانِ رضا لاہور۔ اکتوبر نومبر ۲۰۰۷ء)

یارانِ محفل ''جہان رضا'' کی باتیں

تیری محفل میں بیٹھنے والے آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

ماہنامہ ''جہان رضا'' اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے افکار و نظریات کا ترجمان ہے۔ اس کے آشنائے قلم سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں ایک سو سے زیادہ علماء کرام کا ایک حلقہ ہے جو جہان رضا کے لیے چشم براہ رہتا ہے اور ''جہان رضا'' کی سطر سطر پڑھتا ہے بعض حضرات تو اتنے انہماک اور دلچسپی کا مظاہر کرتے ہیں کہ اگر کسی لفظ کا ایک نقطہ یا شوشہ بھی رہ گیا ہو تو ایڈیٹر کو سرزنش کرتے ہیں۔ اگر پروف ریڈنگ میں ذرا سی کوتاہی ہو جائے تو ان کی طبع سلیم پر گراں گزرتی ہے۔

پاک و ہند سے ماوراء عرب امارات، سعودیہ (خصوصاً مکہ و مدینہ) میں ''جہان رضا'' چپکے چپکے اہل محبت کے دلوں پر دستک دیتا ہے۔ یورپی ممالک، امریکہ اور افریقی ممالک میں تو جہان رضا دندناتا ہوا چلا جاتا ہے۔

آج ہم ''جہان رضا'' کے ایڈیٹر (پیرزادہ اقبال احمد فاروقی ایم اے) کی محفل میں آنے والے ان حضرات کا ذکر کریں گے جو بن بلائے چلے آتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں، رونق محفل بنتے ہیں۔ اپنے اپنے علاقے کی خبریں سناتے ہیں اور ''جہان رضا'' کے مضامین پر تبصرہ کرتے ہیں۔ اگر پوچھا جائے کیسے آنا ہوا تو فرماتے ہیں بس یونہی چلا آیا تھا۔ خیال آیا چلو وہ ''گنج خانہ'' دیکھوں۔ جہاں پیرزادہ اقبال احمد فاروقی ایم اے بیٹھے ہم سے قلمی طور پر ہم کلام ہوتے ہیں۔

لو ہمارے آنے سے پہلے ہی ایک مہمان عزیز جلوہ فرما ہیں۔ یہ کویت سے

ہوا کے دوش پر اڑ کر آئے ہیں۔الحاج صوفی شیر زمان صاحب دامت برکاتہم العالیہ ۔۔۔بیس سال سے زیادہ دیار محبوب میں رہے۔

قطب مدینہ مولانا ضیاء الدین مدنی خلیفہ خاص اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری دیتے رہے ہیں۔قطب مدینہ کے وصال کے بعد ان کے فرزند ارجمند مولانا فضل الرحمٰن مدنی کی مجالس کے جلیس رہے ہیں۔ہم جب بھی دیار حبیب ﷺ میں حاضری دیتے ہیں تو صوفی شیر زمان مدینہ پاک کی گلیوں میں ہماری انگلی پکڑ کر پھراتے رہتے ہیں۔ویسے وہ تحصیل تلہ گنگ کے ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں۔مگر وہ مدینہ پاک کی ایک ایک گلی سے واقف ہیں۔

تیرے کوچے اس بہانے میرا دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

وہ پاکستان کے ہر عالم اہلسنت سے شناسائی رکھتے ہیں۔ہم نے انہیں مرحبا! اھلا وسھلا! کہا اور ان سے پوچھا۔۔۔آنے والو یہ تو بتاؤ شہر مدینہ کیسا ہے؟ ۔۔۔شہر مدینہ کیسا ہے؟۔۔۔شہر مدینہ کیسا ہے؟۔۔

بات جب چھڑ گئی مدینے کی قصہ پہنچا تیری نگاہوں تک

سبحان اللہ! وہ باتیں کرتے گئے۔۔۔مدینہ والوں کی باتیں۔۔۔دربار مصطفیٰ کی باتیں۔۔۔زلف یار کی باتیں۔۔۔کاکل ورخسار کی باتیں۔فرمانے لگے۔''میں اس گلی سے آیا ہوں جہاں مانگتے تاجدار پھرتے ہیں۔۔میں اس شہر سے آیا ہوں'' جاروکشوں میں چہرے لکھے ہیں ملوک کے'' میں اس دربار سے آیا ہوں جہاں ''لب وا ہیں، آنکھیں بند ہیں، پھیلی ہیں جھولیاں''۔شیر زمان باتیں کر رہے تھے

کہ چائے آگئی۔ہم نے کہا مدینے والی چائے کیسے پیش کریں؟ جو وہاں آپ پلایا کرتے تھے۔ہم نے ''جہان رضا'' کا شمارہ دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ۔۔۔

مفتی محمد خان قادری آپہنچے وہ اکیلے ہی آئے۔گرمی کے تھپیڑوں سے پژمردہ تھے۔حالانکہ وہ کاروانِ اسلام کے سپہ سالار ہیں۔مفتی لاہور ہیں۔جامعہ اسلامیہ ملتان روڈ لاہور کے ناظم اعلیٰ ہیں،اور شادمان کی جامع مسجد رحمانیہ کے خطیب اعظم ہیں۔ہم نے ٹھنڈا پانی پیش کیا۔کہنے لگے سنا ہے اردو بازار میں عربی کتابوں کا کوئی تاجر آیا ہے۔میں ان سے کتابیں خریدنے آیا ہوں۔وہ ایران، بیروت، مدینہ اور مصر کی چھپی ہوئی کتابیں لے کر آتا ہے تو ہماری لائبریری کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ہم نے مشورہ دیا کہ صوفی شیر زمان صاحب کویت سے آئے ہیں۔چلو کویت چلیں۔وہاں بڑی اعلیٰ کتابیں ملتی ہیں۔سابقہ وزیر اوقاف حکومت کویت، فضیلت الشیخ حضرت قبلہ رفاعی صاحب آپ کے واقف ہیں۔اپنے دوست ہیں۔ان کے محل میں رہیں گے۔اور رنگ رنگ کی کتابیں خریدیں گے۔فرمانے لگے ویزہ، ٹکٹ، جہاز آنا جانا کیسے ہوگا؟ ہم نے حیرت سے ان کے نورانی چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔آپ ''مرجال الغیب'' میں سے نہیں ہیں؟

لاہور شہر کے ڈسٹرکٹ اٹارنی ملک محمد اشرف صاحب آگئے ہیں۔بڑے نفیس آدمی ہیں۔پنجاب گورنمنٹ کے اعلیٰ آفیسر ہیں مگر صوفی منش ہیں۔عاشق رسول ہیں۔دربار عالیہ شرقپور شریف سے عقیدت ہے۔''مرکزی مجلس رضا'' کی خوبصورت کتاب ''تحفہ درود شریف'' چھپوا کر تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔فرمانے لگے یہ لو دس ہزار روپیہ اور کتاب چھپوا دو۔میں اہل محبت میں تقسیم کروں گا۔لطف آجائے گا۔لوگ خوش

ہوں گے۔ میرا دل باغ باغ ہو جائے گا۔ یہ لوگ بھی کتنے روشن ضمیر ہوتے ہیں جو ''تحفہ درود شریف'' چھپوا کر اپنے احباب میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔

مفتی ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی حضرت مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند اور آپ کے علمی جانشین ہیں۔ جامعہ نعیمیہ کے مہتمم ہیں۔ مسجد چوک دالگراں کے خطیب ہیں اور علمائے اہلسنت میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ بڑے مستعد اور محنتی عالم دین ہیں وہ جب آتے ہیں مفتیانہ شان وشوکت سے نہیں آتے۔ ایک چھوٹا سا سکوٹر پکڑا اور جہاں چاہا چلے گئے۔

انجن لگا ہوا ہے میرے سائیکل کے ساتھ

پھٹ! پھٹ! پٹھاہ! پھٹاہ! کیے جارہا ہوں میں

فرمانے لگے آج رات داتا گنج بخش کے دربار سے ایک ''مشعل بردار جلوس'' نکلنا ہے۔ جس میں علماء اہلسنت اور طلبہ مدارس دینیہ شرکت کریں گے اور آزادی وطن پر اظہار مسرت کریں گے۔ شام ڈھلی تو ہزاروں مشعل بردار نوجوانوں نے ٹریفک بند کروادی۔ نعرہ ہائے تکبیر! اور نعرہ ہائے رسالت! گونجنے لگے۔ علمائے کرام جگہ بہ جگہ آزادی وطن، تشکیل پاکستان اور تحریک پاکستان پر تقریریں کرتے جاتے تھے۔ مفتی محمد سرفراز نعیمی صاحب کا بازو پکڑا ہم بھی اس مشعل بردار جلوس میں شامل ہو گئے۔ جلوس ناصر باغ پہنچا...... ''نگاہت گرفت آستینم کہ...... ''قم'' ڈاکٹر سرفراز صاحب کو اپنے بڑھاپے کا واسطہ دیا۔ فرمانے لگے۔ ''فرض کفایہ'' ادا ہو گیا۔ اب آپ جہان رضا کے دفتر میں چلے جائیں۔ ہم واپسی پر آپ سے چائے پئیں گے۔ ہمارا ڈر آپ کے دروازے پر کھڑا ہے۔

حضرت مولانا قاری مطیع الرحمٰن سعیدی ان دنوں اسلام آباد میں رہتے ہیں ایک عرصہ کے بعد ''یاران محفل جہان رضا'' میں آپہنچے۔ فرمانے لگے۔ ''جہان رضا'' پڑھتا ہوں تو اپنے آپ کو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں موجود پاتا ہوں۔ اس بار آپ نے اداریہ نہیں لکھا۔ میلاد الرسول کی نسبت سے ''آفتاب قدس نکلا نور برساتا ہوا'' لکھا۔ اس آفتاب قدس کی کرنوں کو خوبصورت شعری پھولوں سے سجا کر شائع کر دیا۔ دل خوش ہو گیا۔ یہ جو آپ ''کس نفاست کے یہ نامے میرے نام آتے ہیں'' چھاپتے ہیں میں انہیں بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ یہ گلہائے رنگارنگ رونق چمن بن کر آتے ہیں۔ اس بار آپ نے علمائے کرام کی یادوں کو اپنے لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ میرا ایک دوست آپ کی یہ یادیں پڑھ کر لوٹ پوٹ ہوتا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ قاری صاحب میں ''جامعہ نظامیہ لاہور'' کے اس جلسے میں موجود تھا جس میں مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ نے میرا تجلی تیری تجلی پر گفتگو کی تھی۔ آپ نے ''اعلیٰ حضرت کا سفر جبل پور'' بھی مولانا محمد ظفر الدین رضوی رحمتہ اللہ علیہ کی مشاہداتی قلم سے شائع کر دیا ہے۔ بڑا لطف آیا۔ سید عارف محمود مجہور نے عراق کے صدر سید صدام حسین کو صلاح الدین ایوبی ثانی بنا کر مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔

ہم نے کہا سعیدی صاحب آپ نے کتنے لطیف انداز میں ''جہان رضا'' کے تازہ شمارہ پر اپنے تاثرات دیے ہیں اب آم کے جوس کا ایک گلاس تو نوش جاں فرمائیں فرمانے لگے اب مجھے علامہ کوکب نورانی کی مرتبہ سی ڈائریکٹری دیں۔ ''فتاوی رضویہ'' کا ایک سیٹ دیں ''حالات مشائخ نقشبندیہ مجددیہ'' دیں۔ ''جواہر نقشبندیہ'' عنایت کریں۔ ''انوار رضا کا تاجدار بریلی نمبر'' دیں۔ ''الاشرفیہ'' مبارک پور کا ''سیدین نمبر''

دیں۔ جامِ نور دہلی کا ''رئیس القلم نمبر'' دیں۔ اللہ اللہ اور خیر صلا۔

ہم ابھی آکر ایک گھنٹہ بیٹھے ہی تھے۔ بعض کاغذات دیکھ رہے تھے کہ ایک خوبصورت کار جھل مل جھل مل کرتی ہمارے دروازے پر آکر رکی۔ دروازہ کھولا تو بیگم نایاب شاہ ناز صاحبہ تشریف لے آئیں۔ بیگم نایاب ہمارے ایک جگری دوست کرنل صفدر رحمان صاحب کی بیوی ہیں۔ کرنل صفدر رحمان لاء کالج میں ہمارے ہم سبق ہی نہ تھے بلکہ ہم نشست بھی تھے۔ بڑے خاندانی آدمی اور خندہ پیشانی کے مالک اردو بولتے تو کوثر وتسنیم کی موجوں سے دھلی ہوئی زبان استعمال کرتے۔ ان کی شادی ہوئی تو ہم نے ایک مرصع سہرا لکھا۔ ترنم سے پڑھا اور شادی کی محفل کو گل وگلزار بنا دیا۔ ہمارا ان کے گھر دیر تک آنا جانا رہا۔ حافظہ بیگم نایاب بڑی سلیقہ شعار خاتون ہیں ہم نے انہیں کنز الایمان سبقاً سبقاً پڑھایا تھا۔ کہنے لگیں۔ بی بی گل نازی کی کل شادی ہے۔ ''کنز الایمان'' کی ایک خوبصورت جلد لینے آئی ہوں۔ ہم نے گلہ کیا کہ ہمیں شادی کی اطلاع تک نہ کی۔ کہنے لگیں کہ اگر آپ کو اطلاع ہوتی تو آج ''کنز الایمان'' کی یہ جلد میری بیٹی کی شادی پر آپ لے کر آتے۔ مگر بھول ہوگئی۔ آپ یاد نہ آئے۔ دعوت نہ دی۔ ''او منڈیا ایہہ لے ہزار روپیہ''! پھر یوں گویا ہوئیں آپ کو یاد ہے کہ آپ جوانی میں اپنے احباب کے بیٹے بیٹیوں کی شادیوں پر بن بلائے چلے جاتے تھے۔ ہم نے کہا ہاں۔۔۔۔ در ایام جوانی چناں کہ افتد دانی'' ہم بن بلائے چلے جاتے تھے مگر وہ لوگ بھی کمال کے لوگ تھے۔ ہمارا ایسا والہانہ استقبال کرتے اور شادی کے موقع پر ہمارے آنے سے اتنے خوش ہوتے کہ ہمیں محسوس نہ ہوتا کہ بن بلائے ہیں یا طفیلی۔ بیگم کرنل صفدر رحمان کہنے لگیں مگر آپ بھی ان دنوں اتنی میٹھی میٹھی باتیں کرتے تھے کہ محفل پر چھا جایا کرتے تھے لوگوں کو گمان ہوتا

کہ آپ لڑکی یا لڑکے کے ''چچا'' ہیں۔ ہم نے سر جھکا کر کہا ہاں، اب تو ہمیں میٹھی باتیں کرنا نہیں آتیں۔ جانے سے پہلے پوچھنے لگیں۔ سنا ہے کہ آپ ''حیات اعلیٰ حضرت'' چھپوا رہے ہیں۔ ہم نے لبوں پر دو انگلیاں رکھ کر کہا کہ ''چپ'' پھر پوچھا کہ آپ کو کس نے بتایا! کہنے لگیں کہ حیدر آباد دکن سے میرے چچا نے فون پر بتایا تھا کہ آپ ''حیات اعلیٰ حضرت'' چھپوا رہے ہیں۔ چھپ گئی تو مجھے ایک سیٹ مفت بھیج دینا۔

ہم ڈاک دیکھنے میں مصروف تھے کہ عزیزم محمد معروف صاحب آپہنچے فرمانے لگے۔ باہر میاں صاحب گاڑی میں ہیں۔ ہم اٹھے۔ اور دوڑ کر گاڑی کے دروازے پر جا پہنچے۔ گاڑی میں صاحبزادہ میاں جمیل احمد صاحب، سجادہ نشین درگاہ شیر ربانی شرقپور شریف، تشریف فرما تھے۔ دست بوسی کی۔ میاں صاحب جب سے بیمار ہوئے ہیں بہت کم باہر نکلتے ہیں اور بہت کم چلتے پھرتے ہیں۔ ہم پر خصوصی کرم فرماتے ہیں۔ بیماری اور کمزوری کے باوجود کبھی چلے آتے ہیں۔ فرمانے لگے میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ پر نادر و نایاب تحریریں جمع کر رہا ہوں۔ فلاں فلاں کتاب نہیں مل رہی۔ اسے تلاش کریں اور فوراً حاضر کریں۔

میاں جمیل احمد صاحب شرقپوری پیر طریقت ہیں۔ سجادہ نشین ہیں اور مریدین کے وسیع حلقے کے باوجود بڑا علمی اور روحانی کام کرتے رہتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کے نظریات کو پھیلانے میں انہوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر رکھی ہے۔ بس چند لمحے باتیں کیں اور کان میں کچھ رازدارانہ ارشادات فرمائے اور یوں نکل گئے جیسے ''بادنسیم یار بھی کیا گل کتر گئی''۔

(''جہانِ رضا'' ماہ اگست ۲۰۰۳ء)

جہانِ رضا کے دفتر میں مہمانوں کی آمد

لاہور میں ان دنوں بڑی رونقیں رہیں۔ حضور داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا سالانہ عرس، امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ' کا سالانہ "یوم مجدد" اور اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہلسنت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کے عرس کی سالانہ "تقریبات" سے سارا شہر جگمگا اٹھا۔ "جہانِ رضا" کے دفتر میں معزز مہمانوں کا تانتا بندھا رہا۔ قطار در قطار، کارواں در کارواں، جوق در جوق مہمانانِ گرامی آتے رہے اور ہر مہمان رنگا رنگ تحفے ساتھ لایا۔ اتنے تحفے، اتنی سوغاتیں، اتنی محبتیں اور اتنی شیرینیاں آئیں کہ "جہانِ رضا" کا دفتر بھر گیا۔ اللہ تعالیٰ ان مہمانانِ گرامی کو خوش رکھے۔ جو آیا، پھولوں، گلدستوں، گلابوں اور خوشبوؤں کی بہاریں لے کر آیا۔ ہم ہر مہمان کو "خوش آمدید" کہتے کہتے تھک گئے ہر ایک کو مرحبا کہتے کہتے خوش ہوتے رہے اور آنکھیں فرش راہ کرتے رہے۔ آج ہم ان معزز مہمانوں سے آپ کی ملاقات اس لیے کرا رہے ہیں کہ اگر چہ آپ کو مہمان بن کر ہمارے پاس آنے کی فرصت نہیں ملی۔ تاہم ان مہمانانِ گرامی کی ایک جھلک دیکھ تو لیں۔ اگر آپ بھی آجاتے ہمیں خوشی ہوتی پھر آپ بھی ہمارے لیے نفیس تحفے لے کر آتے اور ہم کہتے:

آمد سنی کسی کی تو واللہ رے اشتیاق
آنکھیں بچھائیں ہم نے جہاں تک نظر گئی

کراچی سے صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری آئے اور "معارف رضا" کا نفیس تحفہ ساتھ لائے، فقیہ عصر علامہ نور احمد شاہتاز آئے تو "فقہ اسلامی" ساتھ لائے

حضرت علامہ محمد شہزاد قادری آئے تو "تحفظ" کا تحفہ لائے، حضرت علامہ شاہ تراب الحق قادری آئے تو "مصلح الدین" ساتھ لائے، ڈاکٹر مظاہر اشرف "آستانہ" لے کر آئے، عزیز از جاں نعت خوان، سید صبیح الدین صبیح رحمانی آئے تو اپنا خوبصورت گلدستہ "نعت رنگ" اٹھا لائے، صاحبزادہ محمد محبت خان کوہاٹی آئے تو "کاروانِ قمر" لائے، صاحبزادہ زکریا خراماں خراماں آئے تو "نعت نیوز" کا خوبصورت تحفہ لے کر آئے، مولانا محمد نسیم صدیقی صاحب تو کراچی سے ٹوکرا بھر کر تحائف لے کر پہنچے، محترمہ سعدیہ "ہمدرد صحت" لے کر آگئیں۔

ہندوستان سے سمجھوتہ ایکسپریس کیا آئی "بادِ بہاری ٹرین" آگئی علامہ خوشتر نورانی دہلی سے "جام نور" کے ایک سو گلدستے لے کر آپہنچے۔ علامہ یٰسین اختر مصباحی دہلی سے "کنز الایمان" کے پچاس پھول لے کر آئے، "مبارک پور" سے حضرت مولانا مبارک حسین مصباحی "الاشرفیہ" کے پچاس سے زیادہ پھول لے کر آئے اور ممبئی سے عزیز گرامی محمد زبیر خاں قادری "افکار رضا" کے پھولوں کا ایک باغیچہ اٹھا لائے اور ہم انہیں احباب میں بانٹتے رہے۔ پشاور سے "آوازِ حق" اور "الحسن" کے تحفے آئے۔ پھر حضرت ابو داؤد مولانا محمد صادق رضوی صاحب اور عبد الحفیظ نیازی صاحب گوجرانوالہ سے "رضائے مصطفیٰ" لے کر آگئے۔ حضرت مولانا محمد سعید مجددی رحمۃ اللہ علیہ نے گوجرانوالہ سے "دعوت تنظیم الاسلام" کا خوبصورت تحفہ اپنے جانشین صاحبزادہ محمد رفیق مجددی کے ہاتھ بھیج دیا، نارووال سے "تاجدار یمن" آگیا۔ شکر گڑھ سے محمد افتخار ممنون "الحقیقۃ" لے کر آگئے، گجرات سے "اہلسنت، آواز اہلسنت" کھاریاں سے "عرفان القرآن" دینہ سے "احکام القرآن" آگئے، بھیرہ سے صاحبزادہ امین الحسنات "ضیائے حرم" اور

علامہ ابرار احمد بگوی ''شمس الاسلام''، بہاولپور سے علامہ فیض احمد اویسی ''فیضِ عالم'' اور محمدی شریف سے ''الجامعہ'' آ گیا اور صاحبزادہ حامد سعید کاظمی ''السعید'' لے آئے، بصیر پور سے صاحبزادہ محمد محب اللہ نوری اپنا گل فشاں ''نور الحبیب'' اٹھا کر تشریف لے آئے۔ دور دراز سے یہ تحفے پہنچے تو اہل لاہور نے بھی اپنی نوازشوں کی بارش کر دی۔ مفتی ڈاکٹر سرفراز نعیمی ''عرفات''، مولانا ضیاء الحق صاحب ''فکر لاثانی''، علامہ سبزواری ''سبیل الرشاد''، محترم محبوب الرسول قادری ''سوئے حجاز'' اور مولانا بشیر احمد نقشبندی ''انوار لاثانی اور عرفان القرآن''، محمد ابرار مغل ''کاروانِ نعت''، محترم محمد نعیم طاہر ''کنز الایمان''، حافظ وسیم احمد قادری ''امیر اہلسنت''، میاں جمیل احمد شرقپوری ''نور اسلام''، مفتی غلام سرور قادری ''البرز'' لے کر آ گئے، علامہ محمد جاوید غامدی ''الاشراق'' لے آئے اور حافظ احمد شاکر ''الاعتصام'' لے کر آ گئے، پھر مولانا محمد اجمل قادری ''خدام الدین'' لے کر آ پہنچے، مولانا عبدالرحمٰن مکی ''محدث'' ادارۂ فرہنگ ایران اسلام آباد سے فارسی کا ''دانش'' آ گیا پھر ہمارے مہربان صاحبزادہ سید طاہر رضا بخاری ڈائریکٹر امور مذہبیہ محکمہ اوقاف پنجاب، اپنا خوبصورت مجلّہ ''معارف اولیاء'' کشف المحجوب کے دیباچوں اور مقدموں کا باغیچہ اٹھا لائے۔ حضرت مولانا محمد منیر یوسفی آئے تو ''سیدھا راستہ'' ساتھ لائے۔ ہم ان تحائف کو سجاتے گئے، دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے گئے اور ورق ورق پڑھا دیتے گئے۔ مگر تحفہ لانے والے تمام حضرات چائے کی پیالی پیے بغیر غائب ہو گئے۔

خود سوئے ما نہ دید وادا را بہانہ ساخت

(''جہانِ رضا'' ماہ مارچ ۲۰۰۷ء)

چند لمحات ایڈیٹر ''جہان رضا'' کی مجالس میں گزارے

آمد سنی کسی کی تو واللہ رے اشتیاق
آنکھیں بچھائیں ہم نے جہاں تک نظر گئی

ماہنامہ ''جہان رضا'' بھی اہل علم وشوق سے ملاقات کا ذریعہ ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں رہنے والے قارئین ''جہان رضا'' کے صفحات پر نظر ڈالتے ہیں تو بڑے اشتیاق سے ملاقات کرتے ہیں۔ اب یہ ملاقاتیں ضروری نہیں کہ خود انہیں چل کر آنا پڑے۔ موبائل بولتے ہیں، فون کانوں میں رس گھولتے جاتے ہیں۔ ڈاک سے خطوط آ کر ''نصف ملاقاتی'' کا شرف بخشتے ہیں۔ پھر بعض حضرات تو اپنی ڈاک میں محبت بھرے ''نفاست نامے'' ارسال کرتے رہتے ہیں۔ اور ہم پکار اٹھتے ہیں۔

خط میں لکھے ہوئے الفت کے پیام آتے ہیں
کس نفاست کے یہ نامے میرے نام آتے ہیں

گزشتہ ماہ کئی احباب خود چل کر ''جہانِ رضا'' کی محفل میں آ پہنچے۔ آج ہم ان سے آپ کی ملاقات کرانا چاہتے ہیں۔ اس طرح آپ کی شرکت محفل میں بھی ہو گی اور ملاقات بھی ہو جائے گی۔

ہم اپنے دوست پیر خادم حسین شرقپوری بغدادی کے خسر صوفی محمد اسماعیل مرحوم کے ایصال ثواب کی محفل میں بیٹھے تھے کہ بریلی شریف کے معروف کالر مولانا شہاب الدین رضوی نے ہمارے موبائل کو چھیڑا۔ ہم محفل سے باہر نکلے تو پیغام آیا کہ ''ہم شیخ الحدیث کے عرس پر فیصل آباد آئے ہوئے ہیں۔ صبح ہندوستان

روانہ ہونا ہے آج رات آپ کے پاس گزرے گی"۔ یہ ان کی شفقت اور محبت تھی ہم اٹھے، لاہور آئے، ان کے لیے چشم براہ ہوئے تو وہ تن تنہا ایک گل رعنا نوجوان کی شکل میں ہماری محفل میں آپہنچے ہم نے سمجھا کہ شہاب الدین رضوی کتابیں لکھتے ہیں، رسالے چھاپتے ہیں کوئی بڑے بزرگ ہوں گے۔ کرم فرماتے ہوئے مصافحہ کیا، پھر معانقہ فرمایا، پھر مصادرہ کیا، پھر دست بوسی کا شرف عطا فرمایا۔ فرمانے لگے لاہور میں صرف آپ سے ہی ملنے آیا ہوں۔ وہ جس خلوص واشتیاق سے گفتگو کرتے گئے ہمارا دل گل وگلزار بنتا گیا، "خیابان بریلی کا گل سرسبد" ہماری محفل کی زینت بنا ہوا تھا۔ علامہ محبوب الرسول قادری ایڈیٹر "سوئے حجاز" پہلے ہی آنکھیں بچھائے بیٹھے تھے، ملے اور خوش ہوئے۔ مفتی اعظم ہند کے خلیفہ مجاز، ہمارے مخلص دوست علامہ گلزار حسین قادری نے سنا کہ شہاب الدین رضوی بریلی سے آئے ہیں۔ وہ اپنی گاڑی لے کر آگئے۔ ملاقات کیا ہوئی ہمارے مہمان گرامی کو "اغوا" کر کے مولانا عبدالحکیم شرف کے گھر لے گئے۔ مفتی محمد خاں قادری کے جامعہ اسلامیہ میں لے گئے۔ اس طرح وہ ساری رات لاہور کے علماء سے ملاقات کراتے رہے۔ علی الصبح ہندوستان کو روانہ کر کے میرے پاس آبیٹھے اور کہنے لگے لو جناب "ہم آپ کے مہمان عزیز کو ہندوستان پہنچا کر آئے ہیں۔"

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!

برہان شریف ضلع اٹک سے ہمارے مخلص دوست سید صابر حسین شاہ بخاری آپہنچے۔ آپ "ادارہ فروغ افکار رضا" کے بانی ہیں اور رضویات کی خوشبوئیں بکھیرتے رہتے ہیں۔ فرمانے لگے میں تو محمد زبیر قادری ایڈیٹر "افکار رضا" ممبئی کو

ملنے آیا ہوں، تسلی دی۔ بیٹھیے، وہ ممبئی سے چل چکے ہیں آتے ہی ہوں گے۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے ہمارے ایک اور رفیق قلم خلیل احمد رانا، آف جہانیاں تھکے ہارے آپہنچے۔ اس خستگی کی وجہ پوچھی تو فرمانے لگے "میں زبیر قادری کو لینے ریلوے اسٹیشن گیا تھا، وہ کہیں نہیں ملے" ہم نے تسلی دی وہ دھان پان نوجوان ہیں، مسافروں کے ہجوم میں گم ہو گئے ہونگے آجائیں گے۔ آپ پانی پیئیں چائے پیئیں اور ہم سے پرانی باتیں کریں۔

آؤ زلف یار کی باتیں کریں
کاکل و رخسار کی باتیں کریں

ابھی باتیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ زبیر قادری صاحب اپنے ایک دوست کے ساتھ ہماری مجلس میں آپہنچے۔ سب دوست خوش ہوئے حال احوال پوچھے محفل جمی اور ارد گرد کے احباب عندلیبان شوق بن کر آنے لگے۔ زبیر قادری ہماری محفل کی شمع فروزاں تھے اور ان کے مداح پروانہ وار اپنی محبتیں نچھاور کر رہے تھے۔ ابھی چائے کا دور ختم نہیں ہوا تھا کہ یار لوگوں نے زبیر قادری کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور لاہور کے گلی، کوچہ وبازار کو نکل پڑے۔ ہم چلاتے رہے۔ ممبئی سے چل کر آئے ہیں، ساری رات جاگتے رہے ہیں، تھکے ماندے ہیں، مگر یہ سرمستان بادہ محبت یہ کہتے ہوئے انہیں اڑا لے گئے کہ ہندوستان کے لوگ تھکتے نہیں اور یوں زبیر قادری صاحب کو بھی "اغواء" کر لیا گیا۔ سارا دن گزر گیا ساری رات گزر گئی۔ ہم ان کی آرام گاہ پر موبائل کرتے رہے مگر وہ رات کے دو بجے تک لاہوری احباب کی محفل میں بیٹھے رہے، حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری دیتے رہے۔ اور ہم دیدہ فرش راہ کیے بیٹھے ان کا انتظار کرتے رہے۔

شب ہجراں کے جاگنے والو　　　کیا کروگے اگر سحر نہ ہوئی

زبیر قادری صاحب ہمارے مخلص دوست ہیں۔ وہ سارے ہندوستان میں ''جہانِ رضا'' کے سفیر ہیں ہر ماہ جہانِ رضا ہندوستان کے علمی حلقوں میں پہنچاتے ہیں۔ دو دن کے بعد وہ ''دعوت اسلامی'' کے اجتماع پر صحرائے مدینہ ملتان چلے گئے اور وہاں سے کراچی، پھر دہلی، پھر ممبئی!۔

آج سید عبداللہ قادری واہ کینٹ سے آئے ہیں۔ بڑے ادیب اور محقق نوجوان ہیں۔ کئی سال حکیم محمد موسیٰ امرتسری (بانی مرکزی مجلس رضا) کے مطب میں رہے۔ حکیم صاحب کے قریبی خدمت گزاروں میں سے ہیں۔ مدت کے بعد ہماری محفل میں آئے۔ دو تین دن لاہور رہے اپنے احباب سے مل کر ہمارے پاس آجاتے، کرم فرماتے اور اپنی یادوں کو تازہ کرتے۔ آپ نے مولانا محمد بخش مسلم بی اے پر ایک خوبصورت کتاب لکھی ہے۔ جو بہت مقبول ہے۔

صوفی شیر زماں ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ کئی سال دیار حبیب مدینہ منورہ میں رہے۔ قطب مدینہ حضرت مولانا ضیاء الدین قادری کی خدمت میں حاضر رہتے۔ آپ کی رحلت کے بعد مولانا فضل الرحمان مدنی سے بیعت ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد کویت کے وزیر اوقاف فضیلت الشیخ یوسف الرفاعی کے ایماء پر کویت چلے گئے۔ آج وہ بھی ہماری مجلس میں آپہنچے، ''جہانِ رضا'' کے مضامین پر اپنے تاثرات دیتے رہے اس طرح مدینہ پاک کی یادوں سے ہمارے دل ودماغ کو معنبر ومعطر کر کے چلے گئے۔

علامہ کوکب نورانی ہمارے خاص احباب میں سے ہیں۔ صاحب قلم وبیان ہیں۔ سخن شناس بھی ہیں اور رواں قلم کے مالک بھی۔ ''جہانِ رضا'' کی تحریروں کو

پسند کرتے ہیں اور ہماری حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ انہیں جب کوئی سخن فہم ملتا ہے تو ''جہانِ رضا'' کا تعارف ضرور کراتے ہیں۔ فرمانے لگے کراچی میں ایک بزرگ حضرت الشاہ شوکت حسن نوری صاحب علم بھی ہیں اور سخن شناس بھی ہیں انہیں ''جہانِ رضا'' بھیجا کرو۔ وہ خانوادہ اعلیٰ حضرت کے ایک علمی فرد ہیں۔ ہم کوکب نورانی کا اشارہ پا کر حضرت میاں نوری کو ''جہانِ رضا'' بھیجتے ہیں۔ ہماری محفل جمی ہوئی تھی کہ حضرت شوکت نوری آپہنچے اس شان وشوکت سے آئے کہ محفل ''نور علیٰ نور'' بن گئی احباب محفل اٹھے، ادب بجالائے، دست بوسی ہوئی تو حضرت نے گفتگو کا آغاز کیا، بات کرتے تو زبان سے موتی جھڑتے۔ اعلیٰ حضرت کے شہر بریلی کا ذکر چھیڑا تو گلی گلی، کوچہ کوچہ، مسجد مسجد، مدرسہ مدرسہ دکھاتے گئے۔ بریلی کے اذکار سے اہل محفل جھوم اٹھے۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم ساٹھ سال پیچھے بریلی شریف کی گلیوں میں گھوم رہے ہیں۔ حضرت کے بیان میں وہ حلاوت تھی کہ مجلس میں بیٹھا ہر شخص ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا۔ اٹھنے لگے تو کسی نے اٹھنے نہ دیا جانے لگے تو کسی نے جانے نہ دیا، فرمایا وقت کم ہے سفر زیادہ ہے مگر اہل مجلس نے جس انداز سے میری باتیں سنیں میرا دل اٹھنے کو نہ چاہتا۔

ہائے وہ پھول سے رخسار وہ قد بوٹا
وہ جہاں بیٹھتے ہیں باغ لگا دیتے ہیں

دل خوش ہو گیا بادل نخواستہ اٹھے اور بادل نخواستہ ہم نے انہیں الوداع کہا:

بہ سلامت روی و باز آئی

علی الصباح ہمارے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، امریکہ سے ہمارے ایک عزیز

دوست سید منور علی شاہ بخاری بول رہے تھے وہ امریکہ کی ایک اسٹیٹ میں رہتے ہیں امریکہ میں رہنے والوں میں اعلیٰ حضرت کے عاشق ہیں۔ انہوں نے امریکہ میں ''فیضان رضا'' کے نام سے ایک لائبریری قائم کی ہے۔ جس میں صرف اعلیٰ حضرت کی اپنی تصانیف کا ذخیرہ ایک سو ستر کتابوں پر مشتمل ہے پھر پانچ سو ایسی کتابیں رکھی ہوئی ہیں جو اعلیٰ حضرت پر مختلف سکالرز نے لکھی ہیں۔ سید منور علی شاہ بخاری ایک کتاب دوست نوجوان ہیں جو امریکی مسلمانوں کے لیے ایک مثال ہے۔ جب وہ فون پر بات کرتے ہیں تو دل کے غنچے کھلتے جاتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا میں اپنی تمام کتابوں کی فہرست بھیج رہا ہوں جو ''جہانِ رضا'' میں چھپے اور لوگوں کو کتاب پڑھنے، کتاب رکھنے، کتاب کی حفاظت کرنے کا شوق پیدا ہو۔ آج سنیوں کے ہاں کتابی ذوق کم ہے انہیں شکایت ہے کہ سنی علماء بھی کتاب کا مطالعہ نہیں کرتے اور سنی سنائی باتیں رنگین آواز میں سناتے رہتے ہیں۔ سید منوّر علی شاہ بخاری نے بتایا کہ جب انہیں ''جہانِ رضا'' ملتا ہے اسے پڑھے بغیر کسی دوسری طرف متوجہ نہیں ہوتے پڑھنے کے بعد فون کرتے ہیں۔ تاثرات ریکارڈ کراتے ہیں ان کی باتیں سن کر دل کے غنچے کھلتے جاتے ہیں۔ جب وہ رواں دواں بولتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے ذکر رضا کے دریا بہا رہے ہیں۔ امریکہ میں ہمارے احباب جناب عثمان نوری، محمد حسن اور ڈاکٹر ظفر اقبال نوری سے رابطہ رکھتے ہیں۔

آج ہفتہ ہے، محمد عالم مختار حق صاحب کا معمول ہے کہ ہر ہفتہ کی صبح اپنے تمام احباب سے ملنے نکلتے ہیں۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم کے مطب پر جاتے ہیں۔ ان کے جانشینوں صاحبزادہ زبیر احمد ضیائی اور صاحبزادہ ریاض ہمایوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ لاہور کے بعض اشاعتی اداروں کے ناظمین سے ملاقات کرتے ہیں پھر

وہ ہماری محفل میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ شریک ہی نہیں ہوتے اکثر ''میر محفل'' ہوتے ہیں۔ وہ درویش منش سکالر ہیں مگر ہفتہ وار یہ سفر ایک بڑی پیجارو کار پر کرتے ہیں۔ جب ہماری محفل میں آئے تو اہل علم وقلم کا ایک مجمع موجود تھا۔ علمی گفتگو ہو رہی تھی کہ یہ کس کا شعر ہے جو خواجہ معین الدین اجمیری سے منسوب ہے۔؟

شاہ ہست حسین بادشاہ ہست حسین
دیں ہست حسین دیں پناہ ہست حسین

اہل مجلس میں بیٹھے حضرات نے بڑی نفیس گفتگو کی، محمد عالم مختار حق نے شعر کی نسبت کا خواجہ اجمیری سے انکار تو نہ کیا مگر ایسے کئی اشعار سنائے جو زبان زد اہل علم ہیں مگر ان کے کہنے والوں کا بہت کم علم ہے۔ ایسی محفل میں ایک صاحب نے ''جہانِ رضا'' میں چھپنے والے اشاریہ پر موصوف کی محنت کو ہدیہء تحسین پیش کیا۔ افکار رضا کے ایڈیٹر زبیر قادری صاحب ممبئی سے آئے تھے وہاں سے قرآن پاک کی ایک خوبصورت جلد لائے تھے۔ جو الحاج عبدالستار صاحب نے ہماری علمی خدمات کے صلہ میں ہدیہ بھیجا تھا۔ قرآن پاک کے ہر ایک ورق پر پورا سپارہ سامنے لایا گیا ہے۔ خطاطی اور نفیس طباعت کا بے مثال مرقع ہے۔ محمد عالم مختار حق اس بے مثال تحفہ کو دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور چند روز کے لیے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ ہمارے یہ دوست قرآن پاک کے سلسلے میں بہترین کام کرنے پر عالمی سطح سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

ایک دن ہم تنہا بیٹھے تھے۔ ہمارے ایک دوست مدینہ منورہ میں رہتے ہیں ہم جب بارگاہ رسول میں حاضری دیتے ہیں تو وہ خاطر و مدارات کرتے ہیں بعض مواقع پر راہنمائی فرماتے ہیں۔ وہ حضرت سید علی ہجویری داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار

کی زیارت کے بعد ہمارے پاس آئے اور بیٹھ گئے۔ مدینہ پاک کی باتیں، کوچہ دلدار کی باتیں صبح وشام کی باتیں، زلف یار کی باتیں کرتے رہے، پھر کاکل و رخسار کی باتیں کرتے گئے اور ہمارے دل کو خوش کرتے رہے۔ فوراً گویا ہوئے فاروقی صاحب! آپ نے حضرت خضر کو نہیں دیکھا؟ ہم نے نفی میں سر ہلایا فرمانے لگے آپ نے ''رجال الغیب'' سے ملاقات نہیں کی؟ ہم پھر چپ رہے۔ پھر بولے آپ نے لاہور کے ''روحانی گورنرز'' سے ملاقات نہیں کی؟ جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم ان مقامات سے محروم ہیں تو فرمانے لگے اس بار مدینہ منورہ کی حاضری کے لیے آنا تو مجھے یہ باتیں یاد دلانا پھر دیکھنا۔ یہ کہہ کر چائے کی آدھی پیالی چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم نے باقی چائے کے گھونٹ بھرے تو یوں محسوس ہوا گنبد خضراء کی چھاؤں میں بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔

محفل جمی ہوئی ہے ڈاک آگئی کنز الایمان آگیا، جام نور آگیا، الاشرفیہ آگیا، تاجدار اہلسنت آگیا، افکار رضا آگیا، تجلیات رضا آگیا، کراچی سے ''معارف رضا'' آگیا، ''مجلہ فقہ اسلامی'' آگیا، علامہ کوکب نورانی کا ایک پیکٹ آگیا، یادگار رضا فیصل آباد سے، اصغر علی نظامی صاحب کا لفافہ آگیا، الحاج محمد سعید نوری کے ممبئی سے تحفے آگئے، ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی کے بریلی سے خط آگئے، ڈاک کیا آئی یوں لگا جیسے خط لکھنے والے تمام احباب ہمارے پاس آگئے ہوں، اس طرح ایک مواصلاتی مجلس سج گئی۔ ڈاک کھلتی گئی بہاریں پھیلتی گئیں، گلہائے رنگ رنگ رونق محفل بنتے گئے، ورق ورق صفحہ صفحہ آج ہماری انجمن میں حسن بن کر آتے گئے، کیا آپ اس محفل میں اپنی یادوں سے ہمیں سرفراز فرمائیں گے؟

(''جہانِ رضا'' ماہ اکتوبر ۲۰۰۵ء)

جب ہم درویش تھے

ہم سے درویشوں کی اے اہلِ جہاں قدر کرو — ہم سے درویشوں کا تاریخ میں نام آتا ہے

یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ ہم ان دنوں درویش تھے۔ قرآن پڑھنا، یاد کرنا، قاری بننا، فرش پر سونا، اینٹوں کا سرہانہ بنانا، دری کا بچھونا اور ٹاٹ کا فرش، سوکھی روٹی، کچی لسی، نہ کوئی دکھ نہ درد، نہ کوئی غم نہ فکر۔

ہمارے استادِ مکرم مولانا محمد نبی بخش المعروف بہ ''حلوائی'' تھے۔ مگر ہمیں پڑھانے والے چھوٹے استاد تھے جو ہمارے کان مروڑنا اپنا حق جانتے تھے۔ ہم بھی ایسے بے نیاز کہ مار کھا کر بھی برا نہ مناتے۔ بلکہ ان کے پاؤں دبانے کو ثواب جانتے۔

کتنے نازک ہیں تیرے ہاتھ کہ میر — مار کھا کے بھی بدمزہ نہ ہوئے

مولانا محمد نبی بخش حلوائی ایک عالم اجل تھے۔ ۱۵ جلدوں میں ''تفسیر نبوی'' لکھی تھی۔ پنجابی میں۔ پھر پنجابی شعروں میں۔ وہ ہم درویشوں کو کچھ نہ کہتے۔ ہم اودھم مچاتے، وہ پیار کرتے۔ ہم شور مچاتے تو وہ مسکرا دیتے۔ ہم نے پہلی بار سعدی کا ''کریما'' پڑھنا شروع کیا تو استاد ہمیں ''کریما بہ بخشائے برحالِ ما'' بار بار یاد کراتے۔ حضرت علامہ حلوائی سنتے تو

سوارِ جہاں گیر یک راں براق — کہ بگذشت از قصر نیلی رواق

خاص طرز اور اونچی آواز سے پڑھاتے۔ ''یک ران'' کا معنٰے سمجھاتے کہ اس براق پر پہلے کسی نے سواری نہیں کی تھی۔ ''قصرِ نیلی رواق'' کا معنٰے بتاتے نیلے آسمانوں کو پیچھے چھوڑ گئے تو حضور کے واقعہ معراج کا ذکر کرتے۔ جن لوگوں نے کریما پڑھا ہے وہ

ان شعروں کی مٹھاس کو محسوس کریں گے۔

ہم روکھی سوکھی کھا کر ٹھنڈا پانی پی لیتے۔ مگر ہمارے استاد ہمارے لیے نفیس کھانے تیار کراتے اور اپنے سامنے بٹھا کر کھلاتے۔ کوئی درویش کونے میں بیٹھے کھانا کھاتا تو اسے اپنے سامنے لاتے اور خوب کھلاتے۔ صبح کی نماز کے بعد ایک سفید چادر بچھتی۔ اس پر کھجور کی گٹھلیاں پھیلا دی جاتیں اور ہم سارے درویش مل کر درود شریف پڑھتے۔ طالب علم، استاد، مہمان، نمازی، زیر تربیت سالک اور خود حضرت درود شریف پڑھتے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ ہم جب تک درویش رہے درود شریف پڑھتے رہے۔ نہ حساب نہ شمار ''درود بے شمار ہا، ہزار ہا، ہزار ہا''۔

ایک دن مسجد کے دروازے کے سامنے دو برقع پوش خواتین کو کھڑے دیکھا ایک خاتون دوسری کو کہہ رہی تھی کہ اس مسجد کے درویشوں کے پاس ''جنت کی کنجیاں'' ہیں۔ ہم بڑے خوش ہوئے۔ اپنے استادِ مکرم سے پوچھا یہ عورتیں یہ باتیں کہہ رہی تھیں۔ فرمایا تم نے ''پند نامہ'' نہیں پڑھا۔ اس میں لکھا ہوا ہے۔

ع حبِ درویشاں کلیدِ جنت است

اُس دن سے ہم سارے درویش محسوس کرنے لگے کہ واقعی ہمارے پاس ''جنت کی کنجیاں'' ہیں۔ ہم کسی دنیا دار، مالدار اور امیر آدمی کو خاطر میں نہ لاتے۔ کیونکہ ہم جنت کے ''چابی بردار'' تھے۔

ہمارے استاد کے پاس ایک ایسا عمل تھا کہ اگر کوئی شخص گم ہو جائے تو اس عمل کی وجہ سے واپس گھر آ جاتا تھا۔ لاہور کے ایک امیر آدمی کی خوبصورت بیوی فلمی دنیا کے فنکاروں کے ہتھے چڑھ گئی۔ وہ اسے فلم ایکٹریس بنانے کا جھانسا دے کر بمبئی

لے گئے۔ خاوند نے بڑے جتن کیے مگر اس کی بیوی واپس آنے کا نام نہ لیتی تھی۔ وہ پریشان حال ہمارے استاد گرامی کے پاس آیا۔ بیوی کی واپسی کی التجا کی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آہ وزاری سے التماس کر رہا تھا کہ ''میری بیوی کو واپس بلایا جائے''۔ ہمارے استاد نے ہم درویشوں کو آواز دے کر بلایا اور کہا کہ اس بابو کی بیوی بھاگ گئی ہے۔ کون واپس لائے گا؟ ہم سب درویشوں نے مل کر کہا ''ہم لائیں گے''۔ استادِ مکرم اس بابو کو فرمانے لگے جاؤ کمہار کی دکان سے کورے برتن کی ٹھیکریاں لے آؤ۔ تمہاری بیوی گھر آ جائے گی۔ وہ ٹھیکریاں دے کر چلا گیا۔ ہمارے استاد نے ان ٹھیکریوں پر کچھ لکھا اور آگ کے شعلوں میں رکھ دیا۔

دس دن گزرے تھے تو وہی شخص ایک خوبصورت عورت کو ساتھ لے کر مسجد میں آیا۔ اس کے ساتھ چار نوکروں نے چار مٹھائی کے ٹوکرے اٹھائے ہوئے تھے۔ ہمارے استاد کے سامنے رکھ دیے۔ پاؤں کو چھوتے ہوئے کہنے لگا ''بابا جی میری بیوی آ گئی ہے''۔ ہم نے اس شخص کی آنکھوں سے غم کے آنسو بھی دیکھے تھے مگر آج خوشی کے آنسو بھی دیکھے۔ حضرت نے فرمایا: ''درویشو! مٹھائی کھاؤ۔ تمہاری دعا سے اس کی بیوی واپس آ گئی ہے''۔

ہم سارے درویش اتنے زوردار درویش تھے کہ اگر کوئی دولت مند، دنیا دار، پیسے والا ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتا یا ہمیں ڈانٹتا تو ہمارے استاد مولانا نبی بخش اسے برملا کہتے ''تم میرے درویشوں کو ڈانٹتے ہو آئندہ میری مسجد میں نہ آنا''۔ ہم لاہور کے بازاروں میں یوں پھرا کرتے تھے کہ جیسے ہم سارے لاہور کے مالک ہیں۔ سحری اٹھنا۔ تہجد پڑھنا۔ علی الصبح درود شریف کے حلقے میں بیٹھ کر درود شریف پڑھنا۔

سارا دن کتابیں پڑھنا اور عصر کے بعد ''ختمِ خواجگان'' پڑھنا ہمارا معمول تھا۔ کریما، نامِ حق، پندنامہ پڑھنے کے بعد ہم نے سعدی شیرازی کی گلستان اور بوستان پڑھنی شروع کر دی۔ اور ''ضَرَبَ یَضْرِبُ'' کی ضربیں لگانا شروع کیں۔ جن لوگوں نے درویشوں کی یہ ضربیں دیکھی ہیں وہ ان کے مقامات کی بلندی کو محسوس کر سکتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ یکی دروازے کے اندر ایک امیر آدمی رہتا تھا اسے ایک مقدمہ میں سزائے موت ہو گئی۔ اس کی اپیل ''پریوی کونسل لندن'' (ان دنوں سپریم کورٹ) میں گئی ہوئی تھی۔ اس سزا یافتہ امیر آدمی کی بیوی آہ و فغاں کرتی حضرت مولانا نبی بخش حلوائی کے پاس آئی، ''باباجی میرے خاوند کو بچالو! اس کی اپیل پریوی کونسل لگی ہوئی ہے'' ہمارے استادِ گرامی نے ہم سب درویشوں کو بلایا اکٹھا کیا اور کہا درویشو! اس بی بی کے خاوند کو سزائے موت سے کون بچائے گا؟ ہم نے مل کر نعرہ لگایا کہ ''ہم بچائیں گے''۔ حضرت مولانا نے اس بی بی کو فرمایا کہ ان درویشوں کو ہر روز گھر لے جایا کرو اور ایک لاکھ پچیس ہزار بار ''آیہء کریمہ'' پڑھاؤ۔ ہم ہر روز اس کے گھر جاتے اور ''آیہء کریمہ'' پڑھ کر آ جاتے۔ وہ بڑی امیر عورت تھی۔ دو دنوں بعد اس عورت نے درویشوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اگر کوئی درویش ایک دفعہ ''آیہء کریمہ'' پڑھ کر چار گٹھلیاں گرا دیتا تو اسے ڈانٹتی اور دوبارہ پڑھاتی اگر کوئی درویش اونگھتا تو اس کا کان پکڑ کر اس کو جگاتی۔ ہم سارے درویش اس کی سختی سے بڑے تنگ تھے۔ پڑھتے پڑھتے زبانیں تھک جاتیں۔ بیٹھے بیٹھے ہمارے گھٹنے درد کرنے لگتے۔ وہ بی بی درویشوں پر بڑی سختی کرتی۔ ایک ایک شمار پر نگاہ رکھتی۔ ہم نے استاد سے شکایت کی حضرت اس کا خاوند پھانسی لگنے لگا ہے مگر گھٹنے ہمارے درد کرنے لگے ہیں

حضرت مولانا نے اسے بلایا اور فرمانے لگے کہ اگر تو نے اپنے خاوند کو بری کرانا ہے تو ان درویشوں کو خوش رکھا کرو، یہ کسی کے باپ کے نوکر نہیں ہیں۔ یہ اللہ کے سپاہی ہیں ان کے ہاتھوں میں زندگی اور موت کے پروانے ہیں ان کو خوش رکھو۔

دوسرے دن ہم پڑھنے گئے تو وہ عورت ایک ایک بچے (درویش) کا منہ چوم رہی تھی۔ اس کے لیے حلوا تیار کروا کر کھلا رہی تھی۔ ہر ایک درویش کے لیے نیا کپڑا سلا سلا کر پہنا رہی تھی۔ ''میں صدقے جاواں''، ''میں واری جاواں!'' پیار کر رہی تھی۔ ایک لاکھ پچیس ہزار بار آیت کریمہ ختم ہوا تو ہمیں اس بی بی نے نئے سوٹ پہنائے۔ رنگا رنگ کھانے کھلائے۔ جیبوں میں کھڑکنے والے سکے ڈالے گئے۔ ہم خوش خوش اپنی مسجد میں آئے۔

تین دن بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ لندن سے تار آ گیا کہ ''وہ شخص بری ہو گیا ہے''۔

ان سارے واقعات میں ہمارے استادِ گرامی حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی کے عملیات کام کر رہے تھے۔ مگر وہ کریڈٹ ہم درویشوں کو دیتے تھے۔ اگرچہ ہم سارے درویش بس درویش ہی تھے مگر اس زمانے میں ایسے ''درویش نواز'' لوگ بھی تھے جن کا وجود آج کے دولت مند معاشرے میں دور دور تک نہیں ملتا۔

ہمیں یاد ہے کہ مصری شاہ لاہور میں ایک کشمیری خاندان رہتا تھا۔ جس کی خواتین ''قصیدہ بُردہ'' کی حافظ تھیں۔ جب مل کر قصیدہ پڑھتیں تو ان کے گھر کے در و دیوار جھوم اٹھتے۔ میں اس محفل میں اکثر حاضر ہوتا۔ نعت سناتا اور داد پاتا۔ ایک وقت آیا کہ میرا گلا بیٹھ گیا۔ گھر کی بڑی خاتون نے مجھے پوچھا کہ تمہارے گلے کا کیا علاج ہو گا۔ میں نے فوراً کہا حکیم صاحب نے کہا ہے کہ صبح کے وقت دیسی گھی کا گرم گرم حلوا کھاؤ تمہارا گلا ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن مجھے کہیں سے گرم حلوا نہیں ملتا۔ اب

اس بی بی کی قبر پر اللہ اپنی رحمتوں کے بادل برسائے۔ ہر صبح حلوا تیار کرتی مجھے بلاتی اور کھلاتی۔ ایک دن اس کے خاوند نے پوچھا کہ یہ کون لڑکا ہے جس کے لیے ہر روز حلوا تیار کیا جاتا ہے اور ہمیں پوچھا تک نہیں جاتا۔ مجھے یاد ہے اس بی بی نے کہا "تم کیا ہو یہ تو نعت خوانِ رسول ہے"۔ میں اس بی بی کو کن الفاظ سے یاد کروں جو نعت خوان رسول سے حسنِ سلوک کر کے اپنے خاوند کی بھی پروا نہیں کرتی تھی ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ ہم جہاں تھے وہاں درویشوں کی ایک جماعت تھی۔ ان میں سے ہر شخص آج کروڑ پتی ہے اپنی کوٹھیاں ہیں۔ اپنی کاریں ہیں۔ اپنے کاروبار ہیں۔ اپنی اولاد ہے اپنی سوسائٹی ہے۔

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر

ہمارے استاد، ممتاز عالم دین تھے۔ بلند پایہ شاعر تھے پنجابی شعروں میں انہوں نے ۱۵ جلدوں میں تفسیر لکھی تھی۔ اردو فارسی، عربی میں ان کا کلام چھپا۔ وہ سلسلہ نقشبندیہ، مجددیہ سے وابستہ تھے۔ مولانا غلام قادر بھیروی کے خاص شاگرد تھے۔ پیر عبد الغفار شاہ کاشمیری کے حلقہء درود کے تربیت یافتہ تھے۔ مناظرِ اسلام مولانا غلام دستگیر ہاشمی قصوری کے خلیفہ مجاز تھے۔ حضرت پیر سید جماعت علی شاہ لاثانی علی پوری کے خلیفہ ثانی تھے۔ ان کی مجالس میں کئی سالکانِ طریقت زیر تربیت رہتے تھے۔ ہم ان کے درویش تھے۔ بیمار ہوتے تو "پیر برہان" کے مزار سے تین کنکریاں لا کر گلے میں باندھ لیتے۔ تندرست ہوتے تو کنکریاں مزار پر رکھ آتے اور مزار کے ارد گرد منڈلانے والے کوؤں کو میٹھی روٹیوں کے ٹکڑوں کا صدقہ دیتے۔

دہلی دروازے کے باہر جہاں آج "مسجد میلاد" کھڑی ہے یہ ایک چھوٹی

سی مسجد تھی۔ اس کے امام افغانستان کے ایک پٹھان تھے۔ گھڑیاں مرمت کر کے روزی کماتے لوگ انہیں "مسیح الساعات" کہتے۔ ہم بیمار ہوتے تو وہ بادام کی تین گریوں پر "یاہارو یامارو" لکھ دیتے۔ ہم تندرست ہو جاتے۔ ہم نے یہ طریقہ بنا لیا کہ جو بھی بیمار ہوتا اس کو "یاہارو یامارو" پڑھ کر دم کر دیتے۔ وہ تندرست ہو جاتا۔ ہم محسوس کرتے تھے "یاہارو یامارو" کوئی جنات یا مؤکل ہیں جن کے نام سے بیماری بھاگ جاتی ہے۔ حضرت سے ایک دن پوچھا تو وہ فرمانے لگے یہ 'ہارو یامارو' جنات نہیں ہیں۔ یہ "یاہاروت ویاماروت" ہے۔ بعد میں ہم کئی سال ہاروت وماروت کے ناموں سے کام چلاتے رہے اور لوگوں کا علاج کرتے رہے۔

ع یہ درویشی تھی جس پر تھے فدا حاذق زمانے کے!

جب ہم درویش تھے، بادشاہ تھے۔ جہاں جاتے لوگ عزت کرتے، پیار کرتے، پاس بٹھاتے، دعا کراتے۔ ہم دن کو گلستاں پڑھتے، بوستاں پڑھتے، ابواب الصرف پڑھتے، نحو میر پڑھتے، صرفیوں کی زبان چلاتے، نحویوں کے دماغ رکھتے، منطقیوں کی سوچ رکھتے، فلسفیوں کی فکر رکھتے۔ بو علی سینا اور فارابی کی باتیں سنتے۔ ہم درویش تھے کتابیں پڑھتے۔ رات کے وقت سبق یاد کرتے۔ سحری کے وقت تہجد پڑھتے۔ صبح کی نماز کے بعد درود پڑھتے جب محفل نعت جمتی تو لوگوں کو نعت سناتے۔

میں بلبل باغ مدینے دی ہاں کی کرناں ایں باغ بہاراں نوں
میں وچھڑی احمد پیارے دی ہاں اگ لاواں ان گلزاراں نوں

لوگ سنتے۔ پھول نچھاور کرتے۔ گلے میں ہار ڈالتے۔ لیکن یہ قصہ آج سے ۶۴ سات پہلے کا ہے۔ جب ہم درویش ہوا کرتے تھے!

خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر — تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

ہمارے استادِ گرامی مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ جمعرات کو ظہر کی نماز پڑھ کر حضرت داتا گنج بخش کے مزار کی حاضری کے لیے پیدل روانہ ہوتے۔ ان دنوں دہلی دروازے سے لے کر بھاٹی دروازے تک ایک بڑا خوبصورت باغ تھا (جو ان دنوں تجاوزات کی نذر ہو چکا ہے) اس کے درمیان ایک صاف ستھرا راستہ تھا جس پر چلتے چلتے ہم اپنے استاد کے اردگرد داتا دربار پہنچ جاتے۔ ظہر کے بعد سورج ہمارے سامنے ہوتا گرمی لگتی۔ آنکھیں چندھیا جاتیں۔ مگر ہم سب اپنے استاد کے اردگرد پیدل آتے۔ حضرت تو مزار پر انوار پر "مراقبے" میں بیٹھ جاتے، ہم ادھر ادھر گھومتے رہتے۔ سورج ڈھلتے ہم واپس آتے تو ہمارے استاد ہمارے لیے تانگے مہیا کرتے۔ ہم شان و شوکت سے بھاٹی دروازے سے دہلی دروازے آتے۔ ہم نے خیال کیا کہ حضرت ایک طرف کا کرایہ بچانے کی غرض سے یک طرفہ تانگے مہیا کرتے ہیں۔ ہم نے عرض کی حضرت آتے وقت دھوپ، گرمی اور سامنے سورج ہوتا ہے۔ واپسی پر موسم ٹھنڈا ہو جاتا ہے تانگوں پر دہلی دروازے سے آتی بار آنا چاہیے۔ ہمارے اس بچگانہ مطالبہ پر آنکھ اٹھا کر دیکھا مسکرائے۔ فرمایا جب کسی بزرگ کی زیارت کو جاؤ تو پیدل جاؤ۔ ادب سے جاؤ۔ افتاں خیزاں جاؤ۔ دھوپ گرمی برداشت کرو۔ حاضری کے بعد اپنی مرضی سے واپس جاؤ۔ آج ہم سوچتے ہیں تو اپنے استاد کی بات کتنی اچھی لگتی ہے۔

تیرے کوچے ہر بہانے میرا افتاں خیزاں آنا — کبھی دوڑے دوڑے آنا کبھی اشک ریزاں آنا

(جہانِ رضا لاہور۔ اگست ۲۰۰۷ء)

جب ہم طالب علم تھے

تحریک پاکستان زوروں پر تھی اور ہم طالب علم تھے۔ لاہور کے باغات سیاسی جلسوں سے آباد تھے اور ہم طالب علم تھے۔ ہندو مسلم معرکوں کا آغاز ہو چکا تھا اور ہم طالب علم تھے۔ "لے کے رہیں گے پاکستان"۔۔۔۔ "بن کے رہے گا پاکستان"۔۔۔ "دینا پڑے گا پاکستان" سے لاہور کے گلی کوچے گونج رہے تھے اور ہم طالب علم تھے۔

ہم دینی مدارس کے طالب علم تھے۔ ہماری دنیا مسجد اور مدرسہ کے در و دیوار میں سمٹی ہوئی تھی۔ ہماری بود و باش حجرۂ درویشی تک محدود تھی۔

خوشا مسجد و مدرسہ خانقاہے — کہ دروے بود قیل وقالِ محمد

لاہور کے دہلی دروازے کے باہر پولیس کی ایک بہت بڑی بلڈنگ ہے۔ اسے ان دنوں کوتوالی کہتے تھے اور وہاں لاہور کا کوتوال بیٹھتا تھا۔ (آج کل یہ بلڈنگ CIA پولیس کا ہیڈ کوارٹر ہے) اس کوتوالی کی شمالی دیوار کے ساتھ ہمارے استاد گرامی مولانا محمد نبی بخش حلوائی (مؤلف تفسیر نبوی) رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دو منزلہ مسجد بنائی تھی۔ اس کے حجروں میں طلبہ اور درویش رہتے تھے اور خود حضرت علامہ حلوائی اپنے حجرے میں تالیف و تصنیف کا کام کرتے تھے۔

ہم ان دنوں صرف و نحو کی وادیوں میں گھومتے، گلستاں اور بوستاں کے خیابانوں میں سیر کرتے۔ ضَرَبَ یَضْرِبُ کی ضربیں لگایا کرتے تھے۔ ان دنوں اگرچہ دارالعلوم حزب الاحناف اندرون دہلی دروازہ، مدرسہ فتحیہ (اچھرہ)

،دار العلوم نعمانیہ، مدرسہ حمیدیہ (نیلا گنبد) جیسے دینی مدارس علوم دینیہ کے مراکز
مگر ہم کچھ عرصہ ان مدارس میں آمد ورفت تو رکھتے تھے لیکن شام کو ایک حلقہ تدریس
قائم تھا، جس میں آ بیٹھتے تھے۔ ہمارے استادِ گرامی حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی
نے اس وقت کے معروف مدرسین اور قابل اساتذہ کی خدمات حاصل کر رکھی
تھیں۔ ان کے زیرِ اہتمام طلبہ کا ایک خصوصی حلقہ ہر شام کے وقت قائم ہوتا اور
ایک کلاس لگتی، جس میں درسِ نظامی کی کتابیں پڑھائی جاتیں اور ہم اسی ''خصوصی
حلقہ'' کے ایک خوشہ چین تھے۔

اس حلقہ میں حافظ محمد عالم رحمتہ اللہ علیہ پڑھا کرتے تھے۔ مولانا صوفی غلام
حسین آف گوجرہ اس حلقے کے رکن تھے۔ صاحبزادہ سید محمد اسلم شاہ علی پوری ان
صاحبزادہ علی اکبر علی پوری بھی طالب علم تھے اور راقم الحروف جو درویشی کے کوچے
سے نکل کر ان نامور طلبہ کا ہم سبق بنا تھا اسی حلقے میں بیٹھا کرتا تھا۔ ہم چاروں
طالب علم، امام النحو والمنطق، حضرت مولانا مہر الدین جماعتی رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت
مولانا غلام نبی گورداسپوری سے صرف، نحو اور منطق کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ ہم
سارے ہم درس اپنے اپنے انداز میں محنت کرتے تھے۔ حافظ محمد عالم ذہین طالب علم
تھے۔ انہیں صرف ونحو پر بڑا عبور حاصل تھا۔ مولانا غلام حسین گوجروی کلام و بیان سے
بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ خوش آواز تھے انہوں نے سعدی کی گلستان کا دیباچہ حفظ
کر لیا تھا اور گلستان و بوستان کے چیدہ چیدہ اشعار خاص طرز سے سنایا کرتے تھے۔
صاحبزادہ محمد اسلم علی پوری پیرزادے تھے اور اسباق کو ایک نظر دیکھ کر یاد کر لیا کرتے۔
راقم الحروف ان حضرات کا ہم سبق ہونے کی وجہ سے بھی خاص مقام رکھتا تھا اور علمی

دسترخوان کا لقمہ چین تھا۔

آپ لوگوں نے ''قصہ چہار درویش'' پڑھا ہوگا۔ ہم چاروں طالب علم
اگرچہ اس کتاب کے کردار تو نہ تھے مگر دن رات حصول علم میں سرگرداں تھے۔ ہم
سارے ہی اپنے اساتذہ اور خصوصاً حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی کے منظور نظر بھی
تھے۔ حافظ محمد عالم حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی کے ایک مرید حاجی شاہ محمد
ریاست جموں کے فرزند ارجمند تھے جو سیالکوٹ سے قرآن حفظ کر کے لاہور آئے
تھے۔ صوفی غلام حسین گوجروی خانوادۂ علی پوری کے صاحبزادہ سید علی حسین علی پوری
کی سفارش سے داخل ہوئے تھے۔ صاحبزادہ محمد اسلم علی پوری، حضرت علامہ حلوائی
کے پیر خانہ کے صاحبزادہ تھے۔ راقم (پیرزادہ اقبال احمد فاروقی) اپنے چچا پیر
عبدالخالق فاروقی جو حضرت علامہ حلوائی کے خلیفہ اور سابقہ تیس سال سے حضرت کے
زیرِ تربیت تھے کی سفارش پر داخلِ حلقہ ''چہار درویشاں'' ہوا تھا۔

ایک وقت آیا کہ ہم چاروں طالب علم، مختلف علمی وادیاں طے کر کے ایک
دوسرے سے بچھڑ گئے۔ حافظ محمد عالم آگے چل کر سیالکوٹ میں دو دروازہ کی جامع
مسجد میں ایک عظیم دار العلوم کے بانی بنے۔ جہاں سے ہزاروں طلبہ زیور علم سے
آراستہ ہو کر نکلے۔ صوفی غلام حسین گوجروی اپنے وقت کے باکمال مقرر اور خوش بیان
خطیب بنے۔ اور سارے پاکستان میں ان کی خطابت کا طوطی بولتا رہا۔ صاحبزادہ محمد
اسلم علی پوری پیر طریقت بنے جن کی زیرِ نگاہ ہزاروں مریدانِ باصفا نے راہ سلوک طے
کیا۔ راقم مختلف علمی راہوں میں چلتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں پہنچنا تھا۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق　　او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم!

ہمارے استادِ محترم مولانا محمد مہر الدین علی پوری رحمتہ اللہ علیہ صرف ونحو میں کمال رکھتے تھے۔ منطق وکلام میں بے مثال تھے۔ ہم جن دنوں ان سے ''علم الصیغہ'' پڑھا کرتے تھے تو وہ عجیب وغریب صیغے پڑھاتے تھے۔ جو ہمیں ساری عمر کام آتے رہے۔ وہ صرف پڑھاتے تو ہمیں ایک ایک گھنٹہ کھڑا کر کے ''ابواب الصرف'' کی گردانیں کراتے۔ آپ نے ہمیں ''علم الصیغہ'' پڑھاتے وقت پانچ سو صیغوں سے آگاہ کیا۔ لوگ ان علوم سے واقف ہیں، وہ ان صیغوں کی اہمیت کو جانتے ہیں۔ فارسی کتابوں میں گلستاں، بوستاں، زلیخا، سکندر نامہ جیسی کتابوں سے گزرے تو کئی اشعار ہمیں ازبر ہو گئے۔

مجھے یاد ہے مولانا مہر الدین نے منطق کی ابتدائی کتاب ''ایسا غوجی'' از بر کرائی تھی اور ''قطبی'' کے ابتدائی صفحات پڑھائے تھے۔ ہم اپنے استادوں سے منطق کی کتابیں پڑھتے تو بڑے لطیف اور باریک نکتے ہمارے سامنے آتے۔ وہ بڑے منطقی اصول ذہن نشین کراتے اور ہم کہتے۔ ''ہزار نکتہ باریک تر زمواییں جاست''۔ استاد اصولی بات کرتے تو ہم خوش ہو جاتے۔ ایک نا قابل شکست اصول ہے اور آج تک دنیا کا کوئی دانشور اس اصول کو توڑ نہیں سکا اور وہ یہ ہے۔ ''اذا کنت شمس طالعة فا النہار موجود'' جب سورج نکل آئے تو رات ختم ہو جاتی ہے اور دن موجود ہوتا ہے۔ یہ ایک سچی اور پکی بات ہے کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ مگر ہمارے استاد نے فرمایا کہ ہم اس اصول کو رد کرتے ہیں اور شعر کہا:

مثالے را کہ در مرضیہ گفتہ   بگو با منطقی کاں ہست مردود
رخ وزلفین یارم را نظر کن   کہ شمس طالع است ولیل موجود

ہمارے استاد فرمایا کرتے کہ منطقیوں نے یہ اصول بنایا ہے انہیں کہہ دو کہ ہم نے اسے رد کر دیا ہے۔ میرے محبوب کا روشن چہرہ دیکھو جو دن ہے اور اس زلف کو دیکھو جو سیاہ رات بن کر چھائی ہوئی ہے۔

ایک بار انہوں نے مزید بتایا کہ دنیا مانتی ہے کہ پھول کی کلی جب ایک بار کھل جائے، پھول بن جائے تو دوبارہ کوئی طاقت اس کو کلی نہیں بنا سکتی۔ مگر فرمانے لگے۔

ہر غنچہ کہ بشگفت دگر غنچہ نہ گردد   قرباں بہ لب یار، گہے غنچہ، گہے گل!

غنچہ ایک بار کھل کر پھول بن جائے تو دوبارہ غنچہ نہیں بن سکتا۔ مگر میں اپنے محبوب کے لبوں پر قربان جاؤں کبھی غنچہ بنتے ہیں، کبھی پھول بنتے ہیں۔ پھر کبھی غنچہ بنتے ہیں اور پھول بنتے ہیں۔

ہم نے اپنی طالب علمی کے زمانے کے صرف ''چہار درویش'' کا ذکر کیا ہے ورنہ دارالعلوم حزب الاحناف'' چنگڑ محلہ''، دارالعلوم نعمانیہ، دارالعلوم فتحیہ (اچھرہ) مدرسہ غوثیہ (تکیہ سادھواں) کے علاوہ کئی دینی مدارس موجود تھے اور ہم علم کے موتی چننے کے لیے کبھی کبھی وہاں کے طلبہ کی صفوں میں جا بیٹھتے تھے۔ ہمارے حلقہ طلبہ کے نگران مولانا باغ علی نسیم رحمۃ اللہ علیہ تھے جو خود دارالعلوم حزب الاحناف میں دورۂ حدیث پڑھتے تھے مگر ہمارے دارالعلوم کے طلبہ کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔

یہ غالباً ۱۹۳۹ء کا زمانہ تھا لاہور سیاسی جلسوں کی تقریروں سے گونج رہا تھا۔ تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ خاکسار بیلچے اٹھائے ہوئے گلی گلی کوچے کوچے ''چپ راست'' کرتے رہتے۔ علماء کیخلاف لٹریچر تقسیم کرتے۔ ''احراری'' سرخ وردیوں میں کلہاڑیاں اٹھائے لاہور میں جلسے کرتے رہتے تھے۔ ادھر مسلم لیگی....... مسلم ہے تو

مسلم لیگ میں آ .... کے نعرے لگاتے رہتے تھے۔ ہمارے استادِ مکرم ابوالبرکات سید محمد احمد قادری ناظمِ اعلیٰ حزب الاحناف نے ''غازی فوج'' تیار کی تھی جس میں ہم بھی خاکی وردی پہن کر '' یمین یسار'' کرتے رہتے۔ کالجوں کے کچھ طالب علم ہمارے پاس چلے آتے اور ہمیں ساتھ لے کر سیاسی جلسوں میں پہنچ جاتے۔ ساری ساری رات جلسے ہوتے۔ مجلسِ احرارِ اسلام دہلی دروازے کے باغ میں، مسلم لیگ موچی دروازے کے باغ میں، ہندو مہا سبھائی شاہ عالمی دروازے کے باغ میں، خاکسار شیرانوالہ دروازے کے باغ میں جلسے کرتے تھے۔ ہم رات کے وقت کتابیں سمیٹ کر حجرے میں رکھتے اور لیڈروں کی تقریریں سننے چلے جاتے اور وہاں رنگ رنگ کی تقریریں سنتے۔

ہمیں اس زمانے میں نہ سیاسی شعور تھا نہ دینی پختگی تھی۔ مگر جلسے سننے کا چسکا ضرور تھا۔ حزب الاحناف کے جلسے وزیر خاں کی مسجد میں ہوتے تھے اور ہم ساری ساری رات تقریریں سنتے رہتے۔ ہمارے سارے طلبہ بھرپور حصہ لیتے۔ استاد بھی ان جلسوں میں شریک ہوتے۔ سارے ہندوستان سے اہل سنت کے بلند پایہ مقرر آتے اور لاہور کو اپنی تقریروں سے مالا مال کرتے تھے۔ ہم نے ان جلسوں میں صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی کی تقریریں سنیں۔ شہزادۂ اعلیٰ حضرت مولانا حامد رضا خاں بریلوی کی زیارت کی۔ حضرت محدث کچھوچھوی کو شہنشاہِ سمنان کا تاج سر پر سجائے تقریر کرتے سنا۔ مولانا محمد یار فریدی جب خاص طرز میں مولانا روم کی مثنوی پڑھتے تو لوگ جھوم جاتے۔ مولانا قطب الدین جھنگوی کو گرجتے دیکھا اور سنا۔ سید ولایت شاہ گجراتی کو سنا۔ مولانا حشمت علی کی دھواں دھار تقریریں بھی سنیں۔

ہم اگرچہ سنی طالب علم تھے۔ مگر چھپتے چھپتے رات کو سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریریں سننے چلے جاتے۔ ان کے سٹیج پر صاحبزادہ فیض الحسن بیٹھے ہوتے۔ محمد علی جالندھری ہوتے۔ چودھری افضل حق ہوتے۔ مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی ہوتے۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی ہوتے۔ پھر احرار کا مغبچہ شورش کاشمیری ہوتا۔ شیعہ راہنما مظہر علی اظہر ہوتا، مظفر علی شمسی ہوتا۔ یہ سارے لوگ کانگریس کے وظیفہ خوار تھے اور پاکستان کے خلاف بڑی بدبودار تقریریں کیا کرتے۔ قائد اعظم کا مذاق اڑاتے بلکہ انہیں کافر اعظم کہہ جاتے۔ ہندوؤں کے زیر سایہ ''حکومت الٰہیہ'' قائم کرنے کا اعلان کرتے اور مسلمانوں کو گاندھی کی دھرم شالہ میں نمازیں پڑھاتے۔

ہم رات موچی دروازے کے باغ میں جا پہنچتے۔ وہاں مسلم لیگ کے راہنما تقریریں کرتے اور ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' اور ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح'' کے ترانے سنتے۔ اگرچہ ہم طالب علم تھے مگر ہم نے موچی دروازے کے باغ میں میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ، نواب آف ممدوٹ، خان عبدالرب نشتر اور مولانا محمد مسلم بی۔ اے کو پاکستان کے حق میں تقریریں کرتے سنا اور لوگوں کو پاکستان بنانے پر آمادہ کرتے سنا۔ وہ قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال کی تعریف و توصیف میں زبردست تقریریں کرتے۔ ہمارا دل جھوم جاتا۔ ہمیں اپنا مستقبل روشن نظر آتا۔ احراری مولویوں کی تقریریں اگرچہ دھواں دار ہوتیں اور ان کا ہر شخص شعلہ بیاں ہوتا اوران سے محظوظ ہوتے مگر ان کی تقریروں سے بدبو آتی۔ جیسے ہندوؤں کے '' گوکھل خانوں'' میں سے آتی ہے۔ مسلم لیگی راہنماؤں کی تقریریں دھواں دار تو نہ ہوتی تھیں مگر دل کو بھاتیں اور ہم قائد اعظم کو دیکھے بغیر '' ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح''

ماننے۔ ان جیسی تقریروں کے برعکس ہمیں اپنے علمائے اہل سنت کی تقریریں سننے کا بھی بڑا شوق ہوتا۔ لاہور کے کسی علاقے میں جلسہ ہوتا سائیکلیں لیں، گھنٹیاں بجاتے جلسہ گاہ میں جا پہنچتے۔ رات گئے تک تقریریں سنتے۔ دل ودماغ کو خوش کرتے اور گھر آجاتے۔

ہمیں اپنے علمائے اہل سنت کی تقریروں میں بڑی دلچسپی ہوتی بلکہ ہم ان کی زیارت کو بھی بڑا کارنامہ جانتے اور جب ہمارا بس چلتا تو ہم ان کے ہاتھ چومنے کو دوڑتے۔

ہم طالب علم تھے۔ یہ ۱۹۴۰ء کا سال تھا آزادی کی تحریکیں طوفان بن کر چل رہی تھیں۔ احراری، کانگریسی، ہندو مہا سبھائی، خاکسار، نیلی پوش اب ہتھیار بند ہو کر نکلنے لگے تھے خاکساروں نے بیلچے اٹھا کر عسکری قوت کا مظاہرہ کیا۔ ہیرا منڈی کے بازار میں جلوس نکالا۔ پولیس نے روکا تو ایک ڈی ایس پی کو بیلچا مار کر اس کی گردن اڑا دی۔ اب گولی چلی۔ کئی خاکسار مارے گئے۔ ہم نے اس انگریز ڈی ایس پی کی بے گوروکفن لاش، خون میں لت پت قریب سے دیکھی۔ کیونکہ ہماری مسجد کوتوالی کے ساتھ تھی اور اس کی لاش کوتوالی میں رکھی ہوئی تھی۔ سارے شہر میں خاکساروں کو گرفتار کیا جا رہا تھا۔ جو بچ گئے وہ لاہور کی مساجد میں ''پناہ گیر'' ہو گئے اور مسجدوں کو پولیس نے گھیر لیا۔

خاکساروں کے سانحے کے چند دن بعد قائداعظم محمد علی جناح نے منٹو پارک میں (جہاں اب مینار پاکستان ہے) آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ تاریخی جلسہ کیا جس میں قرارداد پاکستان کا رزولیشن پاس ہوا۔ ہم اس جلسے میں شریک تو نہ ہو سکے

مگر اس جلسے کی رونقیں اور مسلم لیگی راہنماؤں کا آنا جانا اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ مسلم لیگی راہنما سارے ہندوستان سے آئے تھے اور انہوں نے لاہور کو مسلم لیگ کا مرکز بنا دیا تھا۔

ان دنوں جس عالم دین کی تقریر نے ہم جیسے طالب علموں کو متاثر کیا وہ مولانا محمد بخش مسلم بی۔اے تھے۔ مولانا مسلم سرخ رنگت کے جواں سال عالم دین تھے۔ سر پر سرخ ترکی ٹوپی رکھتے اور لوہاری دروازے کے باہر ایک باغیچے میں جمعہ کی نماز سے پہلے تقریر کرتے ان کی تقریر اردو، انگریزی کا مرقع ہوتی۔ وہ تحریک پاکستان کے حق میں تقریر کرتے، علامہ اقبال کے اشعار سناتے۔ قائداعظم کے اقوال انگریزی میں پیش کرتے اور نظریہء پاکستان کی تشریح کرتے اور لوگوں کو پاکستان بنانے کے لیے تیار کرتے۔ ان کی تقریر سننے کے لیے کالج کے طلبہ، پرجوش نوجوان اور پاکستان کے حامی لوگ جمع ہوتے۔ ہم بھی وہاں جا پہنچتے۔ جب وہ خوش آوازی سے لوگوں کو تشکیلِ پاکستان کی دعوت دیتے تو بڑے ترنم سے یہ شعر پڑھتے:

شب ہجراں کے جاگنے والو — کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی
رہ گئی بات کٹ گئی شب ہجر — تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی؟

ہم ان کے اس شعر کو جھوم جھوم کر پڑھتے اور پاکستان بنانے کے لیے دن رات کام کرتے۔

یہ سیاسی جلسوں کا اثر تھا یا ہماری آوارہ گردی کی نحوست، ہم سارے طالب علم ایک ایک کر کے بکھر گئے۔ حافظ محمد عالم حزب الاحناف میں داخل ہو گئے۔ صوفی غلام حسین گوجروی نعت خوان بن گئے۔ صاحبزادہ محمد اسلم پیر بن کر علی پور چلے گئے اور

ہم اکیلے رہ گئے۔ استادوں نے ڈانٹا۔ جلسوں سے روکا۔ مہربانوں نے کان کھینچے۔ مگر ہم ”طفلِ گریز پا“ بن کر ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔

ہمارے دو تایا زاد بھائی ریاست بہاولپور میں ایک دیہاتی درس گاہ میں زیر تعلیم تھے۔ انہوں نے اس درس گاہ کی بڑی تعریف کی۔ ہم لاہور چھوڑ کر ہارون آباد کے علاقے میں ان کے درس میں جا بیٹھے۔ وہاں تعلیم وتدریس کو لاہور کی نسبت بہتر پایا اور اس طرح ہم دن رات پڑھنے لگے۔ صرف ونحو کی کتابوں کو دہرایا۔ گلستاں، بوستاں، یوسف زلیخا، سکندر نامہ جیسی کتابوں کو سبقاً سبقاً پڑھا ان کتابوں کو صبح شام پڑھتے ہزاروں اشعار یاد کر لیے۔ مثنوی مولانا روم خاص طرز سے پڑھتے تو ریگستان کے صحرا گونج اٹھتے۔ قرآن پڑھتے تو وادیاں جھوم اٹھتیں۔ نعت پڑھتے تو عورتیں سر پر پانی کے گھڑے اٹھائے رک جاتیں۔ یہ سب چیزیں من جانب اللہ تھیں۔ ان پر جس قدر اللہ کا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

یہ عظمتیں ہیں مقدر کسی کسی کے لیے   کسی کو دشت نوردی کسی کو دار و رسن

حافظ محمد عالم ان دنوں لاہور کے مدارس کی سست روی سے نالاں تھے۔ ہم لاہور آئے۔ اپنے درس کی تعریف کی۔ فارسی اشعار سنائے۔ گلستاں بوستاں کے چیدہ چیدہ جملے سنائے تو حافظ محمد عالم لاہور چھوڑ کر ہمارے ساتھ ریاست بہاولپور جانے کے لیے آمادہ ہو گئے اور کہنے لگے چلو۔

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت!

ان دنوں طلبہ اپنی پسند کی درس گاہوں میں چوری چوری چلے جاتے تھے اور طالب علموں میں یہ رواج تھا۔ ہم دونوں بھی کسی کو بتائے بغیر چوری چوری لاہور سے

نکلے اور ہارون آباد کے اس درس میں جا پہنچے جہاں ہم ایک سال تک پڑھتے رہے تھے۔ حافظ محمد عالم ذہین اور تیز رفتار طالب علم تھے وہ چھ ماہ وہاں رہے مگر انہیں وہاں کے استاد بھی مطمئن نہ کر سکے۔ اور وہ مولانا علم دین جہلمی کے پاس جو نواب آف ممدوٹ کی ریاست میں ایک مدرسہ چلا رہے تھے چلے گئے۔ مگر وہاں بھی ان کے ”دلِ ناصبور“ کو چین نہ آیا۔ تو وہ دہلی یا بریلی کا رخ کرنے کی بجائے لاہور آ کر اپنے استادِ گرامی کے زیرِ سایہ دارالعلوم حزب الاحناف میں پڑھنے لگے۔

ہم نے ”جامعہ عباسیہ، بہاولپور“ کی شہرت سنی ہوئی تھی۔ ان دنوں مولانا غلام علی گھوٹوی شیخ الجامعہ تھے۔ ہم اپنے استاد کو لے کر جامعہ عباسیہ جا پہنچے۔ ہم علمی طور پر جامعہ عباسیہ کے معیار پر پورا نہ اترتے تھے مگر ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ شیخ الجامعہ حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی کے مرید ہیں۔ میرے استاد حافظ غلام حسین نے میرا تعارف کرایا۔ شیخ الجامعہ نے علمی استعداد دریافت کی۔ ہم ابھی سمندر کے کنارے بیٹھے لہریں گن رہے تھے۔ ہمارے استاد نے عرض کی حضور یہ بچہ ذہین ہے، نعت خوان ہے۔ شیخ الجامعہ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔ ہم نے بڑی خوش آوازی سے ان کے پیر کی مشہور نعت ”اج سک متراں دی ودھیری اے“ پڑھنی شروع کی۔ تو شیخ الجامعہ جھوم اٹھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مگر جب ہم نے

اس صورت نوں میں جان آکھاں   جانان کہ جانِ جہان آکھاں
سچ آکھاں تے رب دی شان آکھاں   جس شان تو شاناں سب بنیاں

پڑھا تو حضرت نے ایک نعرہ مارا، سینے پر ایک ہاتھ مارا اور فرمایا ”تم یہاں ہی پڑھو گے“۔ ہم داخل کیا ہوئے شیخ الجامعہ کے محبوب نظر بن گئے۔ پڑھتے گئے ”اور علامہ“

کی ڈگری لے کر لاہور آ گئے۔

۱۹۴۴ء میں ہم دوبارہ لاہور آ گئے۔ ہمارے استادِ گرامی مولانا نبی بخش حلوائی شدید بیمار تھے۔ ان کے مدرسے کے ناظم اعلیٰ مولانا باغ علی نسیم آخرین طالب علموں کو سنبھالا دینے میں مصروف تھے۔ ان کے زیرِ نگرانی رہنے والے میرے چچا سالکِ طریقت پیر عبدالخالق فاروقی اپنے پیر و مرشد کی زندگی کے آخری ایام کو حسرت و یاس سے دیکھ رہے تھے۔ یہ ہماری طالب علمی کا آخری زمانہ تھا۔ نہ ہم درسی اور روایتی مولوی بن سکے، نہ کسی جامع مسجد کے خطیب اور نہ کسی خانقاہ کے سجادہ نشین۔ حالانکہ ہم نے اپنے استادِ محترم کی زندگی میں ''درویشی'' کی تھی۔ ''طالب علمی'' کی تھی۔ مگر ہم لاہور میں چاروں طرف دیکھتے۔ لاہور کی بے چراغ گلیوں میں گھومتے مگر کچھ نظر نہ آتا۔

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

عشق کی سرگرمیاں، حسن کی شوخیاں، غزنوی کی تڑپ اور زلفِ ایاز میں خم سارے کے سارے مولانا محمد نبی بخش حلوائی کی رحلت کے ساتھ ختم ہو گئے۔ ہم نے ایک گوشہ نشین طالب علم بن کر میٹرک کی تیاری شروع کر دی۔ اسی دوران ملک آزاد ہو گیا۔ پاکستان بن گیا۔ لاہور اجڑ گیا۔ پھر لاہور مہاجروں سے آباد ہونے لگا۔ حویلیاں خالی ہونے لگیں۔ حویلیاں الاٹ ہونے لگیں اور محلے آباد ہونے لگے۔ لاہور میں نئے نئے چہرے آنے لگے۔ لالے گئے، لعل آ گئے۔ ہندو گئے، مسلمان آ گئے۔ رام رام کرنے والے گئے، اللہ اللہ کرنے والے آ گئے۔ آزادی کا سورج

طلوع ہو رہا تھا۔ ہم نے میٹرک کا امتحان دیا۔ نتیجہ آیا تو ہم فرسٹ ڈویژن میں پاس تھے۔ ان دنوں فرسٹ ڈویژن لینا آج کل ایم بی اے کی ڈگری لینا تھی۔ ہم خود حیران ہوئے کہ ہم کس طرح فرسٹ ڈویژن آ گئے۔ لیکن درویشی، غربت اور کتاب بینی نے ہمیں فرسٹ ڈویژن کے اعزاز سے نوازا۔ اب ہم دینی مدارس کی صفوں کو لپیٹتے گئے۔ ''شرح ملا جامی'' در بغل اور ''شرح مأۃ عامل'' برزباں اشعارِ رومی حرزِ جاں' تفسیرِ قرآں جانِ جاں اور روحِ محمد جانِ ایمان کے جذبوں کو لے کر ہم کالجوں کا رخ کرنے لگے۔

''صوفی از مسجد بر آمد رند از مے خانہ رفت'' چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

(جہانِ رضا لاہور۔ ستمبر ۲۰۰۷ء)

جب ہم کالجیٹ تھے

آزادی کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ پاکستان میں مہاجرین آباد ہو رہے تھے ہندوستان کے لٹے پٹے خاندان لاہور پہنچ رہے تھے اور ہم طالب علمی کی صفوں سے نکل کر کالجوں کا رخ کرنے والے تھے۔ ہندوستان سے آنے والے اچھے اچھے لوگ اور اربابِ علم بھی مختلف شہروں میں آ بسے تھے ان میں قاری، علماء، مشائخ، ادیب اور خطیب بھی آئے تھے۔ ہم ان حضرات سے استفادہ کرتے تھے۔ شاعروں کو بٹھا کر پان کھلاتے اور اُن سے بڑے میٹھے شعر سنتے۔ پانی پت سے آنے والے قاریوں کو مسجد کے جلسوں میں بلا کر لحنِ داؤدی سے قرآن سنتے۔ علماء کرام کی شاندار تقریریں سنتے جو لکھنوی اور بریلوی اردو کا مجموعہ ہوتیں۔ ادیبوں کے مقالے پڑھتے تو دل و دماغ کی وادیاں مہک اُٹھتیں۔ غنچہ ہائے دل چٹک چٹک جاتے۔

اب ہم مسجدی طالب علم نہیں رہے تھے مدرسوں سے نکل کر کالجوں کا رخ کر رہے تھے۔ دینی مدارس کا اپنا ماحول ہوتا ہے۔ مگر اُس زمانے میں گریجویٹ بننے کے لیے پہلے فارسی میں "منشی فاضل" عربی میں "مولوی فاضل" اور اُردو میں "ادیب فاضل" کرنا پڑتا تھا۔ پھر جا کر بی۔ اے کے امتحان کے لیے دروازے کھل جاتے تھے۔ اس طریقہءتعلیم کو "بٹھنڈہ لائن" کہتے تھے۔ ہمارے جیسے سیکڑوں طلبہ بی۔ اے کرنے کے لیے منشی فاضل، مولوی فاضل، اور ادیب فاضل کرتے تھے۔ اور پھر آگے چل کر "گریجویٹ" بن جاتے تھے۔

جب ہم کالج کی تلاش میں نکلے تو دیکھا کہ ہمارے گھر کے قریب ہی ایک

شبینہ کالج "دار العلوم السنۃ الشرقیہ" شام کے وقت منشی فاضل کی تعلیم دیتا تھا۔ اس کالج کے پرنسپل آقا بیدار بخت مرحوم تھے۔ وہ فارسی میں بڑے مشاق استاد تھے، زبردست معلم تھے۔ بڑی محنت سے پڑھاتے۔ اُن کے کالج کے دوسرے اساتذہ بھی اپنے وقت کے ماہرین تعلیم تھے۔ ہم اگر اپنے اُس وقت کے اساتذہ کا ذکر کریں اور اُن کی تعلیمی اور تدریسی خدمات کو بیان کریں تو ایک کتاب تیار ہو جائے۔ اسی طرح ہمارے کالج میں ہمارے ہم درس احباب بھی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے اگر اُن کا تذکرہ کریں تو ایک دفتر درکار ہے۔ ہمارے اکثر کلاس فیلوز اس شبینہ کالج سے پڑھ کر گریجویٹ بنے اور بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے اور دنیاوی کامرانیاں حاصل کرتے گئے۔

آقا بیدار بخت ایک ماہر تعلیم ہی نہیں تھے شفیق استاد بھی تھے۔ وہ پڑھاتے تو والہانہ انداز اختیار کر لیتے۔ وہ "نظیری نیشاپوری" کا دیوان پڑھاتے تو لطف آ جاتا۔ وہ "قاآنی" کے اشعار پڑھاتے تو دل جھوم جاتا۔ وہ خود بھی جھوم جھوم کر اشعار پڑھتے اور پڑھاتے اور اُس کی تشریح کرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ

نسیم خلد می وزد مگر زجوئے بارہا!

وہ "حافظ شیرازی" کا دیوان پڑھاتے تو "رکنا باد و گلگشتِ مصلیٰ" یاد آ جاتا۔ ہمارے کالج کا سالانہ جلسہ ہوا۔ یہ جلسہ برکت علی اسلامیہ ہال بیرون موچی دروازہ لاہور میں ہوا تھا۔ طالب علموں میں سے ہمیں بھی تقریر کرنے کو کہا گیا۔ ہم بنیادی طور پر درویش تھے، مولوی تھے، خطیبوں کی تقریروں کے زیر سایہ پلے ہوئے تھے۔ آج کالج کے اساتذہ اور طلبہ کے مجمعے میں پہلی بار تقریر کرنے کا موقع ملا تھا۔

ہم نے اپنے سامعین کے نئے چہرے دیکھے تھے۔ جو پینٹ کوٹ اور دوسرے مخصوص لباسوں میں صف آرا تھے ہم نے ایک نگاہ ڈالی اور تقریر کے آغاز میں ہی داد پانے لگے۔ دورانِ تقریر ہم نے اپنے استاد آقا بیدار بخت کو مخاطب کر کے عرض کیا: حضور آپ ''دیوان نظیری'' پڑھاتے ہیں اور خوب پڑھاتے ہیں میں آپ کی اجازت سے ان حاضرین کو مخاطب کر کے آپ کی شان میں ''نظیری'' کا ایک شعر کہنا چاہتا ہوں۔

چراغ زنده می خواہی درشب زنده داراں زن
کہ بیداری بخت از ''بخت بیداراں'' شود پیدا

آقا بیدار بخت اُٹھے۔ ہمارا سر چوم لیا اور اپنے ہاتھ سے ہمارے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا۔ ہال تالیوں سے گونج اُٹھا اور ہم بہترین مقرر قرار دیے گئے۔ ہمیں یوں محسوس ہوا کہ ہم نے جس روانی سے تقریر کی ہے ہم نے جلسہ لوٹ لیا ہے۔ دوسرے دن اعلان ہوا کہ آج کے بعد ہماری فیس معاف کر دی جاتی ہے اور ہفتے میں ایک دن پرنسپل کے ٹیبل پر بیٹھ کر ہمیں ''چائے نوشی کا اعزاز'' بھی حاصل ہوگا۔ اُن دنوں پرنسپل کے ساتھ چائے کی پیالی پینا ایسے ہی تھا جیسے آج جنرل ہیڈ کوارٹر کے ''کور کمانڈر'' کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی جائے۔

ہم نے منشی فاضل کر لیا۔ پھر انگریزی کالج میں داخلے کے لیے آگے بڑھے۔ اُن دنوں ایم۔اے کرنے کے لیے یونیورسٹی کا باقاعدہ طالب علم بننا پڑتا تھا۔ ہم گریجویٹ تو تھے مگر ''بٹھنڈہ لائن'' والے تھے۔ اب پھر ایک مقام آیا کہ ایم۔اے کرنے کے لیے کالج میں داخلہ لینا پڑا۔ پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں فارسی

کلاس کے لیے داخلہ مل گیا۔ اب ہم یونیورسٹی کے طالب علم نہیں۔ ''سٹوڈنٹ'' تھے درویشی سے نکل کر مسجد و خانقاہ میں آئے، مسجد و خانقاہ سے نکلے تو مدرسہ جامعہ میں آئے اب مدرسہ اور جامعہ سے اٹھے تو پنجاب یونیورسٹی میں چلے آئے تو اب ہم ''سٹوڈنٹ'' کہلانے لگے۔

آہ سوزاں سے چلے اشک رواں تک پہنچے
فاصلے تیری محبت کے کہاں تک پہنچے

یہ یونیورسٹی تھی۔ جامعہ پنجاب تھی۔ اورینٹل کالج تھا۔ خوبصورت عمارت، ہوادار برآمدے، برآمدوں میں طلبہ کی چہل پہل، استادوں کے سٹاف روم، رئیس جامعہ ''پرنسپل'' کا خوبصورت کمرہ، پھر طلبہ کا کلاس روم۔ مسجدوں اور مدرسوں سے ہٹ کر یہاں ہم نے دستور نرالا دیکھا۔ ہم طلبہ کرسیوں پر بیٹھتے مگر استاذ کھڑے ہو کر پڑھاتے۔ پہلے پہلے برا لگا، ناگوار گزرا احتجاج کرنے کو جی چاہا مگر ایک ساتھی نے سمجھایا:

اس عشق کی دنیا کے دستور نرالے ہیں

کلاس روم میں ابھرتے ہوئے نوجوان، ہر طرف خوبصورت چہرے صاف ستھرے سوٹڈ بوٹڈ طلبہ، شفاف لباس، نئی نئی خوبصورت کتابیں، چمکتی ہوئی آنکھیں، لہراتی ہوئی سیاہ زلفیں ہر طرف ایک نیا جہان نظر آتا تھا۔

یہ مہکتی ہوئی سیاہ زلفیں — یہ چمکتے ہوئے حسیں چہرے
جن کی باتوں سے پھول جھڑتے تھے — زندگی کے اصول جھڑتے تھے
جن کو سورج سلام کرتا تھا — جن سے یزداں کلام کرتا تھا

رئیس الجامعہ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم تھے۔ وہ علم وادب کے سمندر، شعر
وشاعری کے خیاباں، اُن کے پاس جاتے ڈر لگتا تھا۔ سلام کرتے سہم جاتے تھے۔ کوئی
بات کرنا ہوتی تو زبان نہ چلتی تھی۔ ایک دوست نے بتایا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کسی زما
میں تمہاری طرح کے "درویش" تھے۔ دارالعلوم نعمانیہ لاہور کے طالب علم تھے۔
تھے مسکین تھے۔ ہزارہ کے ایک پسماندہ گاؤں سے آئے تھے۔ وہ قرآن پڑھتے
دارالعلوم نعمانیہ کی مسجد میں اذان دیا کرتے تھے۔ لوگ انہیں مؤذن کی بجائے "با
کہا کرتے تھے وہ وہاں سے نکلے تو سنہری مسجد لاہور میں چلے گئے۔ سنہری مسجد
جھاڑو دیا کرتے تھے۔ مولانا غلام مرشد کے پاؤں دباتے۔ ترقی کرتے کرتے
کے شناور بنے پھر پرنسپل بن گئے۔

ز ستارہ آفتابے ز نظارہ ماہتابے

کیوں ڈرتے ہو۔ حوصلہ ہوا۔ ہم آگے بڑھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا ہاتھ
اور حجاب ٹوٹ گیا۔ وہ بڑے شفیق انسان تھے اور جب بھی ملتے محبت سے ملتے ہمار
سر پر ہاتھ رکھتے اور دھیمی آواز میں بات کرتے۔ ڈاکٹر محمد باقر ایم۔اے، پی
۔ڈی استاذ الاساتذہ تھے۔ شعبہء فارسی کے رئیس تھے ہم فارسی ایم۔اے کر ر
تھے۔ اُن سے واسطہ پڑتا، ہفتے میں وہ ایک لیکچر دینے آتے، باقی تعلیم دوسر
اساتذہ کے ذمے تھی۔ ہم ہر روز سلام کرتے قدم قدم پر رک کر احترام کرتے۔
بات پر ادب کا اہتمام ہوتا۔ وہ جب لیکچر دیتے تو ساری کلاس پر سناٹا چھا جاتا۔ مگر عر
کے بعض الفاظ میں ہمارے استادِ گرامی "غوطہ کھا جاتے"۔ حوصلہ ہوا کہ عربی اُن ک
واجبی ہے۔ ایک دو بار علیحدگی میں عرض کیا: حضور یہ لفظ یوں ہے غور سے دیکھنے لگے

کہنے لگے تجھے کس نے بتایا۔ عرض کی مسجد اور مدرسہ کی صفوں نے اور اُن کی در و دیوار
نے ہمیں عربی لفظ اور صیغے یاد کرا دیے تھے۔ ڈاکٹر باقر جان گئے کہ ہم درویش ہیں
صرفی ہیں، نحوی ہیں، مولوی ہیں۔ خوش ہو گئے اور فرمانے لگے کبھی کبھی میرے گھر
بھی آ جایا کرو مگر کسی کو بتانا نہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد باقر کے علاوہ ہمارے چند دیگر استاد اپنے
فن میں ماہر تھے۔ ہم ان سے استفادہ کرتے۔ علم کے پھولوں سے دامن مراد
بھرتے۔ خدا رحمت کرے پروفیسر علم الدین سالک، پروفیسر وزیر الحسن عابدی،
پروفیسر فیروز الدین رازی پر یہ سارے اپنے فن میں باکمال لوگ تھے اور ہم اُن
کے شاگرد تھے۔

جن دنوں میں ہم اورینٹل کالج میں فارسی کے بحرِ زخار کی غواصی کرتے تھے
اور غرقاب علم وادب ہو کر موتی چنتے تھے، اُن دنوں ہماری کلاس میں بھی بڑے بڑے
باکمال ہمدرس تھے۔ سید اصغر علی شاہ جعفری (ایڈووکیٹ ہائیکورٹ) جنہوں نے ایم
اے کے طلبہ کے لیے بڑی عمدہ کتابیں لکھیں اور علم کی راہیں کھول دیں۔ پیر محمد افضل
فقیر جو عربی فارسی اور اردو کے باکمال شاعر بن کر دنیائے علم وادب میں چمکے اور
روحانیت کی منازل طے کرتے گئے، وہ نہ صرف ہمارے کلاس فیلو تھے بلکہ ہمارے
ہم نشین تھے۔ انہیں فارسی ادب اور فارسی اشعار پر بڑا عبور حاصل تھا۔ ہم جامی کے
دو شعر پڑھتے تو وہ پوری غزل سنا دیتے، ہم حافظ کی ایک غزل سناتے تو وہ دس
غزلیں زبانی سنا دیتے، ہم رومی کا ایک شعر پڑھتے تو وہ مثنوی مولانا روم کے ورق
در ورق سناتے جاتے۔ ہمیں سید ریاض حسین بخاری کی وہ مجالس ابھی تک یاد ہیں

جن میں کئی کئی گھنٹے ہم سب مل کر قہقہوں کی فراوانیاں بکھیرتے، استادوں کی غلطیاں پکڑتے اور اپنے علم پر غرور کرتے۔ یہ شیطانی وسوسے عام طور پر جواں سال طالب علموں کو گھیرے رکھتے ہیں۔

یہ ہماری طالب علمی کا وہ زمانہ تھا جب ہم علم وادب کے باغوں میں چہچہایا کرتے تھے۔ رومی، جامی، سعدی، حافظ شیرازی، فردوسی، نظامی، قاآنی جیسے اربابِ سخن کے نغموں سے دل ودماغ کو روشن کیا کرتے تھے۔ کالج کے برآمدوں سے نکل کر جب ہم اپنے اپنے آشیانوں میں آتے تو فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار کی عملی تصویر بن کر رات بھر مطالعہ کرتے۔

نہ مرا نوش زتحسیں — نہ مرا نیش زطعن
نہ مرا گوش بہ مدحے — نہ مرا ہوش زمے
منم وکنج خمولی کہ نہ گنجد دروے
جز من وچند کتاب ودواتے قلمے!

رات آتی تو ہمارے لیے درِ مطالعہ کھل جاتا، کنج خمولی میں بیٹھے بیٹھے کئی راتیں گزر جاتیں۔ کتابوں کا مطالعہ جاری رہتا، نصابی کتابوں سے ہٹ کر ہم نے ہیر وارث شاہ سے لے کر شاہ نامہ فردوسی تک جو کتاب سامنے آئی پڑھ ڈالی۔ جن کتابوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ بھی رات کی تنہائیوں میں دبے پاؤں ہمارے مطالعے کی زد میں چلی آتیں۔ جن ادیبوں کے محلے میں جانے کی اجازت نہ تھی ان کی قلموں کی چٹکلے سامنے چلے آتے۔ اکبری دربار کے نورتنوں سے لے کر لاہور کے چنگڑ محلہ کے گپ بازوں سے ملاقات ہو جاتی۔ ہم نے کتابوں سے وصل کی راتیں

شب ہجراں بنا کر کاٹیں اور شب ہجراں کی تنہائیاں گنگناتے گزاریں۔

شب ہجراں کے جاگنے والو — کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی
رہ گئی بات کٹ گئی شب ہجر — تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

کالج میں جاتے تو سٹوڈنٹ بن کر وقت گزارتے۔ مگر ہمارا علمی انہماک ایسا تھا کہ

کتابیں پڑھتے تھے کالج میں جب ہم
تو مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

یہ مجنوں، اصلی لیلیٰ والا مجنوں نہیں تھا بلکہ ایک دیوار نویس پینٹر تھا۔ بڑا ہی خوش خط بڑا ہی خوش قلم تھا۔ ہم اگرچہ طالب علم تھے مگر اُس کی خوش نویسی پر اُسے ہر ماہ دس روپے کا ایک نوٹ ''وظیفہ حسن کارکردگی'' دیا کرتے تھے ایک دن ہم نے اس سے پوچھا کہ تم ہمارے کالج کے اردگرد دیواریں کیوں کالی کرتے رہتے ہو۔ اتنے بڑے خوش نویس، اتنے اعلیٰ آرٹسٹ اور تم ہمارے کالج کے اردگرد اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہو، کہنے لگا کسی کو بتانا نہیں آپ کی کلاس میں ایک لڑکی لیلیٰ نامی پڑھتی ہے میں تو اس کو دیکھنے کے بہانے آجاتا ہوں ورنہ میں ادھر کبھی نہ آتا۔ ہم نے اُس کا راز دل میں رکھا اور اپنی کلاس فیلو لیلیٰ کو کبھی نہ بتایا کہ

مجنوں لام الف لکھتا ہے دیوار دبستاں پر

یونیورسٹی اورینٹل کالج میں کلاسوں سے فارغ ہوئے تو ہمارے ایک یار مہربان جوان دنوں لاء کالج میں زیر تعلیم تھے آدھمکے۔ فرمانے لگے ''چھوڑو یاران فارسی کتابوں میں کیا رکھا ہوا ہے'' ؟ فارسیوں کو کون پوچھتا ہے۔ فارسیاں گھر گالے ''پڑھنیاں فارسیاں تے ویچنے تیل'' چلو لاء کالج میں شبینہ کلاس میں داخلہ لے

دیتا ہوں۔ وکیل بنو کالا کوٹ پہنو اور مقدمے لڑو۔ لوگوں کی خدمت کرو غریبوں کی دادرسی کرو۔ ہم اُن کی باتوں میں آ گئے۔ لاء کالج میں درخواست دی مگر داخلہ نہ ملا۔ اُن دنوں لاء کالج کے پرنسپل ڈاکٹر شیخ امتیاز تھے۔ سخت بااصول اور انصاف پسند آدمی۔ ہم اُن دنوں انفورسمنٹ آفیسر تھے داخلے بند ہو گئے۔ تو ہم ایک دن پرنسپل کے کمرے میں جا پہنچے۔ بڑی نفیس انگریزی میں گزارش کی۔ "سر! میں پنجاب گورنمنٹ کے ایک محکمے میں انفورسمنٹ انسپکٹر ہوں۔ لوگوں کے چالان کرتا ہوں۔ عدالتوں میں مقدمے لے جاتا ہوں۔ مگر قانون کی تعلیم سے محروم ہونے کی وجہ سے کئی بار مقدمے ہار جاتا ہوں"۔ پروفیسر امتیاز نے ہماری باتیں سنیں۔ ہمارے چہرے پر نظر ڈالی دوسرے دن ہم لاء کالج کے سٹوڈنٹ بن گئے تھے۔ بڑے ماہر قوانین ہمارے استاد تھے۔ فر فر انگریزی بولتے۔ قانون کی گتھیاں سلجھاتے۔ کئی استاذ بار ایٹ لاء تھے۔ کئی یورپ سے پڑھ کر تازہ تازہ آئے تھے۔ وہ انگریزی بولتے تو ہمیں فارسی بھول جاتی وہ بات کرتے تو ہم لطف اندوز ہوتے۔ ہم اگرچہ لاء کالج کے سٹوڈنٹ تھے مگر کچہریوں میں کالا کوٹ پہن کر اپنے سینئر وکیلوں کے پاس چلے جاتے۔ وکیلوں کے لباس میں ہی بار روم میں پہنچ جاتے۔ اپنے استادوں اور وکیلوں کے ساتھ چائے پیتے۔ بڑے بڑے مقدموں اور بڑے بڑے ججوں کے فیصلے سنتے۔ پھر جب ہم ان استادوں کو فارسی اساتذہ کے شعر سناتے تو وہ عش عش کر اٹھتے مگر ہم دیکھتے کہ "سوری کب کہنا ہے" "ایکسکیوز می" کب کہنا ہے "پلیز" کس طرح کہنا ہے۔ "تھینک یو" کب کہنا ہے۔

ابھی ہم نے ایل۔ ایل۔ بی مکمل نہ کیا تھا کہ ہم اپنے محکمے میں "کمپنسیشن کمشنر" لگا دیئے گئے۔ اگرچہ ہم مکمل وکیل تو نہ بنے تھے مگر عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر

فیصلے کرتے۔ وکیل حاضر ہوتے تو پہلے وہ گردن جھکاتے اور پھر سر کرتے۔ بعض تو "می لارڈ" کہہ کر کھڑے ہوتے اور اپنا مقدمہ پیش کرتے۔ ہم ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان دینے والے تھے کہ ایک دوست حضرت ناصح بن کر آ گئے فرمانے لگے: چھوڑو یار، وکیل بن کر کیا کرو گے اوکیں تو تمہاری عدالت میں "می لارڈ"، "می لارڈ" کرتے ہیں۔ ہم نے واقعی اُس کی باتوں پر غور کیا اور لاء کالج سے غیر حاضر رہنے لگے۔ امتحان نہ دے سکے اور اپنی عدالت کی کرسی پر براجمان ہو کر وکیلوں کی باتیں سننے میں مصروف رہے۔ یہ ایک شیطانی وسوسہ تھا۔ جس نے ہمیں وکالت کی بجائے عدالت کا سربراہ بنایا۔ عدالت کے بعد جب ہم ریٹائر ہوئے تو پھر ہمیں وکالت یاد آئی۔

ہم نہ پروفیسر بن سکے، نہ وکیل۔ مگر ہم نے کالجوں میں جن جن اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا وہ اپنے وقت کے باکمال لوگ تھے۔ اُن میں اکثر آفتاب علم و فن بن کر روشنیاں پھیلاتے رہے۔ ان میں سے اکثر وکالت کی گلیوں سے نکل کر عدلیہ کے مقتدر عہدوں پر پہنچے اور جب بھی ہم ان کے چیمبر میں ملنے جاتے تو کالج کی یادوں کو تازہ کرنے میں بخل نہ کرتے اور عدالتی روایات سے ہٹ کر پیار کرتے، عزت دیتے، نوازتے اور پیچھے رہ جانے کے احساس کو مٹا دیتے۔

(جہانِ رضا لاہور۔ نومبر دسمبر ۲۰۰۷ء)

ہماری کتابیں بولنے لگیں

ہماری محفل میں کئی احباب آتے ہیں صبح وشام رونق لگی رہتی ہے۔ علماء کرام تشریف لاتے ہیں تو دینی مسائل پر گفتگو کر کے دل ودماغ کو روشن کرتے ہیں۔ مشائخ عظام کرم فرماتے ہیں تو کئی روحانی اشارے کرتے جاتے ہیں۔ استاد آتے ہیں تو تعلیمی معاملات کو زیر بحث لاتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے شیدائی آتے ہیں تو ''بریلی سے مدینۃ النبی'' کی خبریں سناتے ہیں۔ بعض ایسے حضرات بھی چلے آتے ہیں جو ہمارے کان کھاتے جاتے ہیں۔ ایک دن ہمارے ایک بڑے پرانے باتونی واقف کار آگئے ہمارے کان کھاتے گئے۔ ہم نے شکایت کی تو ہمارے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہنے لگے ''ماشاء اللہ ابھی تو صحیح سلامت ہیں''۔

یہ تو ہمارے کرم فرما تھے جن کا ہم نے ذکر کیا مگر آج ہم بولتی کتابوں کی باتیں کریں گے۔ یہ باتیں ہمارے ان قارئین کے لیے بیان کی جارہی ہیں جو کتاب سے محبت کرتے ہیں کتاب دوست ہیں، کتاب کو رفیق زندگی سمجھتے ہیں، کتابیں پڑھتے ہیں، کتابیں تلاش کرتے ہیں، کتابیں خریدتے ہیں اور اس وقت تک سوتے نہیں جب تک کتاب پڑھ نہ لیں۔

ڈاکٹر پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب مظہری ایم اے، پی ایچ ڈی، عالم دین بھی ہیں اور کتاب دوست بھی۔ ان کی ساری عمر عزیز کتابوں کے خیابانوں میں گزری ہے صاحب تصانیف بزرگ ہیں ''ماہر رضویات'' ہیں اور ''سلسلہ نقشبندیہ'' کے شیخ طریقت ہیں۔ ان کی سرپرستی میں چھپنے والی عظیم الشان کتاب سامنے آئی ''جہانِ مجدد الف ثانی'' سات جلدوں پر مشتمل ہے حضرت سیدنا مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی

رحمۃ اللہ علیہ کے احوال وآثار کا انسائیکلوپیڈیا بن کر سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب ''نور علیٰ نور'' کے خوبصورت اختتامیہ پر مکمل ہوئی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی پر بڑی ضخیم کتاب، بڑی قیمتی کتاب، صدیوں زندہ رہنے والی کتاب، ورق ورق بولنے والی کتاب، حضرت مجدد پر ہزاروں لکھی جانے والی کتابوں پر بھاری کتاب۔

پھولوں کی ہیں ہزار زبانیں مگر خموش
بلبل کا ایک دل ہے مگر بولتا ہوا

پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد ہمارے کرم فرما ہیں صاحب علم وقلم ہیں۔ دنیائے علم وادب کے درخشندہ ماہتاب ہیں۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے شاگرد رشید مولانا ظفر الدین رضوی ''فاضل بہار'' کے نامور فرزند ہیں، کتابی دنیا کے معروف کتاب شناس ہیں۔ آپ نے ایک خصوصی ڈاک کے ذریعہ غالب انسٹیٹیوٹ نئی دہلی کی چھپی ہوئی ایک کتاب ''پروفیسر مختار الدین محقق اور دانشور'' عطا فرمائی۔ آپ کے احباب نے آپ کی علمی وادبی خدمات پر زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ کتاب بولتی گئی ہم کان لگائے سنتے گئے اور آنکھ کے جھروکوں سے چہرۂ یار دیکھتے گئے:

رکھ رکھا اس آنکھ کا دیکھ
چُپ کی چُپ اور بات کی بات

پروفیسر محمد اقبال مجددی ایک محقق ودانشور ہیں۔ انہوں نے تیس سالہ محنت شاقہ سے ''مقامات معصومی'' کی چار جلدیں مرتب کیں۔ یہ کتاب ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی۔ حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند ارجمند خواجہ محمد معصوم مجددی سرہندی کے احوال وآثار پر مشتمل ہے مگر فاضل مرتب نے حضرت مجدد الف

ثانی کے خانوادہ مجددیہ کی علمی اور روحانی تاریخ مرتب کردی ہے۔ کتاب کا صفحہ صفحہ بزرگوں کی زبان بولتا ہے۔ ورق ورق سرہند کی باتیں کرتا ہے۔ شہر سرہند کے عروج کی باتیں، شہر سرہند کے زوال کی باتیں بتاتا ہے۔

من به هر جمعیتے نالاں شدم
جفت خوش حالاں وبدحالاں شدم

بہار (انڈیا) کے ایک دانشور علامہ محمد جابر شمس مصباحی ہمارے رضویات کے معروف سکالر ہیں، ہمارے دوست ہیں، کرم فرما ہیں۔ انہیں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مکتوب نگاری سے دلی لگاؤ ہے۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت کے مکتوبات کی تلاش میں برصغیر کے گوشے گوشے کا سفر کیا۔ جہاں کہیں سے انہیں اعلیٰ حضرت کے مکتوبات ملے جمع کیے، مرتب کیے اور ''کلیات مکاتیب رضا'' کے نام سے دو ضخیم جلدیں تیار کیں، شائع کیں اور سیکڑوں مکتوبات جمع کر کے قارئین کتاب کو احساس دلایا جیسے اعلیٰ حضرت کا مکتوب انہیں کو مخاطب کر کے لکھا گیا ہو۔ مولانا شمس مصباحی کی یہ کتاب مکتب رضا کے دروازوں پر دستک دیتی ہے۔

کہ من سی پارۂ دل میں فروشم !

مولانا محمد اشرف مجددی ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کے استادوں کے شہر سیالکوٹ میں رہتے ہیں۔ ہمارے دوست ہیں۔ وہ سیالکوٹ سے لاہور آئے اور ''مکتوبات امام ربانی'' فارسی کے دفتر اول کا خوبصوت تحفہ عطا فرماتے ہوئے اپنے مجددی ہونے کا ثبوت دے کر چلے گئے۔ یہ تحفہ دراصل ان مکتوبات امام ربانی کا عکس جمیل ہے جسے مولانا نور احمد مجددی پسروری ثم امرتسری نے

اپنے گراں قدر حواشی کے ساتھ آج سے سو سال قبل ''مطبع مجددی امرتسر'' سے شائع کیا تھا۔ بڑی خوبصورت کتاب، بڑی دلنشین تحریر ایک عرصے سے نایابی کی وادیوں میں گم ہو گئی تھی دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں، آستانہ حبیبیہ گجرات کے صاحبزادہ سید محمد مسعود احمد انور حبیبی صاحب نے بڑی ہمت کر کے اس گوہر گم گشتہ کو چکا کر ''بازارِ نقشبنداں'' کی رونق بنا دیا۔ ہم مولانا محمد اشرف مجددی کا شکریہ ادا کریں۔ صاحبزادہ مسعود احمد انور حبیبی کو داد دیں یا ڈسکہ کے حاجی غلام رسول و حاجی خلیل احمد صاحبان کو مبارک دیں جو اس کتاب کی اشاعت کا شوق لے کر ہمارے مشورے لیا کرتے تھے۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد بریں پردۂ تقدیر پدید

مولانا رضاء الدین صاحب صدیقی عالم دین ہیں۔ صوفی باصفا ہیں۔ زاویہ نشین ہیں۔ وہ ایک دن اپنے ''زاویہ'' سے نکلے۔ لاہور کے ایک پانچ ستاروں والے ہوٹل میں حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ ازہری (صاحب تفسیر ضیاء القرآن ومؤلف ضیاء النبی ﷺ) ﷺ کی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے اہل علم وفضل کو دعوت گفتار دی، بلند پایہ دانشور بلائے گئے مقالے پڑھائے گئے۔ افکار تازہ سنائے گئے اور یوں ہر ایک کا دل خوش کر دیا۔ پروفیسر حافظ احمد بخش کی تین جلدوں پر مشتمل کتاب ''جمال کرم'' عنایت فرما کر حکم دیا کہ ''یہ بڑے کرم کے ہیں زاویے'' کتاب پڑھی دل خوش ہو گیا۔ پروفیسر حافظ احمد بخش، ایم اے پر رشک آیا۔ پھر خیال آیا یہ کون ہے حافظ احمد بخش؟ جو سنی ہو کر ایک سنی عالم دین کے متعلق اتنی خوبصورت اور مبسوط کتاب لکھ کر علمی دنیا کو صدائے مطالعہ دے رہا ہے؟۔ ہمارے ہاں تو یہ روایت نہیں کہ کسی سنی عالم

دین کی علمی خدمات پر اتنا بڑا کام کیا جائے۔ ہم تو اپنے مرنے والوں کو ''خدا کے حوالے'' کر دیتے ہیں پھر کسی عالم دین کو سپرد خاک کر دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں:

بس نامور بزیر زمیں دفن کردہ اند !

بعض اکابر علماء و مشائخ کی اولاد دین علم سے عاری ہیں اور اپنے بزرگوں کا نام نہیں لیتیں۔ جو ہمارا علمی اور روحانی اثاثہ تھے۔ مگر آج علماء کرام اور بزرگان دین کی اولادیں ان علمی اور روحانی اثاثوں کی حفاظت کے بجائے مغربی ممالک میں اپنے آباؤاجداد کے پھیلے ہوئے شاگردوں اور مریدوں سے نذرانے بٹور کر ''اپنے اثاثے بنانے میں مصروف ہیں۔

صاحبزادگان اپنے آباؤ اجداد کی علمی اور روحانی خدمات پر کتاب لکھنا تو درکنار ان کے اذکار سے بھی جان چھڑاتے ہیں۔ ان کی مسند اور گدیوں پر بیٹھ کر ''نذرانے'' اکٹھے کرتے رہتے ہیں۔ دیکھیے ہمارے دیکھتے دیکھتے کتنے نامور خطیب، کتنے عالی شان علماء، کتنے مقتدر مشائخ چلے گئے۔ ان پر نہ کوئی آنسو بہانے والا ہے نہ ان کے علمی کمالات پر قلم اٹھانے والا ہے۔ مولانا نورانی ''نور'' تھے۔ مولانا احمد سعید کاظمی ''غزالی زماں'' تھے۔ مولانا محمد عمر اچھروی ''مناظر اسلام'' تھے، مولانا سید احمد قادری ''ابوالبرکات'' تھے۔ غازی کشمیر مولانا سید محمد احمد قادری ''ابوالحسنات'' تھے، مولانا غلام محمد ترنم ''بے مثال خطیب'' تھے، مولانا عبدالغفور ہزاروی ''شیخ القرآن'' تھے، صاحبزادہ فیض الحسن ''خطیب زماں'' تھے، مولانا عبدالستار خاں نیازی ''مجاہد ملت'' تھے مفتی احمد یار خان نعیمی ''مفسر قرآن'' تھے۔ یہ ہمارے اثاثہ تھے۔ علمی اور روحانی دنیا کی عظیم الشان کتنی ہستیاں چلی گئیں، کتنے آفتاب و ماہتاب غروب

ہو گئے۔ علی پور سیداں کے دو جماعت علی تھے۔ ایک ''لاثانی'' ایک ''امیر ملت'' تھے۔ حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی ''فخر چشتیاں'' تھے حضرت سلطان باہو ''سلطان الاولیا'' تھے کس کس کا نام لیں کس کس آفتاب و ماہتاب کا ذکر کریں، ہائے یہ کن جانشینوں کے ظلمت کدوں میں چھپ گئے کتنے گنجہائے گرانمایہ زیر زمیں چلے گئے۔ ہمیں حافظ احمد بخش کی کتاب ''جمال کرم'' کی تین جلدیں دیکھ کر خیال آتا ہے کہ یہ کون شخص ہے؟ کس مکتب کا بندہ ہے؟ کس مکتب فکر کا دانشور ہے؟ اس نے یہ کام کر دیا۔ کیوں 'یہ' حرکت'' کی، ہمارے دل نے چپکے چپکے بڑا احتجاج کیا، کہ اسے ''سنی'' ہو کر ایسا کام نہیں کرنا چاہیے تھا پھر دل نے کہا اچھا!

جا چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر !

ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی کو قائم ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں۔ یہ ادارہ امام احمد رضا فاضل بریلی رحمۃ اللہ علیہ پر بے شمار کتابیں چھپوا کر برصغیر میں پھیلا چکا ہے۔ سلور جوبلی کی تقریبات میں اس ادارہ نے بڑی اہم کتابیں شائع کر کے تقسیم کی ہیں۔ ''معارف رضا'' کا شمارہ چار سو صفحات پر محیط ہے ''افکار رضا'' کا شاہکار ہے جہان رضا کا مرقع ہے اور دنیائے رضویت کا خیاباں بن کر آیا ہے۔ سید وجاہت رسول قادری اور ڈاکٹر مجید اللہ قادری صاحبان کی کاوش کی تصویر ہے۔ شاعر رضا، طارق سلطان پوری نے کیا عمدہ شعر کہا:

رضا کے معارف کا آئینہ دار
مجلہ وپاکیزہ وخوش نما

اس صدی کا مجدد کون؟ یہ ایک تازہ موضوع ہے۔ جس پر اپنے علماء کرام اور

ارباب علم و دانش نے خوبصورت کتابیں لکھی ہیں جو ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ہمارے دوست ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی صاحب نے بریلی شریف سے ایک کتاب لکھی۔ اس صدی کا مجدد کون؟ ہمارے ایک اور کرم فرما ''جہان رضا'' سے محبت کرنے والے علامہ محمد نسیم احمد صاحب صدیقی نوری نے کراچی سے ایک کتاب لکھی پھر صاحب قلم وفکر علامہ نور احمد صاحب۔ شہتاز مدیر مجلہ ''فقہ اسلامی'' کراچی نے ایک کتاب، اس صدی کا مجدد کون؟ لکھی۔ ڈاکٹر محمد مسعود احمد مظہری ایم اے، پی ایچ ڈی کے حلقہ تحریر نے اس صدی کے مجدد کی نشان دہی کی۔ ڈاکٹر علامہ محمد طاہر القادری صاحب کے عقیدت مندوں نے بھی اس صدی کے مجدد کے اوصاف بیان فرماتے ہوئے اعلان کیے ''دعوت اسلامی'' کے سبز سر عقیدت کیش مقام مجددیت سے ناآشنا ہوتے بھی اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار بڑی محبت سے کرتے۔ یہ ساری کتابیں ہمارے حلقہ سے آرہی ہیں اور پکار رہی ہیں اہل فکر ونظر کوئی فیصلہ کرلیں بتائیں کہ

اس صدی کا مجدد کون ہے؟

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ''الزبدۃ الزکیہ فی تحریم السجود التحیہ'' کا عربی ترجمہ چھپ گیا۔ ہمارے محترم دوست عزیز خاں صاحب قادری ناظم ''حزب القادریہ'' جی بلاک ۲۲۲ گلشن راوی لاہور اسے ہدیہ دعائے خیر پر تقسیم کر رہے ہیں۔ یہ کتاب عرب ممالک کے لیے لکھی گئی ہے پاکستان میں عربی جاننے والے علماء کرام یہ کتاب مفت حاصل کریں۔

کتابے خوب دادم جاں خریدم
بحمد اللہ چہ ارزاں خریدم

فاروق احمد خان یوسف زئی ''جہان رضا'' کے پرانے قارئین میں سے ہیں قائد اعظم ائیر پورٹ کراچی میں پی آئی اے کے کمپیوٹرونگ کے سٹاف آفیسر ہیں۔ نقشبندی سلسلہ طریقت سے وابستہ ہیں انہوں نے ایک خوبصورت کتاب لکھی ہے۔ ''اصطلاحاتِ صوفیہ'' جسے صاحبزادہ ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر صاحب ایم این اے مہتمم رکن الاسلام حیدر آباد کی نظر التفات کی پذیرائی حاصل ہے۔ مشکل اصطلاحات کو صوفیہ کے اقوال کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے کتاب خوبصورت ہے چھوٹی ہے مگر باتیں بڑی ہیں۔

کس نے قطروں کو اکٹھا کر کے دریا بھر دیا!

''معارج النبوت'' ایک باکمال کتاب ہے تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ ملا معین الہروی الکاشفی کی تصنیف ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی سیرت پر لکھی جانے والی معتبر کتابوں میں سے ہے۔ اس کا ترجمہ مولانا محمد اطہر صاحب نعیمی، مولانا محمد اصغر فاروقی اور پیرزادہ اقبال احمد فاروقی نے کیا ہے۔ صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرقپوری نے بتایا کہ حضرت شیر ربانی میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ اس کتاب کو اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔ ''معارج النبوت'' اپنے محبت بھرے انداز میں لکھی گئی ہے اس کے پڑھنے سے نبی کریم سے عشق پیدا ہوتا ہے اس کتاب کو پڑھنے سے پہلے اس کا تتمہ پڑھیں۔ میاں جمیل احمد شرقپوری نے اصل کتاب کا دیباچہ اور تتمہ چھپوا کر ہزاروں لوگوں میں تقسیم کیا تھا۔ آج یہ کتاب مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ لاہور نے نئے انداز سے شائع کی ہے قیمت سات سو روپے رکھی ہے۔

کتاب سے محبت کرنے والے ہمارے ایک دوست امریکہ کی ایک دور دراز

ریاست میں رہتے ہیں، سید منور علی شاہ بخاری۔ انہیں اعلیٰ حضرت بریلوی کی کتابوں سے بڑی محبت ہے جو کتاب چھپتی ہے امریکہ بیٹھے منگواتے ہیں اور ''فیضانِ رضا لائبریری'' کی زینت بنا کر امریکہ میں رہنے والے رضویوں کو دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔

وہ پچھلے دنوں اپنے وطن غور غشتی اٹک آئے اور حضرت خواجہ عبدالرحمن چھوہروی رحمۃ اللہ علیہ کی تیس جلدوں میں مرتب کی ہوئی کتاب ''الصلوٰۃ الرسول'' دیکھی تو تڑپ اٹھے، ہائے حضور سے محبت کرنے والے لوگ تیس تیس جلدوں میں درود شریف کا خزینہ مرتب کرتے ہیں اور چھپواتے ہیں اور اہل محبت کے سینوں کو روشن کرتے رہتے ہیں۔ مولانا محمد اشرف سیالوی نے ترجمہ کیا۔ صاحبزادہ سید طاہر شاہ اور سید صابر شاہ سابق وزیر اعلیٰ سرحد نے بڑے اہتمام سے چھپوائی ہے، یہ کتاب بارگاہ رسالت میں درود پاک کا اتنا بڑا خوبصورت تحفہ ہے جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ تیس جلدوں میں ایک ہزار سے زیادہ درود پاک کا یہ مرقع اپنی مثال آپ ہے۔ ''مکمل مجموعہ صلوات الرسول'' کا ہدیہ 2500 روپے

من چہ گویم شرح وصف ایں کتاب
آفتاب است، آفتاب است آفتاب !

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی امام احمد رضا خاں کے فتاوی رضویہ کا عکس جمیل ''فتاویٰ ملک العلماء'' جسے ملک العلماء مولانا ظفر الدین قادری رضوی رحمۃ اللہ علیہ نے تیار کیا اور مولانا ارشاد احمد رضوی اور پروفیسر طارق مختار نے علی گڑھ سے مرتب کیا اور ''المجمع الرضوی'' محلہ سوداگراں بریلی نے شائع کیا۔ مکتبہ گنج بخش روڈ لاہور سے 300 روپے بھیج کر منگوالیں۔

''رسائل میلاد مصطفیٰ'' مرتبہ مولانا عبدالاحد صاحب قادری رضوی، مطبوعہ قادری رضوی کتب خانہ گنج بخش روڈ لاہور، میلاد پاک پر لکھے جانے والے رسائل کا ترجمہ لے کر سامنے آئے ہیں۔ ان میں علامہ ابن حجر مکی، عماد الدین دمشقی، علامہ سید جعفر برزنجی مدنی، علامہ جلال الدین سیوطی، علامہ عبدالرحمن ابن جوزی، علامہ ملا علی قاری، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی، علامہ نور بخش توکلی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے تاریخی رسائل کے تراجم موجود ہیں۔ مختلف ادوار میں لکھے جانے والے یہ رسائل میلاد رسول کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہیں۔ آپ ایک ہی کتاب میں صدیوں میں پھیلی ہوئی اہل علم و فضل کی تحریریں ایک نشست میں پڑھ سکیں گے۔

جس سہانی گھڑی چمکا طیبہ کا چاند
اس دل افروز ساعت پہ لاکھوں سلام

(''جہانِ رضا'' ماہ جون ۲۰۰۵)

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کا خراجِ تشکّر

مہمانانِ ذی وقار، محترم مشائخِ عظام، علماء کرام، سخنور اور سخن شناس حضرات! آپ لوگوں نے اس ''تقریبِ تحسین'' میں مختصر وقت میں جس طرح میرے ماضی کے نشیب وفراز، دینی وملی خدمات اور قلمی کاوشوں کا احاطہ کیا، میری بھولی بسری یادوں کو تازہ کیا۔ ان لمحاتِ انبساط میں میری جو کیفیت ہے اس کو بیان کرنے کے لیے میرے پاس وہ الفاظ نہیں کہ جن سے میں آپ کا شکریہ ادا کرسکوں جس کے آپ حقدار ہیں۔ حضراتِ گرامی! آپ کی پرخلوص محبتوں کی بوچھاڑ نے مجھے جذباتِ تشکر سے شرابور کردیا ہے۔ ممکن نہیں کہ میں اپنی محبت کا اظہار آپ حضرات سے فرداً فرداً کرسکوں اس لیے کہ میں اس محفل میں وقت کی تنگ دامانی کا شکار ہوں۔ ویسے بھی اظہارِ محبت کے لیے وقت کی قید ہمیشہ سدراہ اور جذبات کی روبے کنار ہوتی ہے۔

جن اہل علم ودانش نے مجھ پر کرم فرمایا۔ بے شمار علماء وطلبہ نے اپنی تشریف آوری سے خوش کام کیا، دور ونزدیک سے آنے والوں نے اپنی محبت کا اظہار کیا پھر فرطِ محبت اور جس حسن کلام سے مجھے نوازا گیا اس کے لیے میں صرف اتنا کہوں گا کہ مجھے تو لوٹ لیا مل کے علم والوں نے، مجھے تو لوٹ لیا مل کے سخن والوں نے، مجھے تو لوٹ لیا مل کے حُسن والوں نے۔

''ہجویری فاؤنڈیشن'' کے بانی وچیئرمین میاں محمد سلیم حماد ہجویری سجادہ نشین حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھ جیسے عاجز بندے

کی قدرافزائی کے لیے یہ محفل سجائی اور آپ جیسے اہل محبت کو جمع کیا۔ میاں صاحب سے میرا تعلق چار عشروں پر محیط ہے۔ یہ ہمیشہ مجھ سے مہر ومحبت سے پیش آتے ہیں۔ جب میں ۱۹۹۲ء کو حج پر گیا تو میاں صاحب میرے رفیق سفر تھے۔ یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں لیکن محبت وخدمت میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ اگرچہ میں آدابِ مناسکِ حج سے بخوبی واقف تھا لیکن انہوں نے محبت وخدمت کے جذبات میں دوران حج میری انگلی پکڑ کر مناسکِ حج ادا کروائے۔ آپ اندازہ کریں کہ میاں صاحب صاحبانِ علم وادب سے کس قدر محبت اور ان کی قدرافزائی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے اور ان سے ہماری رفاقت قائم ودائم رکھے۔

مولانا صلاح الدین سعیدی صاحب! اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے آپ نے میری بہت خدمت کی ہے اور اس محفل کو منعقد کرنے میں تن من سے جس گرم جوشی کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ آپ نے چند برسوں میں نہ صرف میری قلمی کاوشوں کا مطالعہ کیا بلکہ میرے بکھرے ہوئے قلم قتلوں کو جمع کر کے ایک کتابی صورت میں پیش کیا۔ جس کا نام ''باتوں سے خوشبو آئے'' رکھا۔ اس کتاب کی تقدیم میاں محمد سلیم حماد ہجویری صاحب نے تحریر کی جس میں ''ماہنامہ جہانِ رضا'' کے اداریوں سے اپنے ذوق کے مطابق چیدہ چیدہ اقتباسات پیش کیے جن کو پڑھ کر قارئین کے ساتھ ساتھ بندہ خود بھی محظوظ ہوتا ہے۔ سعیدی صاحب کی اس کاوش کے بعد کتاب دوست دانشور محمد عالم مختار حق صاحب نے ''ماہنامہ جہانِ رضا'' لاہور کی ۱۹۹۱ء سے دسمبر ۲۰۰۵ء تک کے اداریوں کا گلدستہ ''فکر فاروقی'' کے نام سے شائع کیا۔ (جو زیور طباعت سے آراستہ ہوکر مارکیٹ میں آچکا ہے) بندہ ان کاوشوں

کی قدر کرتا ہے، سپاس گزار ہے، ممنون ہے مفتون ہے۔اللہ تعالیٰ میرے قدردانوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

مولانا کوکب نورانی میرے مہربان بھی ہیں اور قدردان بھی، وہ ایک ممتاز خطیب بھی ہیں اور بلند فکر ادیب بھی۔ میں ان کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں۔۔ خصوصی طور پر چند گھنٹوں کے لیے کراچی سے ہوا کے دوش پر محض میری محبت میں اڑے چلے آئے اور یہاں تشریف لاکر محفل کی رونق کو دوبالا کیا اور اپنے محبت بھرے حُسن کلام کا سحر پھونک کر ہم سب کو متوالا کیا۔ان کا بیان ارباب علم وفضل کے لیے گل بداماں تھا مگر میرے لیے دل کی جان تھا۔انہوں نے جن الفاظ اور انداز میں مجھے نوازا، جس ادا سے مجھے خوش کام کیا اس پر ''اگر جاں فشانم رواست''۔

میرے دیرینہ دوست جسٹس (ر) ڈاکٹر منیر احمد مغل صاحب نے کرم فرمایا کہ وہ اپنی بے پناہ مصروفیات سے دامن چھڑا کر یہاں تشریف لائے اور اپنا قیمتی وقت دے کر اس محفل کو چار چاند لگا دیئے۔مغل صاحب ساری زندگی کتاب دوست رہے۔کتاب دوستی، مطالعہ کا شوق اور کتابیں لکھنا ہم دونوں میں قدر مشترک ہے۔جس کے سبب ہم میں ایک قرب پیدا ہوا، اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔یہ جب بھی میرے پاس آتے میری علمی خدمات کو سراہتے۔ ماشاء اللہ یہ قربت آج تک قائم ہے۔آپ قانون اور عدل وانصاف کی ذمہ داریاں سنبھالتے اور نبھاتے رہے۔تب سے اب تک ان کی اہلیت وقابلیت اور حق گوئی کا شہرہ رہا اور آپ بدعنوانیوں سے پاک شہرت عام رکھتے ہیں۔ جوانی سے ہی مرد درویش ہیں۔فرض شناسی اور عجز وانکساری کے پیکر ہیں۔

جب آپ جج تھے اور میں بھی سرکاری افسر تھا، ان دنوں میرے ایک جاننے والے میرے پاس آئے اور بتایا کہ مغل صاحب نہ سفارش مانتے ہیں نہ دباؤ میں آتے ہیں لیکن میں اپنے ایک جائز کام کے سلسلہ میں مغل صاحب سے آپ کے واسطے سے رسائی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان کو تسلی دی اور کہا یہ بات درست ہے کہ مغل صاحب کسی کی سفارش نہیں سنتے اور فیصلہ حق وانصاف پر کرتے ہیں۔اس کے باوجود میں اس خیال میں ڈوبا کہ منیر مغل کسی کی سفارش سنے یا نہ سنے میری ضرور سنیں گے، میں مغل صاحب کے گھر پہنچا۔ان سے بات کی تو وہ مسکرائے اور کہا کہ میں اس کیس کا فیصلہ چار یوم قبل میرٹ کے مطابق لکھ چکا ہوں اور آپ کے لیے خوشخبری ہو کہ میرا فیصلہ آپ کے جاننے والوں کے حق میں ہوا ہے۔یہ سنتے ہی میں خوشی سے جھوم اٹھا اور میں سوچنے لگا کہ سبحان اللہ یہ کیسا درویش جج ہے جو

''سوالی کے سوال سے پہلے ہی سوالی کی جھولی بھر دیتا ہے''

حضراتِ محترم! میاں محمد سلیم حماد ہجویری صاحب جو''ہجویری فاؤنڈیشن'' کے روح رواں ہیں، غریبوں اور ادیبوں کو نوازتے رہتے ہیں۔جرائد اہلسنت میں قلمی ومالی تعاون، خصوصاً ماہنامہ ''جہانِ رضا'' کے پھلنے پھولنے میں ہر قسم کی معاونت فرماتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ آپ نے ۱۷/اپریل ۲۰۰۵ء کو اپنے ۹۱ویں سالہ استاد ابو الطاہر فدا حسین فدا (متوفی ۸ فروری ۲۰۰۶ء) کی قدر افزائی کے لیے ان کے اعزاز میں ایک خوبصورت محفل ''ایک شام فدا کے نام'' سجائی تھی جس میں حضرتِ فدا کی ہمہ جہت خدمات کا اعتراف اور ان کی شخصیت وفن پر تحقیقی مقالات پڑھے گئے تھے۔فدا صاحب کی انعام واکرام اور ایوارڈ حسن کارکردگی سے قدر افزائی کی گئی۔اس تقریب

کے دس ماہ بعد فدا صاحب فوت ہو گئے۔ بعض لوگوں نے مجھے کہا ڈروان اللہ والوں سے، ڈروان صاحب زادگان سے یہ جس کی تقریب کرتے ہیں ان کو عالم بقا کا راستہ دکھا دیتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں کو کہا:

ڈرانہ موت سے ہم کو جو کل آتی ہے آج آئے
ہمارے ساتھ کھیلی ہے ہماری دیکھی بھالی ہے

موت کے ذکر سے مجھے یاد آیا جب میں حج پر گیا تو مکہ میں میرے ایک قدردان دوست نے مجھے اور میاں صاحب کو دعوت پر اپنے گھر بلایا۔ وہاں میں نے شلفوں میں پڑے درجنوں کفن دیکھے پوچھا تو پتا چلا کہ کفن ان مستحق لوگوں کو دیے جاتے ہیں جو سفر حجاز میں غربت کی حالت میں فوت ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنے میزبان کو کہا کہ مجھے حج کے دوران مدینہ منورہ میں مرنے کی تمنا تھی لیکن یہ پوری ہوتی نظر نہیں آتی لہذا مجھے کفن دے دو۔ اس نے دے دیا۔ دو سال کے بعد میرا دوست لاہور میں میرے گھر آیا، کفن کا ذکر ہوا تو میں نے اسے کہا عزرائیل آتا ہے مکہ سے آیا ہوا کفن دیکھتا ہے لیکن مجھے نظر انداز کر کے نکل جاتا ہے۔ کفن پڑا پڑا میلا ہو گیا ہے۔ اب اگر آؤ تو ایک تازہ کفن مدینہ شریف سے بھی لیتے آنا۔

آج آپ حضرات نے مجھے عمر خضر کی دعائیں دی ہیں۔ آپ نے اپنی محبتوں کا آبِ حیات پلایا ہے۔ آپ کی دعاؤں سے میں پھر جوان ہو گیا ہوں۔ مگر میری تمنا ہے کہ میرے لیے موت نے آنا ہے تو مدینہ میں آئے دیار نبی ﷺ میں آئے:

آزردہ مر کے کوچہ جاناں میں رہ گیا
دی تھی دعا کسی نے کہ جنت میں گھر ملے

جسے جنت میں گھر مل جاتا ہے وہ موت کی وادی کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

حضراتِ گرامی! میں زندگی کی ایک سال کم اسی (۸۰) بہاریں دیکھ چکا ہوں مجھے زندگی بھر علمائے کرام کی مجالس میں بیٹھنے کا موقع ملا اور مشائخ وقت کی خدمت کرنے کی سعادت حاصل رہی۔ کاروبار دنیا کیساتھ ساتھ مجھے علم و عرفان کی صحبتیں بھی میسر رہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی ایک ایسے گلستان میں گزری، جہاں دور دور تک علم و فضل کے پھول کھلے ہیں اور ہر پھول اپنے رنگ و بو سے جدا جدا میرے دل و دماغ کی آبیاری کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس موضوع پر میں نے قلم اٹھایا اہل علم و دانش نے پسند کیا اور پذیرائی فرمائی۔ درجنوں کتابوں کے تراجم اور میری دیگر قلمی کاوشوں کو جو مقام دیا جاتا ہے وہ میرے قلم کی طاقت کو برقرار رکھنے میں مدد کرتا ہے۔

آج سے چالیس برس قبل میرے ایک عزیز دوست حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم نے اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مظلوم نابغہ روزگار کے نظریات و افکار جو اہلسنت و جماعت کی اعتقادی ضمانت تھے کو برصغیر پاک و ہند میں پھیلانے کے لیے ایک مہم چلائی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بیس لاکھ کتابیں چھپوا کر مفت تقسیم کیں اور سینوں کو بیدار کیا۔ ہر طرف "مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام" کے دلنواز نغمے گونجنے لگے۔ مجھے بھی حکیم صاحب مرحوم کے اس مشن نے بہت متاثر کیا اور میں ان کا دست و بازو بن گیا۔ حکیم صاحب مرحوم کی قائم کردہ "مرکزی مجلس رضا" کا نگران بن گیا۔

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں گزشتہ بیس سال سے امام اہلسنت اعلیٰ حضرت

فاضل بریلوی کے نظریات وافکار کی نشر واشاعت میں مصروف ہوں۔ میری ان کوششوں کو اہلسنت عوام وخواص نے بڑا سراہا، تعاون کیا۔اس طرح مجھے ماہنامہ ''جہانِ رضا'' کی وساطت سے دنیا کے گوشے گوشے تک رسائی حاصل ہوئی اور میرے قلم کی آواز پاک وہند کے علاوہ دنیائے اسلام کے کونے کونے تک پہنچ رہی ہے۔آج کی یہ تقریب دراصل میری حقیر خدمات کا اعتراف ہے۔آپ لوگوں نے یہاں آکر میری قدر ہی نہیں کی بلکہ اپنے اعتقاد ومسلک کی قدر کی ہے۔ایک عاشق رسول ﷺ اعلیٰ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی قدر کی ہے۔

آج اس موقع پر جہاں بڑے بڑے بلند پایہ اہل علم وقلم اور مقتدر علماء اہلسنت تشریف فرما ہیں سے اپیل کروں گا کہ آپ اپنے آقا ومولیٰ سرکار دو عالم ﷺ کی بارگاہ میں ہدیۂ عقیدت ومحبت پیش کرنے کے لیے آگے بڑھیں، بداعتقادی اور مغرب کی نام نہاد روشن خیالی کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے اپنا اپنا بھرپور اور موثر کردار ادا کریں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

حضرات محترم! میرے بہت سے ایسے دوست بھی یہاں موجود ہیں جنھوں نے مجھے محبت کے گھونٹ پلائے ہیں۔صاحبزادہ محب اللہ نوری صاحب بصیر پور سے تشریف لائے ہیں۔جناب عبدالمجید اولکھ صاحب امریکہ سے، محترم ظہور احمد فاروقی صاحب لندن سے آئے ہیں۔جسٹس (ر) ڈاکٹر منیر احمد مغل صاحب میری خاطر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آگئے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی صاحب، ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب اور ڈاکٹر طاہر رضا بخاری صاحب آئے ہیں۔علامہ منیر احمد یوسفی صاحب اور پیر محمد حسن گیلانی صاحب آئے ہیں۔ میرے حبیب جیبی آئے ہیں۔

میرے عزیز عطاء الرحمٰن اور پروفیسر کعبی صاحب آئے ہیں۔ یہ سب اس مسکین پر محبت وخلوص کے پھول برسانے آئے ہیں۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ ایسے ایسے علماء کرام اور مشائخ عظام یہاں تشریف فرما ہیں جنہیں دیکھ کر میری آنکھیں جگمگا اٹھی ہیں۔ میں ڈاکٹر اشرف آصف جلالی صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مدینہ شریف سے ٹیلی فونک خطاب میں میری قدردانی کی۔ میں کس کس کا ذکر کروں کس کس کا نام لوں اور کس کس کا شکریہ ادا کروں۔ بندہ ان لوگوں کا بھی شکر گزار ہے جو آنے کے لیے پابہ رکاب بیٹھے تھے لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بناپر تشریف نہ لاسکے۔اللہ تعالیٰ آپ سب کو شاد کام کرے۔

(''جہانِ رضا'' ماہ جنوری، فروری ۲۰۰۷ء)

شہر محبت کا تھیلا

جن دنوں ہمیں ''شہرِ محبت'' مدینہ منورہ کی حاضری نصیب ہوئی ہم نے ایک بڑا سا تھیلا اپنے گھر میں لے رکھا تھا۔ سارا دن ''شہرِ محبت'' کی گلیوں میں گھومتے گزر جاتا، ساری رات دربارِ مصطفیٰ میں کٹ جاتی۔ کئی لوگ ملتے بڑے پیار سے ''سلام علیک، علیک سلام'' کہتے۔ بعض رک جاتے، ہاتھ پکڑ لیتے، پیار سے بات کرتے۔ بعض جیب سے عطر کی شیشی نکال کر ہماری جیب میں ڈال دیتے۔ بعض کھجور کی چھوٹی سی ڈبیہ دیتے وقت کہتے ''یہ یمنی ہیں''۔ بعض چپکے سے باداموں کی گریاں واسکٹ کی جیب میں ڈال دیتے۔ بعض ہمارے دانتوں کی کمزوری اور ناتوانی کا خیال کرکے ''کاجو'' سے نوازتے۔ ایک دوست نے انجیروں کی ایک خوبصورت ڈبیہ جیب میں ڈال کر کہا ان کا ذکر تو قرآن میں آیا ہے، یہ قبول کرلو اور رومی کے شعر کا ایک مصرع سناؤ۔ ''طعمہء ہر مرغکے انجیر نیست'' ایک مہربان نے گھڑی عنایت کرتے ہوئے کہا ''یہ تو میں نے صرف آپ کے لیے ہی خریدی تھی''۔ ایک نے ہماری ''ریش بے ترتیب'' دیکھی تو بڑی خوبصورت کنگھی عنایت کی اور فرمایا کہ یہ ہر وقت اپنی جیب میں رکھا کریں۔ زلفیں نہ سہی داڑھی کو ''منت پذیر شانہ'' کرلیا کریں۔ ہم مدینے کی گلیوں کی ساری عنایتیں قبول کرتے جاتے اور گھر آکر اس بڑے تھیلے میں جمع کرتے جاتے اور دل میں کہتے انہیں لاہور جا کر کھولیں گے۔ جب ہم لاہور آئے تو بچوں نے ''شہرِ محبت کا تھیلا'' کھولا، مدینے والوں کی عنایتوں سے دل خوش کرکے پوچھتے:

آنے والو! یہ تو بتاؤ شہر مدینہ کیسا ہے؟

شہر محبت کا تھیلا ہمیں اس وقت یاد آیا جب ہمارے عزیز محترم ملک محبوب الرسول قادری نے اپنے مجلّہ ''انوارِ رضا'' ''بیادِ رفتگاں'' کا خصوصی شمارہ عنات فرمایا۔ اس شمارے میں کئی مضامین، کئی شخصیات، کئی موضوعات کے گلہائے رنگا رنگ ۱۷۶ صفحات میں سجا کر ہمیں دعوتِ مطالعہ دی۔ ''رضائے مصطفیٰ'' کے مدیر شہیر کی ناصحانہ تنبیہ کے علی الرغم ایسے ایسے نورانی چہروں کی خوبصورت تصویریں لٹکا دیں کہ ''بن دیکھے نہ بنے'' ایسے ایسے لوگوں کا تذکرہ کر دیا ''اب جن کے دیکھنے کو اکھیاں ترستیاں ہیں'' ایسے ایسے بزرگوں کو سامنے لا کھڑا کیا جو علیین میں آرام فرما ہیں۔ ایسے ایسے احباب کا ذکر کر دیا جو پاکستان کے گمنام گوشوں میں کنج گرفتہ ہیں۔ ہمیں ان کی یہ روش اچھی لگی۔ پھر ''شہرِ محبت'' سے لایا ہوا تھیلا یاد آیا تو دل کو تسلی ہوئی کہ اپنا قلم بھی اگر اپنے بکھرے بکھرے احباب، بے سروپا واقعات اور بے نمک حکایات کو بیان کردے تو ہمیں کون روک سکتا ہے۔

پچھلے ماہ ہماری طبع علیل طبیبوں کے مشورے کی زد میں آگئی اور آپریشن کے گوشے میں جا پہنچی آپریشن تو کامیاب رہا، مگر تیمارداروں کا تانتا بندھ گیا۔ ہسپتال میں، گھر میں، مکتبہ میں، ''جہانِ رضا'' کے دفتر میں، ''مرکزی مجلس رضا'' کے اجلاس میں جہاں جہاں گزر ہوتا بیمار پرسی کرنے والوں کے جمگھٹے لگ جاتے۔ ڈاک میں خط آئے۔ لمبی عمر کی دعائیں آئیں۔ بعض خطوں میں ''عمرِ خضر'' کی عنایات آئیں۔ صحت یابی پر اظہارِ تشکر ہوا۔ ایک عزیز نے تو بکرا لے کر صدقہ دیا۔

یہ عظمتیں ہیں مقدر کسی کسی کیلیے!

ایک محبت والے دوست نے اتنی ''صداقت'' کا اظہار کیا اور لکھا کہ نورانی

صاحب چلے گئے۔ مفتی عبدالقیوم ہزاروی چلے گئے۔ مولانا ظفر نعمانی چلے گئے۔
علامہ عبدالکریم ابدالوی چلے گئے۔ الحاج محمد اسلم مراڑیاں والے چلے گئے۔ فاروقی
صاحب! آپ بھی کسی سے کم تو نہیں؟

تم نہیں چلتے رضا سارا تو سامان گیا!

ہمیں بیمار پرسی کا یہ انداز بھی بڑا پسند آیا۔ ان کی سادگی سے حوصلہ ملا۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مظہری صاحب کراچی سے لاہور آئے۔ وہ ان
دنوں ''جہان مجدد الف ثانی'' کی کئی جلدوں کی طباعت میں مصروف ہیں۔ میاں جمیل
احمد شرقپوری مدظلہ العالی غریب خانہ پر تشریف لائے اور ڈاکٹر محمد مسعود احمد مظہری کی
خدمت میں لے گئے۔ میاں صاحب بھی ان دنوں حضرت مجدد الف ثانی پر تحریری کام
کر رہے ہیں۔ انگریزی میں ''شیر ربانی ڈائجسٹ'' شائع کیا ہے کچھ شمارے ہمیں
عنایت فرمائے۔ کچھ شمارے ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب کو دیے۔ اس طرح ہم خاک
نشینوں کو ''دو اولیائے نقشبند'' کی مجلس میں بیٹھنے کا موقع مل گیا۔

عزیز محترم صاحبزادہ محب اللہ صاحب نوری چیف ایڈیٹر ماہنامہ ''نور
الحبیب'' علامہ احمد علی صاحب قصوری کے ساتھ بیمار پرسی کا بہانہ بنا کر کرم فرما ہوئے۔
بڑی عمدہ باتیں کیں۔ اپنے رسالے کی طرح پیاری پیاری اور میٹھی میٹھی باتوں سے
دلجوئی کرتے رہے۔ سنیوں کے موجودہ انتشار پر دلسوزی کے ساتھ اپنے جذبات کا
اظہار کیا۔ سنیوں کے بے منزل قافلے اور بے نشان کاروانوں کا تذکرہ کرتے رہے۔
پھر اتفاق واتحاد کی راہوں پر نہ چلنے والے جواں سال علماء اور صاحبزادوں پر گفتگو
کرتے رہے مگر اپنی ناکامیوں اور ان کی ''نامانیوں'' پر بات ختم ہوگئی۔

وہ کم سن ہیں ضدیں ہیں نرالی ان کی   اس پہ مچلے ہیں کہ ہم درد جگر دیکھیں گے

قائد اہل سنت الشاہ احمد نورانی صدیقی کی رحلت کیا ہوئی ملک میں کہرام مچ
گیا۔ اپنے بیگانے سب سراپا غم بن گئے۔ اخباریں، رسالے میگزین اور
کتابیں چھپیں، اپنے اپنے انداز میں سب نے اظہار غم کیا۔ مولانا کی موت پر کتابیں
لکھی گئیں ایک ہزار سے زیادہ تعزیتی جلسے ہوئے۔ دس ہزار سے زیادہ قرآن پاک ختم
ہوئے کتنے لاکھ بار قل ھو اللہ پڑھا گیا کتنے کروڑ کلمہ طیبہ کا ورد رہا۔

یاد دارم کہ وقت رفتن او   ہمہ گریاں بدند واو خنداں

بعض مہربان حضرات نے ہماری بیماری کی تکالیف کو آسان کرنے کیلیے کئی
تحفے بھیجے۔ علامہ کوکب نورانی نے پروفیسر شفقت رضوی کی کتاب ''نعت رنگ کا تجزیاتی
وتنقیدی مطالعہ'' عنایت فرمائی۔ عزیز محترم علامہ محمد عمر حیات الحسین صاحب بوسن نے
مولانا محمد بوستان القادری کی حیات پر ''گلہائے رنگارنگ'' دی۔ صاحبزادہ محمد سلیم شامی
نے ''تذکرہ شیخ عبدالنبی شامی'' عنایت فرمایا۔ بمبئی کے ایک دوست نے حضرت ''خواجہ
نقشبند اور طریقت نقشبندیہ'' بھیجی۔ الاشرفیہ مبارک پور ''انڈیا'' کے ایڈیٹر نے اپنی
خوبصورت تصنیف ''افتراق بین المسلمین کے اسباب'' بھیجی۔ دہلی سے کنزالایمان کا
''شارح بخاری نمبر'' آ گیا۔ الاشرفیہ مبارک پور ''انڈیا'' نے ''سیدین نمبر'' کی کئی جلدیں
بھیج دیں۔ ''افکار رضا'' ممبئی سے آ گیا۔ صاحبزادہ سلیم حماد نے ''فاتح قلوب عنایت کی۔
پیرزادہ حفیظ البرکات نے محدث کچھوچھوی کا اردو ترجمہ قرآن کا ایک نفیس نسخہ عطا فرمایا۔
شاہ احمد نورانی صدیقی پر جاوید اقبال فاروقی صاحب کی کتاب ''قائد تحریک نظام مصطفیٰ
'' اور ملک محبوب الرسول نے ''انوار رضا'' کا ''قائد ملت اسلامیہ نمبر'' تحفہ میں دیا۔ میاں

جمیل احمد شرقپوری نے ''شیر ربانی ڈائجسٹ'' انگریزی میں چھپوا کر عنایت فرمایا۔ صاحبزادہ میاں زبیر نے جلال الدین ڈیروی کی کتاب ''سیرت گنج بخش بعد از وصال'' دی۔ یہ تھیں وہ مٹھائیاں جو ہمارے احباب نے ہمارے بستر علالت پر پہنچائیں اور یہ تھے وہ انعامات جن سے ایک نحیف ونزار بیمار کو نوازا گیا۔

صفر کا مبارک مہینہ آیا۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کی تقاریب نے لاہور کو درخشاں کر دیا۔ صاحبزادہ محمد عثمان نوری نے ''نوری مسجد'' ریلوے اسٹیشن میں ''یوم رضا'' منایا۔ وسن پورہ میں مولانا اللہ دتہ کی مسجد میں ''فکر رضا'' کانفرنس ہوئی۔ کنز الایمان سوسائٹی لاہور نے الحمراء لاہور میں ''یوم رضا'' منایا۔ دار العلوم نعمانیہ میں ''یوم مجدد الف ثانی'' کی تقریب ہوئی۔ جامع مسجد داتا گنج بخش میں صاحبزادہ محمد مصطفیٰ اشرف اور پیر محمد افضل قادری کے زیر اہتمام ''فکر رضا'' کانفرنس ہوئی۔ جمعیت علماء پاکستان نے مینار پاکستان کے زیر سایہ ''میلاد کانفرنس'' کی اور شاہ احمد نورانی کی یاد میں ایک عظیم الشان جلسہ کیا۔ قاری زوار بہادر نے اپنی جامع محمدیہ گلبرگ لاہور میں جمعیت علمائے پاکستان کے کارکنوں کو اعزازیہ دیا۔ ہمیں ان تمام تقاریب کے دعوت نامے ملے مگر کہیں بھی حاضر نہ ہو سکے۔ تقاریب کے منتظمین نے ہماری غیر حاضری پر خفگی کا اظہار نہ کیا اور کہا جا چھوڑ دیا یار کو بیمار سمجھ کر!

وہ تھا ہمارا ''شہر محبت کا تھیلا'' اور یہ ہے ہمارے ''شب و روز کا کشکول'' ناظرین کرام کو جو چیز پسند آئے پڑھ لیں۔ نہ پسند آئے تو نظر انداز کر دیں۔ ہمیں کوئی گلہ نہیں ہوگا۔

(''جہانِ رضا'' لاہور۔ اپریل ۲۰۰۴ء)

بارگاہِ نور میں ایک ثناخوان رسول سے چند لمحاتی نشست

رمضان المبارک کے مہینہ کا آغاز ہوتا ہے تو اہل محبت کے کاروان شہر محبت کا رخ کر لیتے ہیں۔ جہازوں کی پروازیں پاکستان کے گوشے گوشے سے روانہ ہوتی ہیں اور صلوٰۃ وسلام کی جانفزاء آوازیں خوابیدہ دلوں کی بیدار کرتی جاتی ہیں۔ ہم جیسے بے سروسامان حسرت بھری نظروں سے ان قافلوں کو جاتے دیکھتے رہتے ہیں مگر جونہی رمضان کا آخری عشرہ آتا ہے تو کوئی نہ کوئی جہاز ہم جیسے بے کسوں اور بے پروں کو اٹھا کر اڑان بھرتا ہوا پیغام دیتا ہے۔

آؤ کہ تمہیں شہر محبت نے بلایا !

پچھلے رمضان ایسا ہی ہوا۔ لاہور سے اٹھے جدہ پہنچے جدہ سے چلے تو مدینہ منورہ جا پہنچے۔ حضور کا دربار سجا ہے۔ حد نگاہ تک عاشقان رسول کا ہجوم ہے مسجد نبوی کا حسن و جمال آنکھوں کو ٹھنڈک دے رہا ہے گنبد خضریٰ دامن دل کھینچ رہا ہے۔

باد رحمت سنک سنک جائے وادی جاں مہک مہک جائے
جب پڑے نظر تیرے گنبد پر غنچۂ دل چٹک چٹک جائے

ہم لوگ دربار مصطفیٰ میں یوں جاتے آتے ہیں جس طرح جنت کے باغوں میں شفاعت یافتہ گنہگار پھرتے ہیں۔

تیرے کوچے ہر بہانے میرا دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

ہمارے ایک ولایتی دوست انصار اللہ صدیقی رمضان کے آخری عشرہ میں

لندن سے اڑتے اڑتے مدینہ چلے آتے ہیں اور مسجد نبوی میں اعتقاف بیٹھتے ہیں۔ہم گھوم پھر کر کبھی کبھی ان کے دامن میں جا بیٹھتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں۔

گوش بہ نزدیکم آر کہ آوازے ہست!

اس سال ہم صدیقی صاحب کے کانوں کے نزدیک سرگوشی کر رہے تھے تو کسی نے ہمارے کندھے دبائے دیکھا تو ایک جوان رعنا.... عزیز سید صبیح رحمانی ہماری غفلت شعاری کو جھنجھوڑ کر اپنی طرف متوجہ فرما رہے ہیں۔اٹھے، گلے لگایا، ماتھا چوما، پھر ہاتھ چومے اور مرحبا مرحبا کہا۔ماشاء اللہ صبیح رحمانی ہمیں تلاش کرتے کرتے یہاں آپہنچے تھے۔صبیح رحمانی سفیر نعت ہیں، جادۂ رحمت کے مسافر ہیں، اقلیم نعت کر اچی کے فرماں روا ہیں۔وہ "نعت رنگ" کی بارہ جلدیں شائع کر کے نعت رسول کے خیاباں بسا چکے ہیں۔نعت لکھتے ہیں اور نعت سناتے بھی ہیں!

وہ ہمارے پاس بیٹھ گئے۔یوں کہیے کہ ہم ان کے دامن میں بیٹھ گئے۔میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے اور اپنا حال دل سنانے لگے۔ہم ان کا نعت رنگ پڑھ کر خوش ہوتے ہیں مگر وہ ہمیں بارگاہ مصطفیٰ میں مل کر خوش ہوئے۔امریکہ سے آئے مولانا محمد رضا چشتی، ڈاکٹر نور محمد ربانی مرحوم کے بیٹے محمد ابراہیم نور (کراچی)، مرزا امداد حسین (فیصل آباد)، محمد محبوب صاحب (بزم غوثیہ نعت انٹرنیشنل کراچی) اور ہمارے لندنی دوست انصار اللہ صدیقی نے ایک حلقہ بنا لیا اور سید صبیح رحمانی صاحب کی باتیں سننے لگے ایک گوشہ میں ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی تشریف فرما تھے۔آگے بڑھے اور حلقہ صبیح میں شریک ہو گئے۔صبیح رحمانی ابھی ابھی مواجہہ شریف سے ہو کر آئے تھے۔اپنی قلبی کیفیت زبان پر لے آئے۔

کھویا کھویا ہے دل، ہونٹ چپ، آنکھ نم، ہیں مواجہہ پہ ہم
روبرو ان کے لایا ہے ان کا کرم، ہیں مواجہہ پہ ہم
لمحے لمحے پہ آیات کا نور ہے، نعت کا نور ہے
نور افشاں درودی فضا دم بہ دم، ہیں مواجہہ پہ ہم
ایک کونے میں ہیں، سر جھکائے ہوئے، منہ چھپائے ہوئے
گردنیں ہیں کہ بار ندامت سے خم، ہیں مواجہہ پہ ہم
آنسوؤں کی زباں کر رہی ہے بیاں، ان سے احوال جاں
صرف اپنا نہیں، پوری امت کا غم، ہیں مواجہہ پہ ہم
ہر اندھیرا مقدر کا چھٹنے لگا دور ہٹنے لگا
قریۂ نور میں آگئے ہیں قدم، ہیں مواجہہ پہ ہم۔
مسکراتی ہوئی ہر تجلی ملی، کیا تسلی ملی
دور ہوتے گئے سارے رنج والم، ہیں مواجہہ پہ ہم
سب طلب گار حرف شفاعت کے ہیں ان کی رحمت کے ہیں
چہرے چہرے پہ ہے اک سوال کرم، ہیں مواجہہ پہ ہم

ابھی صبیح رحمانی اپنے تاثرات بیان کر ہی رہے تھے کہ حرم نبوی کی اذان گونجی اور ہم صف بستہ ہو گئے۔اللہ اکبر۔اللہ اکبر۔اللہ اکبر۔اللہ اکبر

("جہانِ رضا" ماہ جون، جولائی ۲۰۰۲ء)

بیادِ مجلس اقبال احمد فاروقی

صاحبزادہ محمد محب اللہ نوری: اپنے دوست ہیں۔ آپ فقیہ اعظم حضرت مولانا
نور اللہ نعیمی نور اللہ مرقدہ کے نامور فرزند ہیں۔ دارالعلوم حنفیہ فریدیہ بصیر پور (اوکاڑا)
کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ ماہ نامہ ''نور الحبیب'' کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ ایک دن خراماں خراماں
''جہانِ رضا'' کے دفتر آپہنچے۔ وہ جب آتے ہیں تو وقت کے تیز رو گھوڑے (اب
گام کار) پر سوار ہو کر آتے ہیں۔ چند لمحے گفتگو کی اور ''یوں جانیے کہ گرد سفر کو خبر نہ ہو''
۔ وہ اپنے دارالعلوم کے سالانہ اجلاس کی رونقوں کی داستان سنا رہے تھے نامور علمائے
کرام کی آمد کا ذکر کر رہے تھے۔ شعلہ بیان مقررین کا تذکرہ کر رہے تھے۔ ہمارے
حاضر نہ ہونے پر شکوہ کر رہے تھے۔ ہم نے جواب شکوہ یوں دیا کہ فقیر ان دنوں جلسوں
کی بجائے محافل ذکر میں بیٹھنے لگا ہے۔ جاتے جاتے فرمانے لگے۔

زاہد نہ داشت، تاب جمالِ پری رخاں   کنجے گرفت و ذکر خدا را بہانہ ساخت!

حکیم نذیر احمد چشتی: دیار حبیب میں سابقہ بیس سال سے مقیم ہیں۔ جدہ میں رہتے
ہیں اور زائرین حرم کی میزبانی کرتے ہیں۔ علماء و صوفیہ اور مدحت سرایانِ رسول کی
میزبانی کے لیے بچھے جاتے ہیں۔ اعلیٰ کھانے کھلاتے ہیں، مشروبات سے تواضع
کرتے ہیں۔ ہر چیز اپنے ہاتھ سے پکاتے ہیں۔ دستر خوان بچھاتے ہیں اور چمچوں کو
لشکاتے ہیں۔ ہر مہمان کے پاس جا کر بڑے میٹھے انداز میں کہتے ہیں کہ ''یہ کھانا
میں نے آپ کے لیے پکایا تھا''۔ پھر مجالس نعت کا خوبصورت اہتمام کرتے ہیں۔
خوشنوا نعت خوانوں کو بلاتے ہیں۔ پاکستان کے شیریں بیاں خطیبوں کی تقاریر سناتے

ہیں۔ اہل محفل کو رنگین کیمروں میں سمیٹتے ہیں۔ آوازوں کو ویڈیو میں بند کرتے ہیں۔
محفل کی کارِروائی کو سی ڈی میں محفوظ کرتے ہیں۔ وقت رخصت تحفے دے کر فرماتے
ہیں۔ دوبارہ آپ کب آئیں گے؟

وقت رخصت یہ چھیڑ تو دیکھو   ہم سے کہتے ہیں، کب ملیں گے آپ؟

وہ چند دنوں کے لیے پاکستان آئے تھے۔ لاہور آئے۔ حضرت خواجہ علی
ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دی، دعا کی اور خراماں خراماں اپنے عزیز
لیاقت علی کے ساتھ ''جہانِ رضا'' کے دفتر میں آپہنچے۔

آمد سنی کسی کی تو واللہ رے اشتیاق!   آنکھیں بچھائیں ہم نے جہاں تک نظر گئی!

لاہور کے چند احباب کو آپ کی آمد کی خبر ہو گئی۔ پیر خادم حسین شرقپوری
آپہنچے۔ سید محمد حسن شاہ نوری الگیلانی آگئے۔ صاحبزادہ سید محمد معصوم شاہ نوری آگئے۔
صاحبزادہ رضاء المصطفیٰ آگئے۔ حکیم صاحب کے ساتھ ان کے رفیق سفر لیاقت
صاحب تھے۔ آزاد کشمیر سے ان کے مدنی دوست خواجہ محمد شفیع آزاد کشمیر سے اڑتے
اڑتے آپہنچے۔ (خواجہ صاحب کئی سال شہر محبت میں رہے تھے۔ ہم جب حاضری دیتے
تو آپ مثنوی مولانا روم، شیریں آواز اور مترنم انداز میں سنایا کرتے تھے)۔ حکیم نذیر
احمد چشتی کی محفل جمی تو ذکر مدینہ چل نکلا آپ نے مدینہ میں ہماری غیر حاضری پر سرزنش
کی۔ ہم نے اپنی ناتوانی اور بیماری کا عذر کیا تو ایک نسخہ لکھ کر دیا فرمانے لگے یہ کھاؤ۔
تندرست ہو جاؤ۔ جوان ہو جاؤ۔ اور اگلے رمضان میں مدینہ چلے آؤ۔

این نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ ایم !

ملک محمد اشرف پنجاب گورنمنٹ کے آفیسر ہیں۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی لاہور ہیں
سلسلہ نقشبندیہ شرقپور شریف سے روحانی نسبت رکھتے ہیں۔ ہمارے دوست ہیں وہ
درود شریف کے عامل ہیں۔ درود خضری کو حرز جان بنائے رکھتے ہیں۔ علامہ حبیب
البشر الخیری رنگون (برما) کی مرتبہ کتاب ''تحفہ درود شریف'' شائع کر کے مفت تقسیم
کرنے کا پروگرام بنانے آ گئے۔ ہم اس سے پہلے اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپوا کر
تقسیم کر چکے تھے۔ مگر ملک محمد اشرف صاحب نے اعلان کیا کہ ایک ایڈیشن تازہ چھپ
اور اہل محبت کو پہنچے۔ اخراجات اپنی تنخواہ سے مہیا کیے۔ قانون دان احباب کو بھی
شریک ثواب کیا۔ اس طرح ان کی تحریک پر ''تحفہ درود شریف'' کا خوبصورت ایڈیشن
تیار ہوا سیکڑوں جلدیں مجسٹریٹوں، ججوں اور وکیلوں میں تقسیم ہونے لگیں۔ اس طرح
ان کی کوششوں سے ''تحفہ درود شریف'' کی خوشبو کے جھونکے کچہریوں عدالتوں
کورٹوں، وکیلوں، ایڈوکیٹوں اور مجسٹریٹوں کے دل و دماغ کو معطر کرنے لگے۔

کس کی زلفوں کی مہک لائی ہے بطحا سے نسیم
دل وجاں وجد کناں جھک گئے بہر تعظیم

''جہانِ رضا'' کے قاری محمد فہیم، الحاج محمد تنویر نے ''تحفہ درود شریف'' کی
پانچ سو جلدیں اپنے احباب میں تقسیم کیں۔ چودھری شفقت محسن، مالک کمال
پرنٹنگ پریس، گارڈی ٹرسٹ بلڈنگ پٹیالہ گراؤنڈ، لاہور نے اپنے والد مرحوم
ایصال ثواب کے لیے پانچ سو جلدیں تقسیم کر دیں مرکزی مجلس رضا اور مکتبہ نبویہ گنج
بخش روڈ، لاہور نے آنے والوں کو ''تحفہ درود شریف'' کے تحائف دیے۔ حفیظ تائب

نے کیا خوب کہا۔

بادِ رحمت سنک سنک جائے وادی جاں مہک مہک جائے
جب چھڑے بات نطق حضرت کی غنچہ فن چٹک چٹک جائے

علامہ کوکب نورانی نے اپنے والد گرامی خطیب پاکستان مولانا محمد شفیع اوکاڑوی
کے سالانہ عرس پر خوبصورت کتاب ''الخطیب'' شائع کر دی۔ خطیب پاکستان کی دینی
خدمات کے ساتھ ساتھ علامہ کوکب نورانی نے سالانہ ملکی واقعات پر روشنی ڈالی۔
پچاس جلدیں ڈاک کے ذریعے بھیجیں اور احباب میں تقسیم کرنے کا کہا۔ مولانا محمد نسیم
صدیقی نوری کراچی سے اٹھے اپنی بیس کتابوں کی کئی جلدیں عنایت کیں اور حکم دیا کہ ''
جہانِ رضا'' کے حلقوں میں مفت تقسیم کریں۔ مولانا باغ علی رضوی، فیصل آباد سے
آئے۔ حضرت سیدنا غوث اعظم پر خوبصورت کتاب چھپوا کر تقسیم کرنے کا حکم دیا۔
انڈیا سے عزیز محترم زبیر قادری نے اپنا سہ ماہی مجلہ ''افکار رضا'' بھیج دیا۔ رضا اکیڈمی
ممبئی کے صدر گرامی قدر سعید نوری صاحب نے ''یادگار رضا'' کا بنڈل بھیج کر
فرمایا احباب میں تقسیم کر دو۔ مولانا غلام مصطفیٰ رضوی نے مالیگاؤں سے ''
مولانا اندھے کی لاٹھی'' کی کئی جلدیں بھیج دیں۔
علامہ ارشد القادری کے نامور پوتے علامہ خوشتر نورانی نے اپنے ماہنامہ ''
جام نور'' کی ایک سو جلدیں بھیج دیں۔ علامہ مبارک حسین مصباحی نے مبارک پور سے
الاشرفیہ کی پچاس جلدیں بھیج دیں، علامہ محمد یٰسین مصباحی نے دہلی سے ''کنز الایمان''
کی پچاس جلدیں عنایت فرما دیں۔

کسی کو دشت نوردی کسی کو دار ورسن — یہ عظمتیں ہیں مقدر کسی کسی کے لیے

اب ہم ان عنایات کے ٹوکرے سر پر رکھے کوچہ و بازار میں صدا لگا رہے ہیں:

ہم نشیں چاک گریباں بیچتا پھرتا ہوں میں — حاصل علم و قلم کو بیچتا پھرتا ہوں میں

مولانا صلاح الدین سعیدی ایک فاضل نوجوان ہیں، ''باتوں سے خوشبو آئے'' ہماری خزاں دیدہ تحریروں کا گلدستہ بنا کر انہوں نے شائع کی تھی اور چار دانگ عالم میں پھیلا دی تھی۔ ''جہانِ رضا'' کے دفتر میں آئے۔ ہماری مصروفیت اور بزرگی کا خیال کر کے کہنے لگے۔ حضرت آپ ''انجمن غافلاں'' کے صدر محترم ہیں۔ اس ماہ ''جہانِ رضا'' کی ترتیب و اشاعت کا انتظام میں کروں گا۔ مسودات، مضامین، نفاست نامے، اداریہ، خبرنامہ اٹھا کر لے گئے۔ تین دنوں کے اندر اندر ''جہانِ رضا'' تیار کر کے پریس میں بھیج دیا۔ ہم دیکھتے رہ گئے اور محترم محمد عالم مختار حق پروف ریڈنگ کے لیے ترستے رہے۔

شیخ کہتا رہا حساب! حساب!

ہم مضامین کی ترتیب کو دیکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ مگر سعیدی صاحب نے ''جہانِ رضا'' تیار کیا، ڈاک کے حوالے کیا اور منتظر قارئین کے ہاتھوں تک پہنچا دیا۔ فجزاہ اللہ خیرا۔

مدینہ یاد آتا ہے نظامی یاد آتا ہے۔ اصغر علی نظامی ہمارے دوست ہیں۔ ہم مدینہ پاک میں جائیں تو ان کی مجلس میں چلے جاتے ہیں وہ بیس سال شہر محبت میں رہے۔ اب پاکستان آگئے ہیں۔ پچھلے ہفتے ہمارے پاس آگئے۔ لبوں پر مسکراہٹ

ہاتھ میں پاسپورٹ، پاسپورٹ کے سینے کے اندر ویزہ اور جہاز کی ٹکٹ ہم ہکے بکے رہ گئے ہم نے کہا:

اے قافلے والو ٹھہرو ذرا ہم نے بھی مدینے جانا ہے

مگر نظامی صاحب تو ہاتھ سے نکلے جا رہے تھے۔ چائے کی ایک پیالی پیش کی، سلام محبت کا نذرانہ پیش کرنے کی التجا کی۔ بارگاہ رسالت میں پیغام دیے۔ التجائیں دیں اور نظامی صاحب کو دعائیں دیں اور کہا

بسلامت روی و باز آئی

پیر سید محمد حسن شاہ گیلانی نوری آگئے، ہمیں علیحدہ لے گئے کہنے لگے کسی کو بتانا نہیں یہ ہے میرا پاسپورٹ، یہ ہے میرا شناختی کارڈ یہ ہے میری زاد و راہ۔ بس آپ جانیں آپ کا کام جانے۔ میں معراج النبی کی مقدس رات حضور ﷺ کی بارگاہ میں گزارنا چاہتا ہوں۔ ہم اٹھے قافلے ابھی جا رہے تھے ''عزیز خاں قادری'' کا خدا بھلا کرے، کاغذات لیے اور شاہ صاحب کو مدینے جانے والے ایک قافلے کے ساتھ روانہ کر دیا اور

ہم ترستے ہی رہے، جلوے برستے ہی رہے!

حضرت مولانا محمد فیض احمد اویسی عالم دین ہیں۔ فخر اہل سنت ہیں۔ صاحب علم و قلم ہیں۔ عصر حاضر کے سب سے بڑے مصنف ہیں، مؤلف ہیں، مرتب ہیں اور مترجم ہیں۔ تفسیر روح البیان'' کی تیس جلدوں کا اردو ترجمہ اہل علم کے ہاں مقبول ہوا۔ اعلیٰ حضرت بریلوی کے ''دیوان حدائق بخشش'' کی شرح لکھنے پر آئے تو پچیس

جلدیں مکمل کر دیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے مناقب تیار کرنے پر آئے تو ہمارے لیے مناقب امام اعظم مؤلفہ امام موفق بن احمد مکی کا ترجمہ کر کے لے آئے اور ہم زیور طباعت سے آراستہ کرتے گئے۔ لاہور آتے ہیں تو زیارت کراتے جاتے ہیں۔ وہ سفر وحضر میں لکھتے جاتے ہیں۔ جہاں قیام کرتے ہیں وہاں درس قرآن کے ''فیضان اویسی'' پھیلاتے جاتے ہیں۔ بڑے متحرک قلم وزبان کے مالک ہیں۔ ممتاز عالم دین ہیں۔ ان تمام اوصاف حمیدہ اور شمائل پسندیدہ کے باوجود ہمیں دوست رکھتے ہیں۔ دربار مصطفی میں حاضری دیتے ہیں تو ہمارے لیے بارگاہ رسول میں خصوصی دعا فرماتے ہیں۔ رمضان کے آخری عشرہ میں ''حرم نبوی'' میں اعتکاف بیٹھتے ہیں مگر ''نجدی مطوے'' ان کے تعاقب میں رہتے ہیں اور وہ اپنے ''مقامات اعتکافیہ'' بدلتے رہتے ہیں۔ ہم انہیں تلاش کرنے نکلتے ہیں تو حرم نبوی کے کسی نہ کسی گوشے میں مل جاتے ہیں۔ ہم ان کے نحیف ونزار بدن پر اوڑھے ہوئے کمبل کو پہچان کر ان کی زیارت کو چلے جاتے ہیں اور ان کے چہرہ انور سے کمبل کا گوشہ ہٹاتے ہوئے عرض کرتے ہیں۔

لاہو مکھ تھیں مخطط برد یمن!

تو اٹھ کر گلے لگا لیتے ہیں۔ جب سلسلہ گفتگو جاری ہوتا ہے تو گلہائے رنگا رنگ بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔

مجلس جمی ہوئی تھی۔ احباب بیٹھے ہوئے تھے۔ سلسلہ گفتگو جاری تھا کہ موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ محمد ممنون اسلام آباد سے بول رہے تھے۔ آواز آئی ''پروفیسر محمد حسین آسی انتقال کر گئے''۔ ہمارے منہ سے آہ نکلی۔ رنگ محفل بدل گیا۔ چہرے

افسردہ ہو گئے۔

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!

پروفیسر محمد حسین آسی ہمارے دوست تھے۔ صاحب علم وقلم تھے۔ خلوص ومحبت کے پیکر تھے۔ تحریر وتقریر میں یکتا تھے۔ ماہنامہ ''الحقیقہ شکر گڑھ'' کے چیف ایڈیٹر تھے۔ لکھتے تو خوب لکھتے تھے۔ ان کا قلم بے باک تھا۔ ان کی تحریر بد کردار ارباب اقتدار کے لیے ''شیرانِ غاب'' سے بڑھ کر تھی۔ مگر اہل محبت کے لیے مثال ''غزال تاتاری'' تھی۔ شاہان وقت کو للکارتے۔ ان کی تحریر میں جاہ وجلال بھی تھا اور حسن وکمال بھی۔ لاہور آتے تو ہمیں ضرور ملتے۔ بیمار ہوتے تو ساری ساری رات اللہ کی بارگاہ میں آہ وزاری کرتے۔ ہسپتال میں داخل ہوتے تو دفتروں کے دفتر لکھ جاتے۔ صاحب تصنیف تھے۔ صاحب تالیف تھے۔ ان کی تحریریں اہل دل کے ہاں مقبول تھیں۔ وہ فنافی الشیخ تھے۔ ہر عمل میں اپنے شیخ کی نشانی تھے۔ کتاب لکھیں تو ''انوار لاثانی'' مسجد بنائیں تو ''نقش لاثانی'' مدرسہ بنائیں تو ''ضیائے لاثانی''۔ جس طرف نگاہ کرتے ''لاثانی ہی لاثانی'' رگ رگ میں لاثانی۔ نس نس میں لاثانی۔ رنگ رنگ میں ''نقش لاثانی'' نور اللہ مرقدہ۔ یہ تھے۔ ہمارے یار لاثانی!

یومِ آزادی آ گیا کچھ تقریبات، کچھ جلسے، کچھ جلوس، کہیں چراغاں، کہیں ہلے گلے، علامہ اقبال کا شعر

عرشیاں را صبح عید آں ساعتے چوں شود بیدار چشم ملتے

یاد آیا تو دل جھوم اٹھا۔ صبح ''جہانِ رضا'' کی محفل میں آئے تو ڈاکٹر مختار الدین

احمد کا تیز رو قاصد علی گڑھ سے چل کر لاہور آ پہنچا۔ یوں محسوس ہوا کہ ڈاکٹر مختار الدین احمد بنفس نفیس لاہور تشریف لے آئے ہیں۔ لفافہ کھولا تو ان کے پاکستانی احباب کے نام دس خطوط ملے اور اپنے لیے چار نفاست نامے ہمدست ہوئے۔ ابھی یہ نفاست نامے کھلے ہی تھے کہ اپنے پیارے دوست کوکب نورانی کا تیز گام قاصد آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت رنگیں لفافہ تھا۔ جس میں ''الخطیب'' کے پچاس شمارے تھے۔ یہ علامہ کوکب نے اپنے والد مکرم کے سالانہ عرس کی یادیں سمیٹ کر بھیجے تھے۔ جنرل پوسٹ آفس کی خفیہ ڈاک آئی تو اس میں ایک نفیس پیکٹ تھا جس میں ایک خوبصورت کتاب تھی جو ملک العلماء مولانا ظفر الدین بہاری خلیفہ اعلیٰ حضرت کی ایک نایاب تصنیف تھی۔ یہ کتاب ان کی بیٹی نے اپنے والد گرامی کے ایصال ثواب کے لیے زیور طباعت سے آراستہ کر کے پاک و ہند میں مفت تقسیم کی۔ سیدہ محترمہ نے بہار سے ہمیں یہ تحفہ بھیج کر ذرہ نوازی کا ثبوت ہی نہیں دیا بلکہ خوش کر دیا۔

بریں لطف گر جاں فشانم رواست

محسن اہل سنت الحاج سعید نوری نے رضا اکیڈمی ممبئی انڈیا کی مطبوعات یادگار رضا کی کئی جلدیں عنایت فرمائیں۔ جو کہ ان کے مرشد گرامی مفتی اعظم ہند کے علمی اور روحانی کمالات پر مشتمل تھیں۔ ''الاشرفیہ مبارک پور'' کے چیف ایڈیٹر مبارک حسین مصباحی، مبارک پور انڈیا سے آتے دکھائی دیے اُن کے سر پر ''سیدین نمبر'' کی دس جلدیں تھیں۔ ہم اٹھے کتابوں کا بھاری گٹھا اٹھایا۔ دست بوسی کرنے کے لیے آگے بڑھے تو ان کے بجائے ان کا قاصد خوش خرام تھا۔ جو ہمیں اتنا بھاری

بھر کم تحفہ دے کر یہ جا وہ جا۔

میاں **فضل احمد جیبی** ہمارے دوست ہیں گجرات میں رہتے ہیں۔ ''نور علیٰ نور فاؤنڈیشن'' کے بانی ہیں۔ ''فضل پلازا'' کے مالک ہیں۔ ''قرآن پاک کی نزدلی ترتیب'' کی روشنی میں سیرت طیبہ کی تیئس جلدیں ترتیب دے رہے ہیں۔ ان کا ایک لفافہ خصوصی قاصد کی وساطت سے آ پہنچا۔

آنکھیں بچھائیں ہم نے جہاں تک نظر گئی!

پیر طریقت میاں جمیل احمد شرقپوری کبھی کبھی ہمارے گھر ''چھاپا'' مارا کرتے تھے اب وہ ''پیر طریقت'' کی بجائے ''پیر حقیقت'' ہو گئے ہیں۔ ان کا قاصد آیا۔ تین کتابیں ''میرے مخدوم'' ارشادات مجدد'' اور ''ارشادات میاں شیر محمد شرقپوری'' عنایت فرما کر ان کا برق پا قاصد دوڑتا نظر آیا مگر منہ پھیر کر کہتے گیا ''اس میں حضرت صاحب کا سلام بھی ہے''۔ ہمارے شوقین قارئین جہان رضا اگر اس محفل میں ہوتے تو سارے تحفے سمیٹ کر لے جاتے۔

کہ من سیپارۂ دل می فروشم

سید منور علی شاہ بخاری ہمارے دوست ہیں۔ امریکہ میں رہتے ہیں۔ علی الصباح فون کی گھنٹی دیتے ہیں تو پچیس منٹ تک پیاری پیاری باتیں ذکر کرتے رہتے ہیں۔ فون اٹھایا تو وہ بول رہے تھے۔ اعلیٰ حضرت کے عاشق زار ہیں۔ بس انہی کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ سلام عرض کیا تو حسن امام، عثمان خان نوری، ڈاکٹر ظفر اقبال نوری کی دینی خدمات کا ذکر کرتے گئے۔ انگلینڈ سے ایک کتاب دوست مولانا امجد کا ٹیلی

فون رات کو آ گیا۔ پاک و ہند میں چھپنے والی کتابوں کی تلاش میں سرگرداں تھے ۔فلاں کتاب بھیجی جائے۔ وہ تیس ہزار کتابوں کا ذخیرہ دیار غیر میں سجائے بیٹھے ہیں۔ مولانا نواز مالیگ جنہوں نے ''مولانا اندھے کی لاٹھی'' شائع کر کے برطانیہ اور ہندوستان میں دھوم مچادی تھی۔ ''جہانِ رضا'' ملنے پر اظہار مسرت فرما رہے تھے۔ بارگاہ رسول میں نماز اشراق ادا کرنے کے بعد ہمارے کرم فرما ''اصغر علی نظامی'' کا فون آ گیا۔ دربار رسول کے در و دیوار کی خوشبوئیں آنے لگیں۔ بارگاہ نبوی میں آنے جانے والوں کی دھیمی دھیمی باتوں کی لطیف آوازیں سنیں تو دل خوش ہو گیا۔ مولانا غلام مصطفیٰ قادری راجستھان کے شہر ناگور کے علاقہ باسنی سے فون پر خوش کرنے لگے۔ ممبئی سے ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی شکوہ بہ فون تھے کہ ان کی کتاب ابھی تک نہیں چھپی۔ افکار رضا ممبئی کے ایڈیٹر محمد زبیر قادری کا فون آیا اور ''لائن کٹ گئی''۔

(''جہانِ رضا'' ماہ ستمبر ۲۰۰۶ء)

سید محمد امیر شاہ گیلانی سجادہ نشین شاہ محمد غوث کی رحلت پر پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کا

تعزیتی خط

حضرت صاحبزادہ سید نور الحسنین سلطان آغا گیلانی القادری زید مجدہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! فخر اہل سنت، راہنمائے اہل محبت حضرت سیدی و مولائی مولانا محمد امیر شاہ القادری الگیلانی کی رحلت کی اندوہناک خبر پہلے احباب سے، پھر ارباب پشاور سے، پھر آپ کے اطلاعی خط سے ملی۔ بے پناہ صدمہ پہنچا، بڑا املال ہوا، بڑا غم ہوا۔ (انا للّٰہ وانا الیہ راجعون)

حضرت پیر طریقت سید محمد امیر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے عالم دین، روحانی رہنما اور محقق و مدقق تھے۔ آپ کی رحلت سے ملت اسلامیہ کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں لاکھوں لوگ آپ کی علمی اور روحانی خدمات سے محروم ہو گئے ہیں۔ خصوصاً شمالی پاکستان صوبہ سرحد اور افغانستان میں آپ کے علمی انوار کی ضیاء پاشیاں دور دور تک پہنچی تھیں۔ آپ کی بلند پایہ تصانیف و تالیفات نے ایک منفرد مقام حاصل کیا تھا۔ ان کی روحانی تربیت سے سارے پاکستان اور افغانستان میں ہزاروں افراد کو قلبی روشنائیاں ملیں۔ اور سلسلہء قادریہ کی اشاعت میں انہوں نے خصوصی خدمات سرانجام دیں۔ حضرت شاہ محمد غوث لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے علمی آثار کو زندہ کرنے میں آپ نے نہایت ہی اہم کردار ادا کیا اور ان کی تصانیف کو نہایت شاندار انداز میں چھپوا کر عوام کی راہنمائی فرمائی۔

دینی اور سیاسی میدان میں آپ نے سارے سرحد میں اہل سنت کی قیادت

کی اور ''نظام مصطفیٰ ﷺ'' کے نفاذ میں ان کی جدوجہد مثالی رہی ہے۔ قائد اہل سنت حضرت مولانا الشاہ احمد نورانی کی رحلت کے بعد آپ کا وجود اہل سنت کے لیے بڑا سہارا تھا۔ آپ نے ایک طویل عرصہ تک الشاہ احمد نورانی رحمتہ اللہ علیہ کی رفاقت میں نظام مصطفیٰ ﷺ کے لیے کامیاب کوششیں کی ہیں۔ قدم قدم پر اللہ و رسول کی رضا کو مقدم رکھا۔ مجھے الشاہ احمد نورانی رحمتہ اللہ علیہ کی قربت کی سعادت حاصل رہی ہے آپ حضرت کے لیے نہایت وقیع رائے رکھتے تھے اور جب بھی آپ کا تذکرہ فرماتے تو بڑے ادب واحترام سے یاد کرتے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان دونوں رہنماؤں کو علیین کی بلندیوں میں جگہ دے۔

حضرت ''مولوی جی'' سید محمد امیر شاہ القادری الگیلانی رحمتہ اللہ علیہ مجھے خصوصی طور پر اپنے دامن شفقت میں جگہ دیتے تھے لاہور آتے تو ملاقات سے سرفراز فرماتے اور میرے مکتبے میں کافی وقت دیتے۔ اپنی تالیفات کی اشاعت کے سلسلہ میں راہنمایانہ ارشادات سے نوازتے۔ لاہور سے واپس جاکر جب اپنے مرکز یکہ توت پشاور میں جاتے تو دوستوں کے ذریعے اپنی خوبصورت کتابوں کے تحائف سے نوازتے اور اپنی دعاؤں میں خصوصی یاد رکھتے۔ آپ نے حضرت شاہ محمد غوث رحمتہ اللہ علیہ کی شرح بخاری کا ترجمہ شائع کیا تو اہل علم نے اسے اپنے دامن میں سمیٹا۔ ''انوار غوثیہ'' ''ترمذی شریف'' شاندار انداز میں شائع ہوئیں تو ہمیشہ کی طرح مجھے اپنی ان گراں قدر تصانیف کے تحفے عنایت فرمائے۔ آپ کی تصانیف میں سے ''تذکرہ علماء و مشائخ سرحد'' ''انوار علی'' ''شرح بخاری'' (شرح غوثیہ انوار غوثیہ جب چھپتی تو مجھے نوازتے۔ میں بھی ان کتابوں کی تقسیم واشاعت کے لیے

لاہور میں اپنے مرکز کو استعمال کرتا تھا۔

اللہ تعالیٰ حضرت کو اپنے قرب میں بلند مقامات عطا فرمائے۔ آپ کی قبر کو ''الروضہ من روضاۃ الجنۃ'' بنائے۔ آپ کی مغفرت کے لیے اپنے محبوب ﷺ کی چادر شفاعت کا سایہ رحمت عنایت فرمائے۔

میرے قلبی تعلق کی وجہ سے لاہور کے اکثر علماء نے میرے پاس آکر فاتحہ خوانی کی، اظہار افسوس کیا اور آپ کو ایصال ثواب بخشتے رہے۔ میں اپنے غم کو آپ کے غم میں شریک کر کے اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں۔ آپ تمام حضرات بے پناہ صدمے سے دوچار ہوئے ہیں۔ میں آپ کے درد والم میں برابر کا شریک ہوں۔ مجھے اپنے تمام دل فگار عزیزوں کا ہم نوا جانیے۔ آپ کے علاوہ صاحبزادگان شیر آغا (غلام سیدین) سعید آغا، جان آغا، تاج آغا، اسد آغا، نبی آغا کے علاوہ دوسرے افراد خانہ کے غم والم میں شریک تصور کیجیے۔ آپ کے غم کدہ میں مجھے حاجی محمد تنویر احمد صاحب قادری، سید محمد انور شاہ قادری، سید محمد یاسر بخاری اور دوسرے احباب جو موجود ہوں سب کو میری طرف سے اظہار غم کریں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو صبر جمیل سے نوازے۔

شریک غم

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی

(''جہان رضا'' لاہور۔ نومبر دسمبر ۲۰۰۴ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عراق کی خونچکاں سرزمین

آج عراق دنیا میں واحد مسلمان ملک ہے جو یہود ونصاریٰ کی نظروں میں کھٹکتا ہے۔ دنیائے کفر کی نظریں اس کی آزادی، اس کے باشندوں کا جذبہ حریت، اس کے قائد سید صدام حسین کی سربلندی کو نہیں دیکھ سکتیں۔ دنیا کی سپر پاور امریکہ ''نیو ورلڈ آرڈر'' کے میزائل لیے عراق کو تہ وبالا کر چکی ہے۔ وہ اپنی ساری عسکری قوت کے باوجود کیا اپنے عزائم میں کامیاب ہو جائے گا؟ اس نے سرزمین عراق کو خاک وخون سے رنگین کر دیا ہے۔ ہزاروں انسان موت کی وادی میں چلے گئے ہیں۔ سیکڑوں بستیاں مٹی کا ڈھیر بن گئی ہیں شہروں کے شہر پیوست زمین ہو گئے ہیں۔ مگر وہ اس مرد مجاہد ''سید صدام حسین'' کو اب تک شکست نہیں دے سکے۔

کہ کٹ سکتا ہے سر خوددار کا پر جھک نہیں سکتا!

ہم اگر اس المیہ کی داستان لکھنے لگیں تو دفتروں کے دفتر درکار ہیں۔ جس ملک پر ہر روز بمباری ہوئی ہو۔ دنیا کا بچہ بچہ اس کی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ اس پر لکھنا قارئین کی معلومات میں کوئی اضافے کی بات نہیں۔ جس قوم کو افغانستان کی تباہی کے بعد نشانہ ستم بنایا گیا ہے، اس پر کونسی آنکھ ہے جو نہ روئی ہو، کونسی زبان ہے جس نے فریاد نہ کی ہو، کونسا دل ہے جو نہ تڑپا ہو، کونسا ملک ہے جس نے احتجاج نہ کیا ہو!

اس دور کا یہ بھی ایک سانحہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ 'یو این او' اور ''سیکورٹی

کونسل'' کے فیصلوں کو ٹھکراتے ہوئے ایک مسلمان ملک کو روندتے چلے گئے ہیں۔ دنیا کے لاکھوں انسانوں کے احتجاج کے باوجود وہ ایک مسلمان ملک کو پامال کر چکے ہیں۔ وہ صبح وشام آگ برساتے رہے ہیں مگر دنیا کا کوئی حکمران گردن اٹھا کر نہیں دیکھ سکا۔ غیر مسلم تو غیر مسلم، خود مسلمان حکمران عراق کے مسلمانوں کو تڑپتا دیکھ کر اف نہیں کر سکے۔ دنیائے اسلام کی واحد ایٹمی قوت (پاکستان) تو ایسے دم سادھے بیٹھی رہی کہ

کوئی جانے منہ میں زباں نہیں، نہیں بلکہ جسم میں جاں نہیں!

''جہان رضا'' کے ان صفحات میں ہم اس عراق کی سرزمین کی عظمت پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں جس کے بہادر مسلمانوں نے گئے گزرے زمانے میں امت مسلمہ کا سر بلند کر دیا ہے۔ جہاں کے مسلمانوں نے سر جھکانے کی بجائے سر کٹانے کا فیصلہ کیا۔ جہاں کے لوگوں نے مغربی طاقتوں سے انعام واکرام پانے کی بجائے اپنی آزادی کے نقوش لکھنے کے لیے جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ عراق کی سرزمین مسلمانان عالم کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ اس خطہ کو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مجاہدین نے فتح کیا تھا اور اسے عالم اسلام کے اقتدار کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ ہمیں سرزمین عراق سے اس لیے بھی محبت اور انس ہے کہ اس سرزمین میں ایک سو ایک انبیاء کرام آرام فرما ہیں۔ ان کے مزارات صدیاں گزرنے کے باوجود بھی اہل ایمان کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ جب اسلام کی روشنیاں مدینہ منورہ سے نکل کر مشرق ومغرب میں پھیلیں تو عراق میں ہزاروں صحابہ، لاکھوں اولیاء اللہ اور کروڑوں اہل ایمان آ کر آباد ہو گئے آج ان کے مزارات سرزمین عراق کو جگمگا رہے ہیں۔ آج ان صفحات پر ہم بعض صحابہ کرام، اولیاء اللہ اور علماء دین کا ذکر کریں گے۔ تا کہ ہمارے قارئین خاک

وخون کی اس زمین کو ایک انوکھے انداز سے دیکھ سکیں۔

آج سرزمین عراق میں رہنے والے اور وہاں مزارات پر حاضری دینے والے دنیا کے گوشے گوشے سے آتے جاتے ہیں۔ وہ حضرت شیث علیہ السلام (ابن حضرت آدم علیہ السلام) حضرت ہود علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت یوشع علیہ السلام اور حضرت نبی ذوالکفل علیہ السلام کے مزارات دیکھنے کو آتے ہیں۔

یہ عراق ہے۔ اس کی گود میں دجلہ وفرات بہتے ہیں۔ کبھی اس سرزمین میں ایک متعصب آتش پرست مگر زبردست بادشاہ حکومت کررہا تھا۔ اس نے بڑی جنگجو فوج تیار کررکھی تھی۔ اس کا ایک ایک سپاہی اسلحہ سے لیس اور فن سپاہگری میں ماہر تھا۔ اس نے اپنے سپہ سالار کو حکم دیا کہ عرب کی سرزمین میں ابھرنے والی اسلامی قوت کو مٹادیا جائے یہ سپہ سالار..... رستم... اڑھائی لاکھ فوج لے کر میدان جنگ میں اتر آیا اور دریائے فرات کے ایک کنارے پر جاکر کھڑا ہوگیا۔

مدینہ منورہ مسلمانوں کا دارالخلافہ ہے امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفۃ الرسول، مملکت اسلامیہ کے نگران ہیں۔ آپ نے ایک آتش پرست بادشاہ کی اڑھائی لاکھ فوج کو سرحد پر کھڑے دیکھا تو خالد بن ولید کو اٹھارہ ہزار مجاہدین اسلام کا سپہ سالار بنا کر حکم دیا کہ دریائے فرات کے کنارے پر پہنچ کر اسلام کا دفاع کریں۔ یہ خالد بن ولید ہیں! یہ سیف اللہ ہیں! وہ سیف من سیوف اللہ ہیں! سیدنا عمر ابن الخطاب کا اشارہ پاتے ہی اٹھارہ ہزار مجاہدین کا لشکر لے کر دریائے فرات کے کنارے جاپہنچے۔ کنارے کے ایک ٹیلے پر کھڑے ہوکر نگاہ ڈالی تو اڑھائی لاکھ فوج

پرے جمائے تیار کھڑی ہے۔ خالد بن ولید نے غازیوں کی صف بندی کی۔ تیر اندازوں کی ترتیب کی۔ صف شکن بہادروں کی صفیں تیار کیں۔ پھر چھاپہ مار دستے تیار کیے اور رومی سپہ سالار رستم کو پیغام بھیجا کہ ”تم میدان جنگ میں آگئے ہو اور اپنی فوجیں لے کر آگئے ہو۔ لشکر گاہ میں کھڑے ہو میری ایک بات سن لو۔ یا تو کلمہ پڑھ کر اسلام کا جھنڈا بلند کرو یا ”ذمی“ بن کر اسلام کی پناہ میں آجاؤ۔ ورنہ یاد رکھو جن لوگوں سے تمہیں لڑنے کا موقع مل رہا ہے وہ موت سے نہیں ڈرتے۔“

رستم نے یہ باتیں مذاق جانیں اور ہوا میں اڑادیں۔ لڑائی پر آمادہ ہوا۔ اس کو اپنی اڑھائی لاکھ فوج پر بڑا ناز تھا۔ مگر یہاں تو اٹھارہ ہزار شیران غاب تھے۔ لڑائی شروع ہوئی، حملے شروع ہوئے، معرکے شروع ہوئے۔ پندرہ دن کشت وخون رہا۔ پھر ایک دن آیا کہ اٹھارہ ہزار مجاہدین اسلام نے اڑھائی لاکھ فوج کو چاروں طرف سے گھیر کر گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کردیا۔ رومی سپاہی کچھ کٹ گئے کچھ بھاگ گئے کچھ زخمی ہوکر میدان جنگ میں تڑپتے دکھائی دیئے۔

دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا ودریا سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

خالد بن ولید للکارتا گیا۔ دور دور تک کفار کی فوجوں کو روندتا گیا۔ عراق کی زمین کے اندر تک چلا گیا۔ عراق کے حکمرانوں کی اتنی بڑی سلطنت سرنگوں ہوکر اسلامی فتوحات کا حصہ بن گئی۔ مدینہ میں خبر پہنچی تو حضرت عمر مسجد نبوی میں جاکر سر بسجود ہوگئے۔ شکرانے کے نوافل ادا کیے اور بارگاہ رسول کی دہلیز کو چوم کر کہا ”یارسول اللہ آج آپ کے غلام سارے عراق کے مالک بن گئے ہیں“۔

یہ دریائے فرات کا کنارہ ہے۔ قافلہ اہل بیت خیمہ زن ہے۔ کربلا کا سینہ

تپ رہا ہے یزید کی فوجیں دریائے فرات کے کناروں پر پہرہ لگائے بیٹھی ہیں۔ مگر جگر گوشہ رسول، سیدہ فاطمہ کا لعل، سید الشباب، اہل الجنتہ، حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ اپنے اہل بیت سمیت حق و باطل کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ شمر، ابن زیاد اور یزید کے فوجی دستوں نے تلواریں سونتیں اور تیر و کمان سنبھالے چاروں طرف کھڑے ہیں۔ یہ حسین کون ہے؟ یہ یزید کون ہے؟ یہ کربلا کہاں ہے؟ یہ فرات کا پانی کدھر جا رہا ہے؟

جو دہکتی خاک کے شعلوں پہ سویا وہ حسین
جو جواں بیٹے کی میت پر نہ رویا وہ حسین
جس نے اپنے خون سے عالم کو دھویا وہ حسین
جس سب کچھ کھو کے لیکن کچھ نہ کھویا وہ حسین
مرتبہ اسلام کا جس نے دوبالا کر دیا!
دین احمد کا جہاں میں بول بالا کر دیا!

یہ بغداد ہے۔ اسلامی سلطنت کا دار الخلافہ ہے۔ ہارون الرشید ''ایوان خلافت'' میں تخت نشین ہیں۔ دربار میں علماء کرام کا ایک مجمع ہے اس مجمعے میں مدنی، مکی، کوفی اور شامی اہل علم کا وسیع حلقہ موجود ہے۔ ہارون الرشید کے دائیں ہاتھ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد رشید امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کرسی عدل پر تشریف فرما ہیں۔ اسلام کی وسیع سلطنت کے گوشے گوشے سے لوگ آ رہے ہیں۔ ہارون الرشید کے دربار میں علم کے خزانے لٹائے جا رہے ہیں۔ عدل و انصاف کے قبالے تقسیم ہو رہے ہیں۔ افریقہ کے مغربی ساحل سے لے کر سمر قند و بخارا کی سرحدوں تک اسلام کے زریں قوانین کا نفاذ ہو رہا ہے۔ دنیا ان قوانین سے استفادہ کر رہی ہے۔ علم و فضل کے قافلے

مشرقی سرحدوں تک پھیلائے جا رہے ہیں۔ احادیث و فقہ کے کاروان افریقی صحراؤں تک پہنچ رہے ہیں۔ یہ دوسری صدی ہجری ہے۔ ہر شہر، ہر قریہ، اسلام کی علمی فضاؤں سے معمور ہو رہا ہے۔ ہارون الرشید کے بیٹے مامون الرشید نے علمی اقدار کو پھیلانے میں مثالی کردار ادا کیا اور خاندان عباسیہ کی خدمات پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے اور عراق کی سرزمین کو جس قدر ہدیہ تحسین پیش کیا جائے وہ کم ہے۔

ہجرت کو ۶۵۵ سال گزر گئے ہیں آج خلیفہ معتصم باللہ تخت نشین ہے وہ عیش و عشرت کے مسلمان معاشرے کا سربراہ ہے۔ بغداد ''طاؤس و رباب'' کی چنگاڑوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ ادھر تاتار سے اٹھنے والے طوفان مسلمان حکومتوں کو تہ و بالا کرتے ہوئے بغداد کی دیواروں تک آ پہنچے ہیں۔ چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں قیامت بن کر بغداد پر ٹوٹ پڑا ہے۔ ایک کروڑ مسلمانوں کی گردنیں کٹ چکی ہیں، شہروں کے شہر صفحہ ہستی سے مٹ گئے ہیں۔ مدرسے، خانقاہیں، مسجدیں اور کتب خانے جلا دیے گئے ہیں۔ دجلہ کا پانی انسانی خون سے سرخ ہو گیا ہے مسلمانوں کی لاشوں سے دریائے فرات اٹ گیا ہے۔ بغداد کے کتب خانوں کی لاکھوں کتابوں کو اٹھا کر دجلہ میں پھینک دیا گیا ہے۔ کتابوں کا پل بنا کر اوپر سے ہلاکو خان کے گھوڑے دوڑتے ہوئے بغداد شہر میں داخل ہوئے۔

ہلاکو خاں جشن فتح منانے کے لیے بغداد میں قصر خلافت کے اس تخت پر بیٹھا ہے جہاں معتصم باللہ بیٹھا کرتا تھا۔ آج مسلمانوں کا خلیفہ معتصم باللہ قیدی کی حیثیت سے پاؤں میں بیڑیاں ڈالے ہوئے سامنے لایا گیا ہے۔ ہلاکو خان نے اسے کہا معتصم باللہ، میں فاتح ہوں! میں قاتل ہوں! میں ہلاکو خاں ہوں! مجھے اپنی سب سے

محبوب چیز نذرانہ پیش کرو۔ معتصم باللہ نے اپنے خزانوں کی کنجیاں ہلاکو خاں کے حوالے کر دیں۔ اس میں جواہرات تھے اور اشرفیاں تھیں۔ ہلاکو خاں نے کہا یہ اشرفیاں جو تم نے جمع کر رکھی ہیں ان کو کھاؤ۔ تم نے اپنے خزانے نہ عوام پر خرچ کیے، نہ فوج تیار کی۔ ہلاکو خاں نے مزید کہا مسلمانوں کے اس زر پرست خلیفہ کو قالین میں لپیٹ کر ہلاک کر دو۔ اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے باہر پھینک دو۔ اس کی دولت نہ عوام کے کام آئی نہ اس نے لشکر تیار کیے۔ اس کا مرنا ایسا ہی مرنا ہوگا۔

اگرچہ آج عراق کی ساری زمین دشمنان دین کے نرغے میں ہے شہروں قصبوں کے علاوہ بیابانوں اور ویرانوں میں بھی امریکہ کی فوجیں دندنا رہی ہیں۔ عراق کا آسمان ان توپوں اور میزائلوں کی گھن گرج سے قیامت برپا کر رہا ہے۔ مگر آپ پروانہ کریں۔ اس شور و شغب سے بے نیاز ہو کر ہمارے ساتھ چلیں ہم آپ کو حضرت شیث علیہ السلام کے مزار پر لے چلتے ہیں، حضرت ہود علیہ السلام کا مزار دکھاتے ہیں، حضرت یونس علیہ السلام کی زیارت گاہ پر چلتے ہیں۔ اگر آپ تھک جائیں تو ہمارے ساتھ تھوڑا سا سفر اور کریں تو آپ کو حضرت صالح علیہ السلام کی زیارت بھی کروائیں گے۔

عراق کی سرزمین میں ایک سو ایک انبیاء کرام آرام فرما ہیں۔ مگر ہم جب تاریخ کے جھروکوں سے جھانکتے ہیں تو ہمیں وہاں بے شمار بزرگان دین سوئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بغداد کا شہر تو "مدینۃ الاولیاء" ہے "عروس البلاد" ہے۔ "مرجع علم وفضل" "خیابانِ تصوف و عرفان" ہے۔ اس ملک کے ہر شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ اور گوشے گوشے میں اسلام کے درخشندہ ستارے سو رہے ہیں۔

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ ..... بغداد کی ایک شاہراہ پر سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار گوہر بار ہے اور دربار ضیا بار ہے۔ جہاں اولیائے جہاں اپنی گردنیں جھکا کر آتے ہیں اور اپنی ولایت کی سند لے کر جاتے ہیں۔ آپ کا مزار "باب الشیخ" میں واقع ہے۔ آیئے قدم بڑھایئے۔ گردن جھکایئے بغداد کی گلیوں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھیں اور دیکھیں! وہ ایک بوڑھا عراقی کھڑا ہے۔ اس کو شیخ سیدنا عبدالقادر جیلانی کے مزار تک ساتھ لے چلتے ہیں اور دربار غوثیہ پر حاضری دیتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بوڑھا عراقی ابھی جیلان سے چل کر آیا ہے۔ ہماری التماس پر ہمیں ساتھ لے کر حضور کے دربار کی طرف چل پڑے گا۔ ہم ایک پل سے گزریں گے پھر ایک چوک میں آ جائیں گے۔ اب دائیں ہاتھ مڑ جائیں پھر سیدھے حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ کا مزار جگمگ جگمگ کرتا دکھائی دے گا۔ یہاں امام الاولیاء آرام فرما ہیں۔ ایوان غوث اعظم کی دہلیز پر پہنچ کر "قدمك علیٰ عینی وراسی" کہہ کر داخل ہو جائیں۔ چوکھٹ کو بوسہ دیں۔ پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں۔ فاتحہ پڑھیں ایک نظر ادھر بھی دیکھیں کہ حضرت غوث اعظم کے ایک بیٹے سیدنا عبدالجبار کا مزار بھی پاس ہی ہے۔ اب اور آگے بڑھیں اور جناب غوث پاک کی وہ عظیم الشان مسجد ہے جہاں حضرت سیدنا غوث اعظم خطاب فرمایا کرتے تھے اور مشرق و مغرب کے شیوخ گردنیں جھکا کر آپ کا خطاب سنا کرتے تھے۔ آج صدیاں گزر گئیں بمباری کے باوجود آپ کا مزار محفوظ ہے۔ مصیبت زدہ لوگ ہمہ تن عقیدت بن کر قطار در قطار سر جھکائے چلے آ رہے ہیں اور ان کی زبان سے یہ آواز آ رہی ہے۔

تو ہے وہ غوث کہ ہر غوث ہے شیدا تیرا — تو ہے وہ غیث کہ ہر غیث ہے پیاسا تیرا
سورج اگلوں کے چمکتے تھے چمک کر ڈوبے — افق نور پہ ہے مہر ہمیشہ تیرا
راج کس شہر میں کرتے نہیں تیرے خدام — باج کس نہر سے لیتا نہیں دریا تیرا
مزرع چشت و بخارا و عراق و اجمیر — کون سی کشت پہ برسا نہیں جھالا تیرا

سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ...... بغداد کا محلہ ”اعظمیہ“ حضرت امام ابوحنیفہ کے اسم مبارک سے منسوب ہے یہ ”شارع اعظم“ پر واقع ہے۔ دنیائے علم وفقہ کے یہ عظیم امام جس شان سے سوئے ہوئے ہیں اس پر حاضری کے وقت ”فدائیت ہزار دل وجاں“ کہہ کر آگے بڑھیے۔ آپ کی خوبصورت مسجد کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ دنیا وجہاں چھوڑ کر پھر پڑھنے بیٹھ جائیں۔ ہر طرف خوشبوؤں کے قافلے زائرین کو خوش کر رہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ امام ابو یوسف ہی نہیں، امام بخاری، امام مسلم جیسے سیکڑوں علم وفضل کے آفتاب وماہتاب امام اعظم کی مسجد میں موجود ہیں۔ امام اعظم کے مزار کے پہلو میں حضرت شیخ شبلی، حضرت بشر حافی، خواجہ غریب نواز معین الدین اجمیری کے والد گرامی اور سید ابوالحسن نوری کے مزارات اسی محلہ میں ہیں۔ امریکیوں نے بغداد شہر پر بمباری کر کے ’مسجد امام ابوحنیفہ‘ کے درودیوار ہلا دیے تھے پھر صدام حسین کی موت کی خبر اڑا کر ساری دنیا کو ماتم کناں بنا دیا تھا۔ مگر اٹھارہ اپریل کو نماز جمعہ کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ صدر صدام حسین کسی غار سے نکل کر پہلے امام ابوحنیفہ کے مزار پر حاضر ہوا۔ نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہو کر ہزاروں عراقی مسلمانوں کے ”نعرۂ تکبیر“ میں گھر گیا۔ عراقیوں نے انہیں دیکھ کر خوش آمدید کہا امریکہ مردہ باد کے نعرے لگائے۔ اس مجمعے میں بڑا جوش وخروش تھا مگر صدام حسین اپنے ساتھیوں سمیت دیکھتے

دیکھتے غائب ہو گیا۔

انسانوں کا ایک ہجوم ہے۔ امام ابوحنیفہ کے مزار اقدس سے متصل مسجد کا صحن اور گرد ونواح کی گلیاں لوگوں سے بھر گئی ہیں۔ امام اعظم کے تصور سے اقبال کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ اس امت نے کیسے کیسے جری لوگ پیدا کیے۔ بغداد کے بطن میں کیسے کیسے گراں قیمت ہیرے دفن ہیں۔ کوفہ میں پیدا ہونے والے امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت نے امیر شہر کے مظالم سے تنگ آ کر ہجرت کی راہ اختیار کی اور مکہ معظمہ جا پہنچے۔ کئی سال وہاں گزار دیے۔ معلوم ہوا کہ خلیفہ ابوجعفر منصور دریائے دجلہ کے کنارے نیا شہر آباد کر رہا ہے۔ حضرت نعمان بن ثابت بغداد آئے اور دیکھتے دیکھتے علم وفضل کے چرچے نے انہیں امام اعظم، امام ابوحنیفہ کے نام سے معروف کر دیا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ میری حکمرانی کو معتبر بنانے کے لیے آپ کوئی بڑا سرکاری منصب قبول کر لیں امام ابوحنیفہ انکار کرتے رہے۔ ضد بڑھی تو آپ نے کہا مجھے سرکاری احکام پر مسجد کے ستون گننے پر بھی لگا دیں تو میں قبول نہیں کروں گا۔ کچھ عرصہ بعد خلیفہ نے فرمان جاری کیا کہ آپ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے منصب جلیلہ پر فائز ہو جائیں۔ آپ راضی نہ ہوئے خلیفہ کی انا پر ضرب لگی۔ امام اعظم کو زنداں میں ڈال دیا گیا۔ وہ پھر بھی نہ مانے۔ ایک سو دس کوڑوں کی سزا سنائی گئی۔ آپ نے کوڑے کھا لیے لیکن منصب قبول نہ کیا۔ مورخین کی اکثریت کا کہنا ہے کہ ۷۰ سال کی عمر میں زنداں میں ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے مزار کی نسبت سے عراق کا یہ پورا علاقہ ”اعظمیہ“ کہلاتا ہے۔ امام شافعی کا یہ قول مشہور ہے میں امام ابوحنیفہ سے برکت حاصل کرنے روزانہ ان کی قبر پر جاتا ہوں۔

اور یہ جمعۃ المبارک کا دن تھا اور ایک لاکھ سے زائد عراقی برکت لینے امام اعظم کے مزار کے گرد جمع تھے۔ پھر وہ بڑی سڑک پر آئے بازو لہراتے، نعرے لگاتے ہوئے ہمیں صدام نہیں چاہیے، ہمیں بش نہیں چاہیے "ہمیں صرف اسلام چاہیے!" غاصب امریکیو! یہاں سے نکل جاؤ۔ مسجد امام ابوحنیفہ کے امام شیخ احمد القبیسی نے مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ہمیں بتایا جاتا تھا کہ امریکی قانون اور حقوق انسانی کا احترام کرتے ہیں۔ وہ پڑھے لکھے اور مہذب ہیں لیکن وہ تو ظلم اور درندگی کے سفیر نکلے۔ انہیں اپنی سرزمین سے نکال دو۔ یہ ہماری دولت پر قبضہ کرنے آئے ہیں ہمیں سیکولرازم نہیں اسلام چاہیے۔ ایک لاکھ سے زائد عراقی ہاتھوں میں قرآن اور جائے نمازیں لیے نعرہ زن تھے۔ آخری لکیر پر مظاہرین کو روک لیا گیا۔ ایک تیس چالیس سالہ شخص چیختا ہوا آگے بڑھا۔ امریکی میرین نے بندوق کی نالی اس کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا' رک جاؤ! ورنہ تمہیں شوٹ کردوں گا۔ عراقی اپنے بدن میں دوڑتے لہو کے ایک ایک قطرے کی توانائی مجتمع کرتے ہوئے چیخا ہاں مجھے شوٹ کردو لیکن میری زمین سے دور نکل جاؤ۔ امام ابوحنیفہ کی لازوال عظمتوں کو اس سے بہتر خراج تحسین پیش کرنا مشکل تھا" بشکریہ ...... (عرفان صدیقی (نقش خیال) نوائے وقت مورخہ ۲۱ اپریل ۲۰۰۳ء)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ...... اسلامی علوم کے قافلہ سالار ہیں چار سو پانچ ہجری میں طوس کے ایک گاؤں "غزال" میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے "عروس البلاد بغداد" کو علوم اسلامیہ کا گہوارہ بنادیا تھا۔ بغداد میں سب سے بڑے قبرستان "باب الشیخ" میں

امام غزالی کا مقبرہ نمایاں نظر آتا ہے۔

ممتاز بزرگان دین کے مزارات ...... دریائے دجلہ کے کنارے پر ایک بہت بڑا قبرستان ہے۔ حضرت معروف کرخی، حضرت جنید بغدادی، حضرت ذوالنون مصری، حضرت سری سقطی، حضرت ابراہیم خواص، حضرت یوشع بن نون (علیہ السلام)، حضرت بہلول دانا، حضرت حبیب عجمی، حضرت شاہ منصور حلاج، حضرت بشر حافی، شیخ داؤد طائی اور تفسیر روح المعانی کے مصنف، بغداد کے اسی قبرستان میں آرام فرما ہیں۔

(رحمۃ اللہ علیہم)

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ...... امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے قابل اور لائق شاگرد ہیں۔ وہ سلطنت عثمانیہ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے اسلامی قوانین کے اجراو نفاذ میں زندگی بھر مصروف رہے۔ ۱۸۲ ہجری میں فوت ہوئے اور بغداد کے ایک محلہ "کاظمین" میں آرام فرما ہیں۔

منصور حلاج (حسین بن منصور حلاج) ..... دنیائے اسلام کے ایک بلند پایہ صوفی ہیں اور عشق و محبت کی مثالی شخصیت ہیں۔ "انا الحق" کا نعرہ آپ نے ہی بلند کیا تھا اور تختہ دار پر کھڑے ہو کر جان دی تھی۔

عمرے است کہ آوازۂ منصور کہن شد   من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ .... "سلسلہ سہروردی" کے بانی ہیں۔ آپ نے بڑے بڑے اولیاء اللہ کی تربیت کی جنہوں نے دنیا بھر میں "سلسلہ سہروردیہ" کی خانقاہوں کی بنیادیں رکھیں۔ حضرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانی

، مخدوم نظام الدین غزنوی، مخدوم یحییٰ منیری، مخدوم شہاب الدین عظیم آبادی، حضرت شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے ہی تربیت یافتہ تھے۔آپ سیدنا غوث اعظم سے خرقہ ولایت لے کے نکلے تو "سلسلہ سہروردیہ" کی خانقاہیں آباد کیں اور دنیائے اسلام کو روحانیت سے مالا مال کر دیا۔ سلسلہ سہروردیہ نے برصغیر پاک وہند میں خصوصی طور پر روحانیت کو فروغ دیا۔۶۳۲ھ میں فوت ہوئے آپ کا مزار پرانوار "محلہ شیخ عمر" شاہراہ عمر پر واقع ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ...... اہلسنت کے چوتھے امام ہیں۔آپ کا سلسلہ حنبلی دنیائے اسلام کی فقہی اور شرعی راہنمائی کرتا ہے۔آپ امام شافعی کے شاگرد رشید تھے بغداد میں ۱۶۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ھ میں فوت ہوئے۔آپ نے عباسی اقتدار کے سامنے کلمہ حق کہہ کر اہل حق کی قیادت کی۔قید و بند میں رہے۔ بدن پر سیکڑوں کوڑے کھائے مگر قرآن پاک کو "مخلوق" ماننے سے انکار کر دیا۔سرکاری علماء کے فتووں کی زد میں رہے لیکن سر نہیں جھکایا۔ دریائے دجلہ کے کنارے ایک خوبصورت گنبد میں آپ کا مزار واقع ہے۔یہ مزار "محلہ اعظمیہ" کے قریب ہے یہاں قریب ہی حضرت حماد اور شیخ ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہما آرام فرما ہیں۔

کاظمین شریف علی صاحبہا السلام.....بغداد شہر کا شمالی علاقہ "کاظمین" کہلاتا ہے۔ یہ حضرت امام محمد موسی کاظم رضی اللہ عنہ اور امام محمد کاظم کی وجہ سے "کاظمین" کے نام سے مشہور ہے۔ان مزارات کی خوبصورتی قابل دید ہے۔تمام مزارات کے در و دیوار پر سونے کی نقاشی اور جواہرات کی مینا کاری ہوئی ہے۔ان

مزارات پر ہر طبقہ کے مسلمان حاضر ہوتے ہیں زیارت کرتے ہیں اور فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔

بغداد شہر سے ذرا باہر آئیں چند میل کے فاصلے پر بیت المقدس کو جانے والی سڑک پر ایک قصبہ "فلوجہ" ہے۔یہاں دینی علوم کی بہت بڑی درسگاہ ہے۔اس درس گاہ میں کتابیں پڑھنے کے علاوہ لباس، خوراک، اخلاق اور عادات کی تربیت بھی دی جاتی ہے تاکہ یہاں کا طالب علم دنیا کے کسی گوشے میں جائے تو اسلامی معاشرت اور دینی روایات کا نمونہ نظر آئے۔اس علاقے کے اردگرد میل ہا میل تک کھجوروں کے باغات ہیں جنہیں دیکھ کر طیبہ کی کھجوروں کے باغوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

مدائن شہر..... بغداد سے پچیس میل دور جائیں تو آپ کو مدائن کا وہ شہر نظر آئے گا جہاں کبھی سلطنت روم کا دارالخلافہ تھا۔ جسے خالد بن ولید نے فتح کیا تو یہاں سے اتنا مال غنیمت دارالخلافہ مدینہ منورہ کو بھیجا گیا کہ مدینہ پاک کا بچہ بچہ نہ صرف دولت مند ہو گیا بلکہ اس شہر میں زکوۃ اور صدقہ لینے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔سیدنا عمر فاروق نے لوگوں کو یا عام لوگوں کو تو مالا مال کر دیا مگر خود اسی انداز میں اپنے پرانے گھر میں رہائش پذیر رہے۔

کسریٰ کے تاج روندتے تھے پاؤں کے تلے　　اک بوریا کھجور کا گھر میں بچھا ہوا
تھے دوسروں کے واسطے سیم و زرو گہر　　اپنا یہ حال تھا کہ تھا چولہا بجھا ہوا

یہاں صحابی رسول حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مزار ہے یہ رسول اللہ ﷺ کے بڑے پیارے صحابی تھے۔انہی کے مشورہ سے مدینہ پاک کے دفاع کے لیے خندق کھودی گئی تھی۔ جہاں جنگ خندق یا غزوۂ احزاب لڑی گئی تھی۔عراق فتح

ہوا تو امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت سلمان فارسی کو عراق کا گورنر بنا کر مدائن بھیج دیا۔ آپ کا یہاں ہی وصال ہوا اس شہر کا اسلامی نام ''مدینہ سلمان'' رکھا گیا۔

حضور کے دو صحابی حضرت سلمان فارسی کے پہلو میں آرام فرما ہیں ان میں ایک حضرت حذیفہ یمانی اور دوسرے حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہما ہیں۔ آج سے ستر سال قبل جب عراق پر شاہ فیصل حکمران تھا ان دونوں صحابہ کی قبریں کھودنی پڑی تھیں۔ جب انھیں باہر نکالا گیا تو ان دونوں حضرات کے اجسام ابھی تک تازہ تھے۔ جیسے وہ فوت نہیں ہوئے سو رہے ہیں۔ قبریں کھودنے سے پہلے شاہ فیصل نے دنیا بھر میں اعلان کیا کہ جو لوگ ان صحابہ کی زیارت کرنا چاہیں تو وہ عراق آ جائیں۔ ہزاروں لوگ مختلف ممالک سے عراق جا پہنچے ان صحابہ کے اجسام کو اپنی اصل حالت میں دیکھا۔ ان دنوں پاکستان کے سفیر اور ان کے رفقا نے بھی ان صحابہ کرام کے اجسام کی زیارت کی اور ان مشاہدات کو پاکستان کے سرکاری گزٹ میں شائع کیا گیا اور مقامی اخبارات میں تفصیلات سے پاکستان کے لوگوں کو آگاہ کیا۔

حضور نبی کریم ﷺ کے یہ دونوں صحابہ فتوحات عراق کے معرکوں میں موجود رہتے تھے۔ ''جنگ قادسیہ'' میں داد شجاعت دیتے رہے۔ ''مدائن'' فتح ہوا تو اسلامی لشکروں میں صف اول میں نظر آتے۔ تیرہ سو سال گزرنے کے بعد شاہ فیصل والی عراق کو حضور نبی کریم ﷺ نے خواب میں فرمایا کہ میرے جاں نثاروں کی قبروں کی طرف توجہ دیں۔ پھر یہ دونوں صحابہ کرام شاہ فیصل کو خواب میں ملے اور بتایا کہ ہماری قبروں کے نزدیک دریا دجلہ کا پانی پہنچ چکا ہے۔ شاہ فیصل نے اسے عام خواب جانا مگر

دوسرے ہفتے ان صحابہ نے اسے دوبارہ آگاہ کیا۔ عراق کے چیف جسٹس کو بھی خواب میں آگاہ کیا کہ شاہ فیصل کو ہماری اس تکلیف پر آگاہ کریں۔ عراق کے چیف جسٹس نے قرآن وسنت کی روشنی میں شاہ فیصل کو سمجھایا کہ یہ محض خواب نہیں۔ دوسری طرف چیف جسٹس نے علماء ومشائخ کو اکٹھا کیا۔ اس واقعہ پر غور کرنے کے بعد شاہ فیصل نے علماء ومشائخ کے سامنے اعلان کیا اور شاہ فیصل نے عالم اسلام کے حکمرانوں کو ایک پیغام بھیجا کہ وہ عید الاضحیٰ کے موقع پر ان صحابہ کے مزارات کی کھدائی کروائیں گے۔ دنیا اسلام کے مختلف شہروں سے لوگ جوق در جوق پہنچنے لگے۔ اخبارات، ریڈیو کے نمائندے اپنے اپنے کیمرے لے کر عراق گئے۔ دریائے دجلہ کے دونوں طرف میل ہا میل تک خیمے نصب کر دیئے گئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک نیا شہر آباد ہو گیا ہے۔

عید الاضحیٰ کے روز دن کے بارہ بجے لاکھوں انسانوں کی موجودگی میں ان دو صحابہ کرام کے مزارات کھولے گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ دونوں اجسام تر وتازہ ہیں اسلامی ممالک کے سربراہوں، سفیروں اور اخباری نمائندوں نے ان صحابہ کے اجسام بچشم خود دیکھنے کی سعادت حاصل کی۔ چیف جسٹس عراق، شاہ فیصل، مصر کے شاہ فاروق اور ترکی کے وزیر مختار نے اپنے ہاتھوں سے ان اجسام قدسیہ کو اٹھایا اور چارپائی پر رکھ کر کندھا دیا۔ اس موقع پر جرمن کی ایک فلمساز کمپنی نے حکومت عراق کی اجازت سے تیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا ٹیلی ویژن سکرین کے لیے ایک اسٹیج بنایا اور اس پر ایک کیمرہ نصب کیا گیا۔ پھر دور دور تک یہ سکرینیں نصب کی گئیں تا کہ لوگ جہاں بھی کھڑے ہیں ان اجسام کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ اسی روز جرمن کا ایک مشہور ماہر چشم ڈاکٹر بھی پہنچا تھا۔ اس نے ان اجسام مقدسہ کے قریب ہو کر صحابہ کرام کی آنکھوں

کی پتلیوں کا مشاہدہ کیا اس نے دیکھا کہ ان صحابہ کرام کی آنکھیں ابھی تک روشن ہیں۔ مگر جب دیکھتے وقت اس نے ہاتھ بڑھایا تو غیب سے اسے ایک آواز سنائی دی کہ اپنے ہاتھوں کو دور رکھو کہ ہمارے چہروں کو حضور نبی کریم نے چھوا ہے اور ہماری ان آنکھوں نے حضور کے چہرہ انور کو ہزار بار دیکھا ہے۔ تم غیر مسلم ہو ہمیں ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ یہ آواز سن کر ڈاکٹر کانپ گیا۔ اس نے تمام مجمعے کے سامنے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ اس کیساتھ جتنے یہودی اور عیسائی ڈاکٹر آئے تھے انہوں نے بھی کلمہ پڑھا اور سب کے سب مسلمان ہوگئے۔ ان صحابہ کے اجسام کو وہاں سے اٹھایا اور سربراہ مملکت اسلامیہ کی موجودگی میں اس قبرستان میں لاکر دفن کیا گیا۔ رضی اللہ عنہما۔

نوشیرواں کے محلات......... حضرت سلمان فارسی کے مزار سے تین فرلانگ کے فاصلہ پر نوشیروان عادل کے محلات کے کھنڈرات ہیں جہاں وہ بیٹھ کر عدل وانصاف کے فیصلے دیا کرتا تھا۔ آج بھی اس کے ایوان عدل کی بلند وبالا محرابیں موجود ہیں یہ وہی محلات ہیں جن کے چودہ کنگرے (مینار) حضور نبی کریم کی پیدائش پر گر گئے تھے۔ اس شہر سے دور فارس کا 'آتش کدہ' تھا جو بجھ گیا تھا اور یہاں سے کئی سو میل دور دریائے ساوا بہتا تھا خشک ہوگیا تھا۔

موصل شہر کی گلیاں........ پچھلے دنوں برطانیہ اور امریکہ کے جہازوں اور میزائلوں نے موصل شہر پر زبردست بمباری کی تھی۔ بغداد کی طرح موصل شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہزاروں عراقی مسلمان شہید کردیئے گئے۔ موصل ایک قدیم اور

تاریخی شہر ہے۔ اس میں کئی انبیاء کرام کی قبریں ہیں۔ حضرت شیث علیہ السلام، حضرت دانیال علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام کے مزارات اسی شہر کے اردگرد ہیں۔ پھر ہزاروں اولیاء اللہ اس وادی میں آرام فرمارہے ہیں، یہ شہر حلب، حمص کی سڑک پر واقع ہے۔ جو آگے جاکر شام اور ترکی کو نکل جاتی ہے۔

آؤ سامرہ دیکھیں......... بغداد سے ستر میل دور موصل کو جانے والی شاہراہ پر دریائے دجلہ کے کنارے ایک شہر ہے جسے "سامرہ" کہتے ہیں۔ اس شہر کا قدیم نام "سرمن ارانی ہے" جس نے مجھے ایک بار دیکھ لیا خوش ہوگیا۔ یہ لفظ عام لوگوں کی زبانوں پر پایا تو اسے "سامرہ" بنادیا گیا۔ بعض لوگ اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے "سامری" کے نام سے بھی نسبت قائم کرتے ہیں۔ "سامرہ" کئی سال تک عباسی حکومت کا پایہ تخت رہا ہے۔ وہ عراق کا دارالخلافہ تھا۔ حضرت امام تقی علی اور حضرت امام حسن عسکری رضی اللہ عنہما کے مزارات اسی شہر میں ہیں۔ یہاں ایک عظیم الشان مسجد ہے اس شہر کی شان وشوکت دیکھ کر آپ کا دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔

قادسیہ کے درودیوار...... قادسیہ بڑا پرانا تاریخی شہر ہے۔ جب اسلامی فوجیں آئیں تو اس شہر کو بچانے کے لیے اس وقت کے حکمرانوں نے تین لاکھ فوج کھڑی کردی تھی۔ جب غازیان اسلام حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کمان میں پہنچے تو یہ فوجیں دیوار بن گئیں۔ کئی دن کی جنگ کے بعد مسلمانوں نے کفار کی تین لاکھ فوج کو چاروں طرف سے روند کر تباہ کردیا۔ اور سرزمین "قادسیہ" پر اسلام کے جھنڈے لہرانے لگے۔ اگرچہ آج یہ شہر شان وشوکت کا مالک نہیں رہا مگر اسلامی تاریخ میں اس کا

نام درخشاں ہے قادسیہ کی جنگ میں حضور نبی کریم کے جاں نثار صحابہ نے بڑی
قربانیاں دیں، بڑی جانیں قربان کیں۔ یہاں مجاہدین اسلام کی بے نام ونشان قبریں
آج بھی اسلام کی عظمت کی ضیا باریاں کرتی نظر آتی ہیں۔

یہ ریگ وسنگ کے تودے، یہ قبریں پاکبازوں کی
انہی سے آج دنیا بس رہی ہے سرفرازوں کی
یہی تھے شمع دیں کے اولیں پر سوز پروانے
صداقت کیش غازی، بادۂ غیرت کے مستانے
انہی روشن چراغوں سے زمانہ میں اجالا ہے
خدا کا اور محمد مصطفیٰ کا بول بالا ہے
وہ شعلہ جس سے اب تک عشق کی گرمی ہویدا ہے
اسی معنی میں پنہاں ہے اسی صورت سے پیدا ہے

حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت گاہ...... عراق میں ایک شہر جس کا نام ''مسیب'' ہے۔ حضرت مسلم بن عقیل اور ان کے دو صاحبزادوں حضرت محمد اور حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہما کے مزارات کی وجہ سے یہ مرجع خلائق ہے۔ بغداد سے کربلا کو جاتے ہوئے یہ شہر راستے میں آتا ہے یہ وہی شہر ہے جہاں سے شیعان علی نے ہزاروں خط لکھ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ آنے کی دعوت دی تھی۔ جب آپ نے مسلم بن عقیل اور ان کے دو صاحبزادوں کو وہاں بھیجا تو کوفہ کے گورنر ابن زیاد نے اس شہر میں پہنچ کر نہایت بے دردی سے حضرت مسلم اور ان کے دونوں بیٹوں کو شہید کر دیا تھا۔ شیعان علی نے پہلے تو آپ کے ہاتھ پر بیعت کی پھر ابن زیاد کے ڈر سے غدار ہو گئے۔ اس شہر میں داخل ہوتے ہی ان معصوم شہزادوں کی مظلومیت اور ابن زیاد کی سفاکی کی تصویر سامنے آتی ہے تو آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ مسیب سے ایک میل آگے جائیں تو سیدہ زینب بنت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما کے لخت جگر حضرت عون رضی اللہ عنہ کا مزار ہے۔

کربلا کی خونچکاں سرزمین...... تاریخ اسلام میں کربلا کی سرزمین خون حسین سے رنگین ہے۔ یہ شہر بغداد سے تقریباً ایک سو میل دور ہے اس مقام پر یزید کے ہاتھوں اہل بیت پر جو کچھ گزری سو گزری وہ تو ایک خونچکاں داستان ہے مگر پچھلے ماہ امریکی اور برطانوی حملہ آوروں کی بمباری نے ظلم وستم کی ایک نئی داستان لکھی۔ کربلا کے لوگوں نے امریکی حملہ آور لوگوں کے سامنے بہادرانہ کردار ادا کیا اور اپنی جرأت اور بہادری کا جو مظاہرہ کیا تو اس کی مثال نہیں ملتی۔ گو یہ شہر تباہ ہو گیا ہے۔ ہزاروں لاشے خاک وخون میں تڑپے ہیں مگر کربلا پھر بھی کربلا ہے۔

اے کربلا کی خاک تو اس احساں کو نہ بھول   تڑپی ہے تجھ پہ لاش جگر گوشہ بتول

یہ وہ مقام ہے جہاں نواسہ رسول شہید ہوئے تھے۔ جہاں اہل بیت کا باغ اجاڑ گیا تھا جہاں ظلم وستم کی خونچکاں داستانیں رقم کی گئی تھیں۔ جہاں سے تاریخ اسلام کے صفحات میں قربانی اور حق پر جان دینے کا سبق محفوظ کیا گیا تھا جہاں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا جسد پاک آرام فرما ہے۔

وہ کہ شرح مصطفیٰ ''تفسیر حیدر'' وہ حسین
لاکھ پر جس کے ہوئے بھاری بہتر، وہ حسین

وہ کہ سوزِ غم کو سانچے میں خوشی کے ڈھال کر
مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

کربلا میں ایک بڑا معرکہ ہوا، حق و باطل کی آویزش ہوئی، حق پر جان دینے والوں نے اسلام کی بنیادیں مضبوط کر دیں۔

سر داد نہ داد دست در دست یزید　　حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسین

یہ وہ شہر ہے جہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی گود میں حضرت علی اصغر سوئے ہوئے ہیں۔ یہ وہ شہر ہے جہاں حضرت حسین کے پہلو میں حضرت علی اکبر آرام فرما ہیں۔ یہ وہ شہر ہے جہاں حضرت عباس علمدار حضرت حُر اور اس کے ستر جاں نثاروں کے ساتھ آرام فرما ہیں۔

اسی زمانے میں یہ شہر ایک لق و دق میدان میں آباد تھا۔ بے آب و گیاہ زمین تھی۔ فرات کی لہریں رک رک کر چلتی تھیں۔ اور..... گھٹا آتی روتی روتی لیکن رو نہیں سکتی..... کا سماں تھا۔ چٹیل میدان تھا، مگر آج کربلا کا شہر اہل محبت کا شہر ہے اہل عشق کا شہر ہے اہل درد کا شہر ہے دنیائے اسلام کے گوشے گوشے سے لوگ آتے ہیں۔ شہداء کربلا کے مزارات کی زیارت کرتے ہیں۔ تاہم کربلا کی قدیم یادوں کو تازہ رکھنے کے لیے اگر آپ نجف اشرف کا سفر کریں تو راستہ آج بھی صحرا و بیابان لق و دق سے گزرتا ہے آج بھی بے آب و گیاہ آبادیاں کربلا کی یاد کو تازہ کرتی دکھائی دیتی ہیں۔!

حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نجف اشرف میں آرام فرما ہیں..... کربلا سے دس میل کے فاصلے پر ''نجف اشرف'' ہے یہ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا شہر ہے۔ آپ کا مزار مرجع خلائق ہے اسی شہر کے اردگرد حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت ہود علیہ السلام آرام فرما ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے روضہ انور کے ارد گرد ہزاروں اولیاء اللہ سوئے ہوئے ہیں ان میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کا مزار ہے۔ سیکڑوں جاں نثاران علی آرام فرما ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا روضہ ایک عظیم الشان عمارت میں ہے۔ درو دیوار سونے اور چاندی کے نقوش سے مزین ہیں۔ صبح و شام زائرین کے قافلے آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں۔ اس شہر پر امریکی بمباروں نے بے پناہ آگ برسائی مگر بایں ہمہ یہ شہر اپنی آب و تاب سے کھڑا ہے۔

کوفہ ..... علم و ادب کا گہوارہ ..... نجف اشرف سے پانچ سات میل کے فاصلے پر کوفہ کا تاریخی شہر آباد ہے اس کی عظمت کو سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے شہرت دوام بخشی ہے۔ آپ نے مدینہ کو چھوڑا، بصرہ آئے، پھر کوفہ کو اپنا ''دارالخلافہ'' بنایا۔ یہ شہر اس قدر آباد ہوا کہ مدینہ کے بعد اسلامی علوم کا مرکز بن گیا۔ یہاں سے دینی علوم کے کاروان مشرق اور مغرب کو روانہ ہوئے اس میں ہزاروں صحابہ کرام آرام فرما ہیں۔ امام اعظم سیدنا امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے اس شہر کو فقہ اور دین کا علمی منبع بنا دیا تھا۔ یہاں سے سیکڑوں افراد علم و فضل کی جھولیاں بھر کر نکلے اور زمانہ بھر کو سیراب کرتے گئے...! سی دریا سے یہ نہریں ہوئیں جاری ساری.... کوفہ میں ایک عظیم الشان مسجد ہے اور یہ ''مسجد انبیاء'' کہلاتی ہے۔ حضرت علی نے اسی مسجد میں جام شہادت نوش فرمایا تھا۔

کسے را میسر نہ شد ایں سعادت　　بہ کعبہ ولادت بہ مسجد شہادت

اس مسجد کے پہلو میں حضرت امام مسلم اور حضرت ہانی بن عروہ کے مزارات
ہیں۔اب کوفہ شہر پھیلتا چلا گیا۔اس نے اپنے تجاوزات میں حضرت یونس علیہ السلام کے
مزار کو لے لیا ہے۔اس شہر کے قریب ہی دریا فرات بہ رہا ہے۔جس کے کنارے
اسلامی تاریخ کی سیکڑوں داستانیں لکھی گئی ہیں۔آج بھی امریکیوں نے دریائے
فرات کے کنارے پر شمر اور ابن زیاد کی فوجوں کے مظالم کو دہرایا ہے۔حضور کے
پیارے صحابی سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کا مزار یہاں ہی ہے۔

دریائے فرات کے کنارے..... آج ہم دریائے فرات کے کنارے پر
کھڑے ہیں۔دور دور تک نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمارے سامنے اسلامی تاریخ کے
خونچکاں صفحات پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔دور دور تک نگاہ جاتی ہے تو اشک رواں کی
لہریں بہتی ہوئی نظر آتی ہیں....... رو لے اے دل کھول کر بادیدہ خونابہ بار!۔۔۔
فرات ترکی کے پہاڑوں سے بہتا ہوا تقریباً دو ہزار میل سفر طے کر کے میدان کربلا
سے گزرتا ہے اور بصرہ کے قریب جا کر دریائے دجلہ سے مل جاتا ہے پھر دونوں دریا
مل کر ''شط العرب'' میں جا گرتے ہیں۔ان دونوں دریاؤں کے کناروں پر ہزاروں
انبیاء کرام، لاکھوں صحابہ کرام اور اولیاء امت سوئے ہوئے ہیں۔اس دریا کے
کنارے پر فاتح جہاں، سکندر رومی نے جان دی تھی اسی دریا کے کناروں پر ہارون
الرشید اور مامون الرشید جیسے جلیل القدر خلفاء اسلام نے اپنی بارگاہیں قائم کی تھیں۔
اسی دریا کے کنارے نوشیروان عادل کی عدل وانصاف کی عدالتیں قائم ہوئی تھیں۔
سیدنا ابراہیم علیہ السلام انہیں پانیوں کی وادیوں میں پیدا ہوئے تھے اور انہی دریاؤں

کی سرزمین میں آتش نمرود میں بے خطر کود پڑے تھے اسی سرزمین میں نمرود کے تکبر
وغرور نے دم توڑا تھا۔

سوئے او نھمے کہ تیر انداختہ   پشہ کارش کفایت ساختہ

کس کس کا ذکر کریں کس کس کی بات کریں کس کس کا نام لیں اور کس کس واقعہ کو
لکھیں۔

بابل شہر کو چلیں....... عراق کی سرزمین میں بابل کا شہر انسانی تاریخ میں ایک
قدیم اور بلند مینار بن کر کھڑا ہے۔امریکی حملہ کے وقت یہاں برطانیہ اور ترکی کی
فوجوں نے کردوں اور ترکوں کے لشکر کے ساتھ مل کر حملے کیے تھے۔اس شہر کو قرآن
پاک کے صفحات نے مختلف مواقع پر نمایاں کیا ہے۔'' ببابل ھاروت وماروت'' یہ
شہر قدیم زمانہ کے مہ وسال سے گزرتا ہوا سات ہزار برسوں کا سفر کر چکا ہے۔سیدنا
ابراہیم علیہ السلام یہاں ہی پیدا ہوئے تھے اسی شہر میں آپ نے بت شکنی کا آغاز کیا۔
اسی شہر میں نمرود اور اس کے سرداروں نے آپ کو آگ کے شعلوں میں پھینکنے کا فیصلہ کیا
تھا۔اسی شہر میں نار ابراہیم گلزار ابراہیم بن گئی تھی۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آگ کے
شعلوں سے نکل کر اسی شہر کو اللہ کی وحدانیت کا مرکز بنا دیا۔اسی شہر میں دین حنیف کی
بنیادیں رکھی گئی تھیں۔یہ شہر ہمارے رسول مکرم رحمۃ للعالمین کا دادا کا شہر ہے اسی شہر میں
صدیوں پرانا ایک عجائب گھر ہے۔جسے امریکیوں نے لوٹ کر یورپ اور امریکہ کے
عجائب گھروں کو سجا لیا ہے۔

بابل سے تھوڑا سا آگے جائیں تو حضرت علی کے دو صاحبزادے عمران بن

علی اور زید بن علی رضی اللہ عنہما محو خواب ہیں۔ اگر چہ امریکی حملہ آوروں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر بابل اپنی تاریخی عظمت کے اعتبار سے اب بھی کھڑا ہے اور آباد ہے۔

بصرہ کہ ایک شہر تھا علم و فضل کی شان!..... بصرہ عراق کا ایک قدیم شہر ہے۔

آج یہ قدیم شہر جہاں سے اسلامی علوم کے چشمے پھوٹے تھے حوادث زمانہ سے کھنڈرات میں تبدیل ہوگیا ہے پرانے شہر سے ہٹ کر ایک نیا بصرہ شہر آباد ہو چکا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مسجد اسی شہر میں ہے حضرت علی کا مدینہ پاک کے بعد پہلا دارالخلافہ اسی شہر میں تھا۔ یہ دریائے دجلہ اور فرات کے مشترک پانیوں سے سیراب ہوتا ہے اس کے اردگرد سیکڑوں میل تک کھجور کے باغات پھیلے ہوئے ہیں۔ دنیا بھر میں بصرہ کی کھجوریں۔ اپنی شیرینی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اسلام کے جب علمی چشمے پھوٹے تو بصرہ اسلامی علوم وفنون کا منبع تھا خصوصاً علم نحو کا مرکز تھا۔ حضرت طلحہ بن زبیر، حضرت انس بن مالک، حضرت ابوالحسن اشعری، حضرت مالک بن دینار، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت خواجہ حسن بصری، حضرت حبیب عجمی، حضرت رابعہ بصری رضی اللہ عنہم بصرہ کی ہی جلیل القدر شخصیتیں تھیں۔ آج اس شہر میں بے شمار صحابہ کرام اور اولیاء عظام آرام فرما ہیں۔ یہاں پر قرآن پاک کا وہ نسخہ ابھی تک محفوظ ہے جسے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ شہادت کے وقت تلاوت فرما رہے تھے۔

(''جہانِ رضا'' ماہ اپریل۔ مئی ۲۰۰۳ء)

اولیائے کرام کے روحانی مراکز

اولیائے کرام کا باقاعدہ ایک نظام ہے خانقاہی نظام۔ مراکز رشد و ہدایت۔ لوگوں کے اخلاق کی اصلاح۔ دلوں کی آبیاری اور صفائی۔ لوگوں کو برے راستوں سے ہٹا کر نیکی کے صحیح راستوں پر لگا دینا۔ تزکیہ نفس کے لیے اپنے حلقہ اثر میں اعلیٰ اثرات مرتب کرنا۔ ان اولیائے کرام نے عوام کی روحانی تربیت کے لیے روحانی مراکز قائم کیے۔ حدود شریعت کی پاسداری کی، عبادت وریاضت کی تربیت دی، پھر جسے اپنی نگاہ میں لے آئے اس کو نیک راہوں پر چلنے کا خوگر بنا دیا ہے، خواہ کوئی چور ہو، ڈاکو ہو، قاتل ہو، خواہ عاقل ہو یا کامل ہو۔ ان اولیاء کرام کا اصلاح احوال کے لیے کوشاں رہنا اور حاضر ہونے والوں کی زندگی میں تبدیلی لانا ایک انقلاب لانا ہے۔

اسلامی معاشرہ میں لاکھوں اولیاء اللہ نے کروڑوں بھٹکے ہوئے انسانوں کو روشن راہوں پر چلنے کی تربیت دی بگڑے ہوئے بادشاہوں کی اصلاح کی، سرکش حکمرانوں کو انسان بنا دیا۔ اولیاء اللہ کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ سیاہ دل آئے اور روشن دل ہو کر گئے۔ اللہ ورسول سے جو نا آشنا آیا اسے اللہ پاک کا بندہ بنا دیا۔ ہم ''رجال الغیب'' کی وادیوں سے نکل کر چند لمحے ''اولیائے ظواہر'' کے خیابانوں میں آئیں تو آپ محسوس کریں گے کہ

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اولیاء کرام نے جو علمی اور روحانی مراکز قائم کیے انہوں نے مشرق و مغرب میں اقوام عالم کو دعوت علم و فکر دی، خلافت راشدہ کی فتوحات کے دوران ہی مدینہ

پاک سے علم وفضل کے قافلے روانہ ہونے لگے تھے۔ ایک طرف صف شکن مجاہدین نے ان سلطنتوں کو تہ وبالا کردیا جو صدیوں سے انسانوں کو غلامانہ انداز میں دبائے بیٹھی تھیں۔ مجاہدین اسلام کے ساتھ علم وفضل کے وہ خزانے بھی بانٹے جانے لگے جو خواجہ دوعالم نے مدینہ پاک کی تربیت گاہ میں اپنے صحابہ کو دیے تھے۔ خصوصاً اصحاب صفہ کے نامور صحابہ تو مدینہ سے نکل کر بصرہ، کوفہ، مصر، عراق، بغداد اور فارس کو علم کے مراکز بناتے گئے۔ انہوں نے ہر چھوٹے بڑے کے لیے علم حاصل کرنے کی راہیں کھول دیں۔ حضرت عثمان کی خلافت کے آخری اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے ابتدائی ادوار میں کوفہ وبصرہ میں علمی مراکز قائم ہوئے۔ جلیل القدر صحابہ پہنچے محدثین نے احادیث کے ذخائر جمع کر دیئے۔ بغداد (اپنے ابتدائی ادوار میں) کوفہ، بصرہ پھر مصر وفارس کے مراکز تو اسلامی تعلیمات کے دریا بہانے لگے۔ خلافت راشدہ کے بعد بنوامیہ کا دور آیا تو دنیا پر اسلامی فتوحات کے دروازے کھل گئے۔ خلافت کی بجائے ملوکیت کے دربار لگے۔ مگر علم وفضل کی نہریں اسی طرح جاری رہیں جو صحابہ کرام کے دور میں جاری ہوئی تھیں۔ اس کے بعد تابعین کا دور آیا یہ خلافت نہیں ملوکیت کا دور تھا۔ مگر بنوامیہ کے بعد بنوعباس نے علم کی سرپرستی کی اور اہل علم کو احترام دیا اور علماء کرام کی سرپرستی کی جانے لگی۔ ان درباروں کی سیاسی آن بان کے ساتھ علماء ومشائخ کے وجود کو اہمیت دی گئی اور دربار سے وابستہ بہت سے علماء نے دین کی اشاعت کا کام شروع کیا۔

اس زمانہ میں چار ائمہ اسلام (حضرت امام مالک۔ حضرت امام ابوحنیفہ حضرت امام احمد بن حنبل اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) نے علم وفضل

کے جھنڈے گاڑ دیے۔ ان ائمہ نے قرآن واحادیث کی روشنی میں فقہ اسلامی کی تدوین کی اور لوگوں کی دینی راہنمائی کی۔ اس دور کے علماء کرام محدثین اور مفسرین نے دن رات کام کیا مگر ان چار ائمہ نے شاہی درباروں سے دور رہ کر علم کی بساط بچھائی اور لوگوں میں علم بانٹنے لگے۔ اگر کسی اموی یا عباسی خلیفہ نے ان جلیل القدر ائمہ کو اپنے دربار کی زینت بنانے کی کوشش کی تو ان ائمہ نے دربار کی سرپرستی کو جھٹک دیا اور وہ بوریا نشین ہو کر علم پھیلاتے رہے۔ مدینہ، کوفہ، بغداد اور مصر میں چٹائیوں پر بیٹھ کر شاہی انعام واکرام سے دور رہ کر لوگوں میں علم بانٹنے لگے۔ امام احمد بن حنبل کو تو خلیفہ وقت کے انعامات سے انکار کرنے اور قرآن پاک کو مخلوق ہونے کا فتویٰ نہ دینے پر شاہی عتاب کی بے پناہ شدتوں سے گزرنا پڑا۔ مگر ان کا پائے استقلال اپنے درست موقف پر ڈٹا رہا۔ حتیٰ کہ خلیفہ وقت نے آپ کو نہ صرف قید وبند میں پھینک دیا بلکہ ننگے جسم پر کوڑوں کی بارش کرادی۔ پھر جب امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بننے سے انکار کردیا تو ان پر بھی بے پناہ مظالم ڈھائے گئے، کوڑے لگائے گئے آخر میں قید خانہ میں زہر پلا کر ہلاک کردیا گیا مگر ان علم وفضل کے مجسموں نے بادشاہوں کے سامنے سر نہ جھکایا۔ اہل علم کے ہاں شاہی عتاب کا سلسلہ ہر دور میں جاری رہا مگر علماء ومشائخ کبھی اقتدار کے سامنے سرنگوں نہ ہوئے۔

اولیائے ظاہرین

اسلام کی فتوحات ہزاروں میل تک پھیلتی گئیں اور علم وروحانیت کی روشنیاں

پھیلانے والے بھی دنیا کے خطے خطے میں پہنچتے گئے۔ وہ محض اللہ کی رضا کے لیے کام
کرتے رہے۔ نہ حکومت کے انعامات کی توقع رکھی نہ درباراداری اختیار کی۔ اس دور
کی علمی اور روحانی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں ایسی کئی ہستیوں کے تابناک وجود
نظر آتے ہیں جنھوں نے اقتدار اور دنیاوی دولت کے سامنے سر نہیں جھکائے۔ اسلام
عرب سے نکل کر ایران خراسان میں پہنچا۔ علم کے قافلے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ مشائخ
اپنی خانقاہیں قائم کرتے گئے۔ علماء کرام اپنی درسگاہیں پھیلاتے گئے اور دنیا میں
اسلامی علم وروحانیت کی دولت بانٹتے گئے۔ ایران خراسان اور دوسرے مشرقی ممالک
علم وعرفان کے گہوارے بن گئے۔ ان چار صدیوں میں علمائے کرام نے روس اور
چین کی دیواروں تک کو علم کی روشنیوں سے روشن کردیا۔ دوسری طرف اولیاء کرام نے
ان ممالک میں روحانیت کے دریا بہادیے۔

ابتدائی دور کے صوفیہ کرام

ابتدائی دور کے صوفیہ ءکرام ہمیشہ دربار اور بادشاہان وقت سے علیحدہ رہے
ہیں۔ ان کے ہاں ایک مغایرت تھی۔ اہل اقتدار اور اہل زر کے خلاف ...... ان
صوفیہ کو یہ انداز زندگی حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کا کردار ورثے میں ملا تھا
جنہوں نے ہمیشہ اقتدار اور دربار سے اپنے آپ کو دور رکھا اور علم کے پھیلانے میں سر
گرم رہے۔ انہیں انعام واکرام بھی متاثر نہ کرسکے۔ ہمارے ابتدائی دور کے صوفیہ
بھی قرب سلطانی کو زہر قاتل جانتے تھے۔ حضرت امام غزالی نے ایک مقام پر فرمایا تھا
کہ ''بادشاہوں سے رابطہ انسان کی روح کی آزادی کو کچل دیتا ہے اگر آپ بادشاہوں

کو برے کام کرتے دیکھ کر خاموشی اختیار کرتے ہیں تو دوسرے لفظوں میں آپ بادشاہ
کی بے راہ رویوں اور حرکتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ اگر آپ انہیں نصیحت کرکے
روکنے کی کوشش کرتے ہیں تو سرکش بادشاہ اپنے مظالم اور برائیوں سے ہاتھ روکنے کی
بجائے آپ کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ان سرکش بادشاہوں کی عادات ناقابل اصلاح
ہوتی ہیں۔ وہ کسی نصیحت یا تنبیہ کی پروا نہیں کرتے اس طرح وہ علم وروحانیت کی توہین
کرتے ہیں''۔

امام غزالی نے اپنی مشہور کتاب ''احیاء العلوم'' میں دینی اور مذہبی نقطہ نظر
سے بھی بادشاہوں کی قربت سے دور رہنے پر دلائل دیے ہیں آپ فرماتے ہیں کہ
''بادشاہ کی طرف سے جو نذرانے یا انعامات دیے جاتے ہیں وہ اس خزانے سے
دیئے جاتے ہیں جن کا شریعت میں کوئی جواز نہیں ملتا۔ صوفیہ ءکرام کے لیے تو ایسے
مشکوک خزانے سے انعام واکرام پانا سخت گناہ ہے۔ آپ اپنے زمانہ کے مسلمان
حکمرانوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ بادشاہوں کے خزانے ان ممنوعہ ذرائع سے بھرے
ہوتے ہیں جن کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ جائز اموال تو صرف زکوۃ ہے۔
صدقات ہیں فئی ہے اور مال غنیمت ہے۔ مگر آج ان تمام اموال کا حصول ختم ہوچکا
ہے۔ ہمارے وقت میں زکوۃ وخیرات ایک ایسی آمدنی ہے جسے بادشاہ کے لیے حلال
قرار دیا جاتا ہے مگر اب یہ چیزیں بھی ظالمانہ انداز سے وصول کی جاتی ہیں اس کی حلت
ختم ہوگئی ہے۔'' یہی وجہ تھی کہ ابتدائی دور کے صوفیہ نے دربار اور اقتدار سے دور رہنے
کی کوشش کی ہے خصوصاً ''سلسلہ چشتیہ'' کے بزرگوں نے تو بادشاہوں سے دوری کو ہی
اپنے روحانی مقاصد کی تکمیل کے لیے اختیار کیے رکھا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا''

من آتی ابواب سلاطین لا فتنں '' (جو شخص بادشاہ کے دروازے پر آ کھڑا ہوا وہ
بے عزت ہو جاتا ہے۔) ایک اور حدیث میں فرمایا: '' ماازداد احدمن السلطان
دنوا الآازداد من اللہ بعدا '' جو انسان بادشاہ کے جتنا قریب ہوگا اللہ سے اتنا ہی
دور ہوگا۔

برصغیر میں صوفیہ کا کردار

حضرت خواجہ اجمیری نے اپنے خلیفہ شیخ قطب الدین بختیار کاکی کو جن سے
آگے چل کر طریقہ سلسلہ چشتیہ نے فروغ پایا تھا، امراء سے دور رہنے کا حکم دیا تھا۔
ہمارے پاکستان میں سب سے پہلے ولی اللہ حضرت ابوالحسن علی الہجویری المعروف بہ
داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ نے غزنی سے سفر کر کے لاہور میں قدم رکھا تو کسی بادشاہ
وقت سے کوئی رابطہ نہ کیا۔ حالانکہ یہ غزنوی دور تھا اور محمود غزنوی اور اس کے جانشین
آپ کے ہم وطن بھی تھے اور ہم مسلک بھی۔ مگر ہمیں حضرت داتا گنج بخش پر لکھی
جانے والی کتابوں اور خود حضرت کی لکھی جانے والی محبوب و مطلوب کتاب '' کشف
المحجوب '' سے کہیں بھی یہ بات سامنے نہیں آتی کہ آپ نے کسی بادشاہ، کسی فاتح یا کسی
صاحب اقتدار کی طرف توجہ کی ہو۔ حالانکہ آپ جن حالات میں لاہور میں قیام پذیر
ہوئے وہ ایک نہایت مشکل دور تھا۔ مگر آپ ان شہنشاہوں، بادشاہوں اور شہزادوں
سے ہمیشہ دور رہے اور اپنا سلسلہء رشد و ہدایت عام لوگوں میں جاری رکھا۔ آج
صدیاں گزرنے کے باوجود حضرت داتا گنج بخش کے فیضان کا چشمہ اسی لیے جاری
و ساری ہے کہ وہ کسی شہنشاہ کی عنایات کے مرہون منت نہ تھے۔

لاہور کے قدیم اولیاء اللہ

حضرت داتا گنج بخش علی الہجویری رحمتہ اللہ علیہ کے وصال کے بعد لاہور کی
سرزمین میں کئی بلند پایہ مشائخ آئے۔ قیام کیا، مگر کبھی کسی بادشاہ کسی دنیادار یا سپہ
سالار کے زیر سایہ نہیں رہے۔ حضرت میراں حسین زنجانی، حضرت یعقوب
صدر دیوان زنجانی کے علاوہ پیر مکی رحمتہ اللہ علیہ جیسے اولیاء اللہ لاہور شہر میں رہے۔ مگر
ہم نے کسی کتاب میں نہیں پڑھا کہ ان لوگوں نے کسی حاکم وقت والئی ملک یا حکمران
سے تعلقات استوار کر کے اپنے کام میں آسانیاں حاصل کرنے کی کوشش کی ہو۔
حالانکہ اس وقت کے حکمران بڑے خوش عقیدہ مسلمان تھے۔

حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ

حضرت داتا علی الہجویری رحمتہ اللہ علیہ کے کئی سال بعد برصغیر پاک و ہند میں
خواجہ معین الدین اجمیری کی آمد ہوئی آپ نے دس ماہ تک حضرت داتا گنج بخش کے
مزار پر لاہور میں قیام کیا۔ اس عرصہ میں آپ نے چلہ بھی کاٹا۔ پھر یہاں کے لوگوں کی
نفسیات سے واقفیت حاصل کی۔ ان کے شب و روز کا مطالعہ کیا۔ ان کے مذہبی
رجحانات کو دیکھا۔ لیکن آپ جب لاہور سے چل کر اجمیر پہنچے، تو وہاں کی مشکلات کا
سامنا کرنا پڑا مگر آپ نے نہایت مستقل مزاجی سے کسی بادشاہ کی مدد کے بغیر انہیں
برداشت کیا۔ بت پرست ہندوؤں کے ظلم و ستم سہے۔ ہندوستان کے عوام کی مشکلات
کا مطالعہ کیا اور مصمم ارادہ کر لیا کہ یہاں رہ کر مخلوق خدا کی راہنمائی کریں گے۔ آپ
نے اپنی رہائش گاہ کے دروازے ہر خاص و عام کے لیے کھول دیے۔ ہر مذہب و ملت

کا عام انسان حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے پاس آتا، مجلس میں بیٹھتا، عزت پاتا اور اپنے دل میں تبدیلی محسوس کرتا۔

اجمیر شریف ان دنوں صرف سیاسی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ ہندو مذہب کا ایک اہم شہر تھا۔ پرتھوی راج کا پایہ تخت تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''اخبار الاخیار'' میں لکھا ہے کہ ان دنوں اجمیر مذہبی طور پر بھی سارے ہندوستان کا مرکز تھا۔ مسلمان تو ایک کمزور طبقہ کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ مگر ہندوؤں کے مضبوط مذہبی گروپ اسی شہر پر چھائے ہوئے تھے اور اسی شہر سے سارے ہندوستان کے ہندوؤں کی مذہبی راہنمائی ہوتی تھی۔

حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے انداز میں اسلام کی روحانی روشنیاں پھیلا رہے تھے۔ ان کے اردگرد بے پناہ مخلوق آکر جمع ہوتی اور اسلام کی حقانیت کی دولت حاصل کرتی۔ یہ ہندوؤں کے اقتدار کا زمانہ تھا۔ یہ بات راجہ پرتھوی راج کے لیے ناگوار تھی۔ وہ عوام کے اس اجتماع سے دل میں خطرہ محسوس کرنے لگا۔ خود راجہ اور اس کے درباری مسلمانوں کو طرح طرح سے تنگ کرنے لگے۔ بعض اوقات تو ایسے ملازمین دربار کو بھی تنگ کیا جاتا جو حضرت کی مجلس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ امیر خسرو نے لکھا ہے کہ ایک وقت آیا کہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نے اجمیر شریف میں اتنی عوامی اور اجتماعی قوت حاصل کرلی کہ انہیں آسانی سے توڑا نہیں جاسکتا تھا پرتھوی راج آپ کے قیام، آپ کے اجتماع، آپ کے درویشانہ طریق کار کو پسند نہیں کرتا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ آپ کو اجمیر سے باہر نکال دیا جائے۔

''پتھورا را زندہ گرفتیم و دادیم بہ لشکر اسلام''

انہی دنوں اجمیر میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا پرتھوی راج کے ایک ہندو درباری نے اسلام قبول کرلیا اور وہ حضرت اجمیری کی مجالس میں آنے لگا۔ پرتھوی راج کے دربار کی ساری سازشیں، مسلمانوں کے خلاف امڈ آئیں، پھر مسلمانوں پر ظلم وستم کا اطلاق ہونے لگا خود خواجہ اجمیری کے خلاف اقدام سے دربار سے وابستہ وہ شخص حضرت خواجہ کو آگاہ رکھتا تھا۔ راجہ پرتھوی راج حضرت خواجہ اجمیری کے خلاف تو کچھ نہ کرسکتا تھا مگر اس نے اپنے دربار کے اس ملازم کو سخت ایذائیں دینا شروع کردیں۔ اس مظلوم نے حضرت سے شکایت کی۔ آپ نے اپنے ایک خادم کو پرتھوی راج کے پاس بھیج کر شکایات کا ازالہ کرنے کو کہا۔ ان بے وجہ سختیوں سے روکا۔ مگر پرتھوی راج نے حضرت کے اس پیغام کی کوئی پروانہ کی بلکہ حضرت کے خلاف بھی نازیبا الفاظ استعمال کیے۔ حضرت خواجہ کو اطلاع دی گئی تو آپ سن کو بڑے برافروختہ ہوئے اور بھری مجلس میں اعلان کیا۔

''پتھورا را زندہ گرفتیم و دادیم بہ لشکر اسلام''

''ہم نے راجہ راج (پتھورا) کو زندہ گرفتار کرلیا ہے اور اسے لشکر اسلام کے حوالے کررہے ہیں۔'' یہ مشہور واقعہ سیر الاولیا اور اخبار الاخیار میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

حضرت نے یہ اعلان تو اجمیر میں کیا۔ مگر دوسری طرف ملک کے سیاسی حالات بدلنے لگے۔ سلطان محمد غوری ہندوستان پر حملہ آور ہوا راجہ پرتھوی راج اپنی فوجیں لے کر اس حملہ کو روکنے کے لیے مغربی سرحدوں کی طرف آگے بڑھا۔ دونوں

فوجوں میں زبردست معرکہ رہا۔ راجہ پرتھوی راج کو یہ احساس نہیں تھا کہ اجمیر میں بیٹھا ایک اکیلا انسان (حضرت خواجہ اجمیری) جو لوگوں کے دلوں کی دنیا تبدیل کر رہا ہے۔ محمد غوری کی افواج سے زیادہ مضبوط ہے اور ہندوستان کے راجہ کی گرفتاری کا اعلان بھی کر رہا ہے میدان جنگ میں پرتھوی راج زندہ گرفتار کرلیا گیا اور اسے لشکر اسلام کے حوالے کردیا گیا۔

پرتھوی راج کی شکست اور گرفتاری کے بعد ہندوستان کی سیاسی حالت یکسر بدل گئی۔ ہندوؤں کے مظالم رک گئے تھے۔ اب حضرت خواجہ اجمیری مسلمانوں کے دلوں کے بے تاج بادشاہ تھے وہ ایک روحانی انقلاب برپا کررہے تھے۔ راجہ پتھورا تو اپنی زندگی میں ظلم وستم کی داستان بن کر مرگیا مگر حضرت خواجہ اجمیری نے اپنی زندگی میں لاکھوں انسانوں کو روشن راہیں دکھائیں۔ پھر اپنے بعد ایسے افراد پیدا کیے جو صدیوں تک اسلام کی روشنیاں لے کر سارے برصغیر میں لوگوں کی راہنمائی کرتے رہے۔

اولیاءاللہ نے ہمیشہ عوام کی تربیت کی ہے، ان سے ہی محبت کی ہے، ان کے لیے ہی اپنے دروازے کھلے رکھے۔ اگرچہ بعض نیک سیرت حکمران، ان اولیاءاللہ سے عقیدت رکھتے تھے ان کی نصیحتوں کو قبول بھی کرتے تھے مگر ہمارے اولیاءاللہ نے کبھی انہیں اپنی زندگی میں دخیل نہیں ہونے دیا۔ ان کا یہ نظریہ تھا۔ ’’من اتی ابواب السلطانین افقنین‘‘ (جو بادشاہ کے دروازے پر آیا وہ اپنے مقام سے گرگیا) پھر فرمایا۔ ’’ماز واداحدمن السلطان دنوا الاازداد من اللہ بعدا‘‘۔ (جو شخص بادشاہ کے جتنا ہی قریب ہوتا ہے اتنا ہی اللہ سے دور ہوتا جاتا ہے)

ان اولیاءاللہ نے ہمیشہ ان اقوال پر عمل کیا اور اللہ کی مخلوق کی اصلاح میں سرگرم رہے۔ آپ نے اپنے مریدوں کو بھی آگاہ کیا کہ ’’صحبۃ الاغنیاء للفقراء سم قاتل‘‘ فقراء کے لیے دنیاداروں کی صحبت زہر قاتل ہے۔ ان حضرات نے اپنے مریدوں کو بتایا کہ جو سر اللہ کے سامنے جھکتے ہیں وہ کسی بادشاہ کے دربار میں نہیں جھک سکتے۔ ایک صوفی کے لیے سونے چاندی کی محبت خودکشی کے مترادف ہے۔ اگر کسی بھی ولی اللہ نے ایسی حرکات کیں تو اسے صوفی خام یا جعلی پیر قرار دیا گیا اولیاءاللہ تو دنیاوی شوروشغب سے دور رہ کر ایک آزاد اور صاف زندگی گزارتے ہیں۔

پاک وہند کے چشتی صوفیہ دربارشاہی سے دور رہے

سلسلہ چشتیہ کے بلند پایہ صوفیہءکرام نے اس اصول کی سختی سے پابندی کی اور بادشاہان وقت کے انعام واکرام سے دور رہے۔ حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ دہلی میں آئے تو اس وقت کے بادشاہ سلطان التمش نے آپ کا والہانہ استقبال کیا۔ مگر آپ نے دربارشاہی کی مراعات کے سایہ میں رہنے سے بڑی بے رخی سے انکار کردیا۔ التمش خود ایک درویش صفت بادشاہ تھا۔ اسلام کا سپاہی تھا اور اولیاءاللہ کا عقیدت مند تھا۔ اس نے حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں بار بار گزارش کی کہ اپنے قدوم سے اس کے دربار کو عزت بخشیں، مگر آپ نے ہمیشہ انکار کیا۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بیٹے کو اجمیر کے قریب ہی ایک پورا گاؤں بطور معافی ملا ہوا تھا آپ کی اسی پر گزراوقات تھی۔ مگر

حکومت کے کارندوں نے آپ کو ہراساں کرنا شروع کیا۔ تو آپ تنگ آ کر دہلی کے دارالسلطنت میں پہنچے، تو حضرت بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے مرشد زادے کو دربار جانے سے روک دیا اور فرمایا میرے حجرے میں رہیں آپ دربار شاہی نہ جائیں، میں یہ مسئلہ یہاں بیٹھے بیٹھے خود حل کراتا ہوں۔ سلطان التمش کو جب علم ہوا کہ حضرت خواجہ بختیار کاکی اس معاملہ میں دلچسپی لے رہے ہیں تو اس نے از خود اجمیر کے گورنر کو حکم دیا کہ حضرت خواجہ معین الدین کے بیٹے کے گاؤں کے معاملات میں تعرض نہ کیا جائے۔

خواجہ مسعود فرید شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ

حضرت خواجہ فرید گنج شکر، حضرت بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے خاص مرید اور خلیفہ تھے۔ حضرت نے آپ کو حکم دیا کہ آپ اپنی رہائش (خانقاہ) آبادی کے شور و شغب سے دور لے جائیں۔ آپ کا یہ حکم سلسلہء چشتیہ کے تمام اولیاء اللہ کے لیے تھا حضرت خواجہ مسعود شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ نہ صرف خود شہر یا دارالخلافہ سے دور رہے بلکہ اپنے مریدوں اور خلفاء کو بھی سخت پابند کیا کہ وہ دربار شاہی کی سیاسیات سے ہمیشہ علیحدہ رہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ شہروں کی گندی سیاست، روحانی منازل پر اثر انداز ہوتی ہے حضرت خواجہ فرید شکر گنج کے دو ملفوظات ''راحت القلوب'' اور ''اسرار الاولیاء'' میں جابجا ایسی نصیحتیں موجود ہیں کہ قرب سلطانی کو کبھی اختیار نہ کیا جائے اور ہمیشہ حکمرانوں، ان کے جانشین شہزادوں اور ان کے امراء کی مجالس سے دور رہا جائے حضرت بابا فرید رحمتہ اللہ علیہ کے خاص مرید تربیت یافتہ ''سیدی مولا'' نے پاک پتن

سے دہلی جانے کی اجازت طلب کی تو آپ نے اجازت دیتے ہوئے فرمایا۔

یک نصیحت من نگاہ داری، باملوک و امراء اختلاط نہ کنی آمد و رفت
ایشاں درخانہ خود از مہلکات تصور کنی، کہ ہر درویشے کہ در اختلاط
باملک و امرا دارد، عاقبت او خراب گردد

میری ایک نصیحت یاد رکھنا۔ دہلی میں جا کر بادشاہوں، امراء سے دور رہنا اور اپنے گھر میں ان کی آمد و رفت کو ہلاکت خیز نتائج قرار دینا۔ جو درویش اپنے گھر کا دروازہ بادشاہوں، امراء اور دنیا داروں کے لیے کھول دیتا ہے وہ آخر کار تباہ ہو جاتا ہے۔

شیخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ

حضرت شیخ نظام الدین محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ سلسلہء چشتیہ کے بلند پایہ ولی اللہ ہیں۔ حضرت خواجہ فرید کے تربیت یافتہ تھے۔ ان کے عقیدت مند ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں تھے ان کے تربیت یافتہ خلفاء نے سلسلہ چشتیہ کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا اور برصغیر کے گوشے گوشے میں چشتی خانقاہیں قائم کیں۔ خود وہ مقام محبوبیت پر فائز تھے۔ آپ نے ہندوستان کے سات مسلمان بادشاہوں کا زمانہ پایا تھا۔ دہلی میں رہے مگر کسی بادشاہ، وزیر یا امیر کے دربار میں کبھی حاضر نہیں ہوئے۔ اگر کوئی بادشاہ وزیر یا امیر آپ کی زیارت کی خواہش کرتا تو آپ معذرت کر دیتے تھے۔ سلطان جلال الدین خلجی نے کئی بار آپ کی خدمت میں نہایت عاجزی سے حاضری کی درخواست کی مگر آپ معذرت کر دیتے تھے۔ حضرت امیر خسرو، حضرت

خواجہ نظام الدین اولیاء کے خاص مرید اور نہایت ہی قریبی تھے۔ آپ نے بادشاہ کو حضرت خواجہ محبوب الٰہی کی خانقاہ میں حاضر ہونے کی استدعا کی مگر حضرت خواجہ نے ہمیشہ انکار کر دیا اور دہلی چھوڑ کر پاک پتن چلے گئے تاکہ قرب سلطانی کی خواہشات معدوم ہو جائیں آپ ایک عرصہ تک پاک پتن رہے۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ برصغیر کے بلند پایہ اولیاء اللہ بادشاہوں اور امراء سے دور رہنے کی کتنی کوشش کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں خواجہ محبوب الٰہی نے کبھی اپنے اصول کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ ایک بار سلطان علاء الدین خلجی نے پیغام بھیجا کہ میں خود بخود آپ کے گھر چلا آؤں گا۔ آپ نے فرمایا۔ میرے گھر کے دو دروازے ہیں۔ ایک سے سلطان داخل ہوگا میں دوسرے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا۔ یہ واقعہ ''سیر الاولیاء'' میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ یہ جواب سننے کے بعد سلطان علاء الدین خلجی نے دوبارہ آپ کو پریشان کرنے کی کبھی جرأت نہیں کی۔ سلطان علاء الدین خلجی کے بعد مبارک خلجی تخت نشین ہوا وہ حضرت خواجہ محبوب الٰہی کا بڑا ہی عقیدت مند تھا اسے بھی حضرت اپنی خانقاہ میں آنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ ایک بار اس نے ایک شاہی فرمان جاری کیا کہ حضرت محبوب الٰہی دربار میں تشریف لائیں آپ نے جواب میں لکھا۔

''من گوشہ، عافیت دارم، جائے نروم، نیز رسم پیران من نہ بود، کہ بر خانہ، بادشاہاں روند و نہ ایشاں را اجازت دہم، مرا معذور باید داشت''۔

''میں ایک گوشہ نشین انسان ہوں۔ نہ میں کہیں جاتا ہوں نہ بادشاہوں کو اپنے ہاں آنے کی اجازت دیتا ہوں میرے پیران عظام (سلسلہ چشتیہ) کی عادت تھی

کہ وہ بادشاہوں اور امراء کی مجالس میں نہیں جاتے تھے۔ مجھے معذور رکھا جائے۔''

یہ تھے وہ اصول جس پر حضرت خواجہ محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ سختی سے کاربند تھے۔ آپ نے اپنے مریدوں اور خلفاء کو بھی قرب شاہی سے سختی سے دور رہنے کی ہدایت کی تھی۔ حضرت نے علاء الدین خلجی جیسے شہنشاہ کے دربار میں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ مبارک خلجی جو بادشاہ کا وزیر تھا حضرت خواجہ کی بات سن کر کبیدہ خاطر ہو گیا۔ اس کی روش سے حضرت کو بعض مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر آپ نے نہایت تحمل سے ان مشکلات پر قابو پایا۔ آپ کے خلفاء بھی اپنے اسی رویے پر بادشاہوں کی ناراضگی کی زد میں آتے تھے انہوں نے سختیاں برداشت کیں مگر دربار داری کو قبول نہیں کیا۔

محمد بن تغلق ہندوستان کا ایک زبردست شہنشاہ تھا۔ اسے اولیاء اللہ سے عقیدت تھی۔ مگر ''سلسلہ چشتیہ'' کے یہ اولیاء اللہ دربار سے دور رہنے کے اصول پر کاربند تھے۔ حضرت خواجہ محبوب الٰہی کو تو دربار میں حاضر ہونے سے مستثنٰی قرار دے دیا گیا۔ مگر آپ نے اپنے مریدوں کو بھی حکم دیا کہ وہ دربار میں حاضری نہ دیا کریں۔

ان حضرات کے لیے شاہی حکم بڑا گراں تھا مگر وہ اس کی تعمیل کے لیے تیار نہ تھے۔ دوسری طرف وہ اپنی خانقاہوں کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے مگر شاہی فرمان پے در پے انہیں شاہی دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیتے تھے۔ حضرت قطب الدین منور رحمتہ اللہ علیہ کے دربار شاہی سے وارنٹ بھی جاری کر دیے گئے۔ خواجہ قطب الدین منور حضرت محبوب الٰہی کے خلیفہ اور تربیت یافتہ مرید تھے۔ انہوں نے اپنی خانقاہ چھوڑنا قبول کر لیا مگر دربار شاہی میں حاضر ہونا قبول نہ کیا۔

ان حالات میں حضرت خواجہ قطب الدین نے دہلی کی خانقاہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ جاتے وقت وہ شیخ جمال الدین ہانسوی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کے گنبد کو دیکھتے جاتے تھے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑیاں تھیں اور کہتے جاتے تھے:

''یا حضرت! میں یہ خانقاہ اپنی مرضی سے نہیں چھوڑ رہا''

اس طرح آپ دربار شاہی میں حاضر ہونے کی بجائے اپنی خانقاہ چھوڑ کر چلے گئے۔

''خیر المجالس'' میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ ''سلسلہ چشتیہ'' کے اولیاء اللہ نے کبھی دربار شاہی کی حاضری کو قبول نہیں کیا۔ نہ کبھی امراء اور دنیا داروں کی قربت اختیار کی۔ سلسلہ چشتیہ کے ایک جلیل القدر بزرگ خواجہ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''ان دنوں صوفیہ میں دو قسم کی بدعات دیکھنے میں آئی ہیں۔ ایک صوفیہ کی قسم ''مقلد'' کہلاتی ہے یہ کسی پیر و مرشد کی تقلید تو کرتے ہیں مگر وہ ان کے اصولوں کی پابندی نہیں کرتے۔ دوسرے بناوٹی صوفیہ ہیں جو لوگوں کو صرف روپے اکٹھا کرنے کے لیے اپنے اردگرد بلاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو جبہ و دستار سے مزین رکھتے ہیں۔ اونچی اونچی ٹوپیاں پہن کر امراء، دنیا داروں، وزیروں اور بادشاہوں کے درباروں کا چکر لگاتے رہتے ہیں۔''

دربارِ شاہی سے سلسلہ چشتیہ کی دوری

ملفوظات چشتیہ میں یہ بات واضح طور پر نمایاں نظر آتی ہے۔ کہ ''ہر کہ نام او در دیوان بادشاہ نوشتہ شد، نام از دیوان حق بر می آرند۔ (جس کا نام بادشاہ کے دیوان میں لکھا جاتا ہے اسے اللہ کے دیوان سے خارج کر دیا جاتا ہے) سلسلہ چشتیہ

کے بلند پایہ اولیاء اللہ کا ایک اصول تھا۔

مقصود من خستہ زکونین توئی
از پے تو میرم واز برائے تو زیم

''میری زندگی کا مقصد تو صرف ایک ہی ہے کہ تیرے لیے جیوں اور تیرے لیے مروں'' ''کشف المحجوب'' میں حضرت داتا گنج بخش لکھتے ہیں کہ ''جس شخص نے اغنیاء اور امراء کی صحبت اختیار کر لی وہ مجالس فقراء سے دور ہو گیا اللہ تعالیٰ اس کے دل کو مردہ بنا دیتا ہے''۔

حضرت امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل کا کردار

بادشاہوں سے دوری کا یہ سلسلہ ان صوفیہ کرام کو ورثے میں ملا تھا اکثر متقدمین صوفیہ ہمیشہ دربار شاہی سے دور رہے اور قرب شاہی کو سم قاتل جانتے رہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کا کردار ان صوفیہ کے لیے مشعل راہ رہا۔ آپ نے اپنے بیٹے کو عاق کر دیا تھا کیونکہ وہ ایک سال کے لیے اصفہان کا قاضی رہ چکا تھا۔ شیخ ابو عبید تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خانقاہ کی وہ دہلیز اکھیڑ کر باہر پھینک دی جہاں بادشاہ وقت کا ایک صاحبزادہ کھڑا ہوتا تھا۔ خواجہ سہل تستری رحمتہ اللہ علیہ ایک بار عراق کے حکمران کے دربار میں حاضری دینے پر پورے سات سال روتے رہے اور افسوس کرتے رہے ''راحت القلوب'' میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے ایک خاص مرید کو جو ایک بار حکمران وقت کے دربار میں گیا تھا، خانقاہ سے باہر نکال دیا اور اس کے جبہ و دستار کو اتار کر جلا دیا۔ وہ

بزرگان دین جو عراق و ایران سے ہوتے ہوئے برصغیر پاک و ہند میں آئے وہ اپنے مرشدان سلسلہ کی روایات کو ساتھ لےکر آئے تھے اور وہ بادشاہوں سے دور رہنے کو ضروری جانتے تھے۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہی تھی کہ وہ ایسے آنے والے صوفیہ سے اچھے تعلقات استوار کریں، عوام کا ایک حصہ جو بزرگان دین کی مجالس سے وابستہ تھا ان پر التفات فرماتے۔

سلسلہء چشتیہ اور سہروردیہ میں فرق

اگرچہ ''سلسلہ چشتیہ'' کے اولیاء اللہ نے ان اصولوں کی سختی سے پاسداری کی مگر ایک وقت آیا کہ سہروردی سلسلہ کے صوفیہء کرام نے وقت کے بادشاہ اور امراء سے اپنا رویہ دوستانہ رکھا۔ ان سے جاگیریں حاصل کیں۔ لوگوں کے مسائل حل کرانے کے لیے سفارشیں کیں اور دربار شاہی کے قریب رہ کر امراء کی اصلاح کے لیے بڑا کردار ادا کیا۔

چشتیہ اور سہروردیہ سلاسل کے پاکستان میں اثرات

تصوف کے دو ایسے سلسلے ہیں جنہوں نے برصغیر پاک وہند میں رشد وہدایت کے چشمے جاری کیے وہ ایک طویل عرصہ تک مخلوق کی راہنمائی میں مصروف رہے اور ان کے زیر تربیت بعض خانقاہیں ابھی تک یہ فریضہ سرانجام دے رہی ہیں۔ ہندوستان میں ''سلسلہ چشتیہ'' کے بانی خواجہ غریب نواز حضرت معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اجمیر شریف کو اپنا مستقر ارشاد بنا کر چار دانگ عالم میں روحانی روشنیاں پھیلائیں۔ دوسری طرف سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے فیض یافتہ حضرت خواجہ

شہاب الدین عمر سہروردی رحمتہ اللہ علیہ نے ''سلسلہ سہروردیہ'' کی بنیاد رکھی اور آپ کے تربیت یافتہ خلفاء نے پاک وہند خصوصاً پاکستان کے جنوبی خطوں میں رشد وہدایت کی خانقاہیں قائم کیں۔ یہ ابتدائی دور کے صوفیہء کرام تھے جنھوں نے اس سرزمین کو روحانیت سے مالا مال کر دیا۔ سیاسی طور پر ان دوسلسلوں میں ایک امتیازی فرق نظر آتا ہے۔

سلسلہ چشتیہ کے مقتدر صوفیہ نے وقت کے بادشاہوں، امراء اور اعیان مملکت سے دور رہ کر عوام کی اصلاح کا کام کیا جبکہ 'سلسلہ سہروردیہ'' کے صوفیہ نے سلاطین اور امراء کے ساتھ رہ کر عوام کے حالات کو سنوارا، وہ دربار کے قریب رہے۔ بادشاہوں سے منصب پائے۔ جاگیریں لیں امراء دربار اور دولت مندوں کو عوام کی بہبود کے امور پر لگا دیا۔ جب ان حضرات سے سوال کیا جاتا کہ آپ قرب سلاطین کے زہر کو کس طرح برداشت کرتے ہیں، وہ جواب میں فرماتے ''زہر اس پر کبھی اثر نہیں کرتا جس کے پاس تریاق ہوتا ہے۔''

سہروردی مشائخ کا نظریہ یہ تھا کہ بادشاہان وقت کے درباروں میں جانے سے اولیاء اللہ کی روحانی اقدار پر کچھ اثر نہیں پڑتا ہے۔ اس سلسلہ کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی نے تصوف کی مشہور کتاب ''عوارف المعارف'' تصنیف کی تھی۔ جو آج دنیائے تصوف میں ایک اہم کتاب مانی جاتی ہے۔ آپ بذات خود بغداد کی حکومت کی طرف سے ایک سفیر کی حیثیت سے کابل میں خدمات سرانجام دیتے رہے تھے۔ پاکستان اور ہندوستان کی سرزمین میں سب سے پہلے جس سہروردی بزرگ نے اپنی خانقاہ قائم کی وہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ وہ

بادشاہ التمش کے دربار میں "شیخ الاسلام" کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے تھے۔ اس سلسلہ کے ایک اور شیخ نورالدین مبارک غزنوی رحمۃ اللہ علیہ بھی کئی بار سلطان التمش کے دربار میں شیخ الاسلام کے منصب پر کام کرتے رہے۔

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے برصغیر میں سہروردی سلسلہ کا چراغ روشن کیا اور ملتان کو اپنی خانقاہ کی روشنیوں سے منور کر دیا۔ ملتان کی اس خانقاہ کی روشنیاں مشرق و مغرب تک پھیلتی گئیں اور آپ کے خلفاء نے روحانیت کے مراکز قائم کیے۔ حضرت شیخ زکریا ملتانی نہ صرف بادشاہوں کے ایوانوں کے بلند پایہ عہدوں پر فائز رہے بلکہ بے پناہ دولت کے مالک بنے۔ "فوائد الفواد" سیر الاولیاء اور گلزار ابرار کے صفحات پر یہ بات ملتی ہے کہ جس دن حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے پاس چار ارب روپے موجود تھے۔ ان کے گوداموں میں اتنا غلہ جمع رہتا کہ ملتان کا گورنر کئی بار آپ سے غلہ ادھار لے کر ملکی ضروریات پوری کرتا تھا۔ آپ برصغیر کی تاریخ میں بلند ترین شیخ طریقت مانے جاتے ہیں جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ آپ کے ہمعصر بزرگان دین آپ کی ولایت اور روحانی منزلت کی بلندیوں کا اعتراف کرنے کے باوجود آپ کی دولت مندی پر شک کی نگاہ رکھتے تھے آپ کے ہم عصر دو مشائخ طریقت شیخ جلال الدین تبریزی اور شیخ حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہما نے آپ کی دولت مندی کے متعلق آپ سے اختلافی خط کتابت بھی کی۔ فقر و غنا، دربار شاہی، مناصب شاہی پر طویل گفتگو کی ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی

نے اپنی کتاب "اخبار الاخیار" میں ان بزرگوں کی خط کتابت سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بعض بزرگان دین دنیا داری کے باوجود روحانی مقامات حاصل کر لیتے ہیں۔ حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک خط میں تعجب کا اظہار کیا ہے کہ ایک امیر بزرگ روحانی منازل کیسے طے کر سکتا ہے۔ شیخ تبریزی نے حضرت زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک سوال اٹھایا کہ آپ کے اتنے باغات، جاگیریں اور گاؤں آپ کے دل کی دنیا کو کس طرح زندہ رہنے دیتی ہیں؟ شیخ حمید الدین ناگوری نے ایک خط میں لکھا تھا کہ دنیا دار اور امیر شیخ طریقت صاحب کرامات اور خوارق کس طرح بن سکتا ہے۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ نا صرف "سلسلہ سہروردیہ" پاک و ہند کے بانی اور ترجمان تھے بلکہ آپ بڑے صاحب کرامت بزرگ تھے۔ آپ کی روحانی سربلندی اور آپ کی روحانی خدمات کو ہر لحہ تسلیم کیا گیا تھا۔ حضرت شیخ زکریا ملتانی نے حضرت شیخ حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بات باور کرانے میں بڑی محنت کی کہ "دنیا کے منصب اور دولت، روحانی رفتار کے خلاف نہیں، دولت کا غلط استعمال روحانیت کے خلاف ہے مگر اللہ کی مخلوق کو اس دولت سے آسانیاں بہم پہنچانا بھی روحانی خدمت ہے۔"

آپ نے فرمایا میری ساری دولت، غلہ کے انبار، اور مال و متاع غربا و مساکین کے لیے وقف ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی ضروریات کو پورا کرنا میرا ایک اہم فریضہ ہے اس مال و دولت کے باوجود ایک بار حضرت شیخ زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کو دربار شاہی میں ایک تلخ تجربہ ہوا اور اس وقت کی سیاست میں الجھ کر آپ کو روحانی

منازل کے طے کرنے میں دشواری آئی۔ کہتے ہیں کہ آپ نے ایک بار سلطان التمش کو ملتان کے گورنر قباچہ خان کے خلاف ایک شکایت کی۔ اس درخواست کو سلطان التمش نے منظور تو کرلیا مگر مقامی طور پر حضرت زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کو ان سیاسی حالات کا تلخ سامنا کرنا پڑا جو اس وقت ملتان اور اس کے مضافات میں رونما ہوئے تھے۔ شیخ زکریا ملتانی کے فرزند شیخ صلاح الدین اور آپ کے دوسرے اعزہ بادشاہوں، امراء سلطنت سے آزادانہ ملتے تھے۔ جاگیریں حاصل کرتے، دنیاوی منافع کماتے۔ شیخ صلاح الدین نے تو سلطان بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد کی طلاق دادہ بیوی سے شادی کرلی تھی۔ اس طرح اگرچہ شہزادہ محمد اور شیخ صلاح الدین کے درمیان تلخیاں بڑھیں اور تعلقات خراب ہوئے مگر دربار شاہی میں رسائی کی بات شہزادہ محمد ان دنوں ملتان کا گورنر تھا۔

شیخ رکن الدین ملتانی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ رکن الدین ملتانی دہلی کے بادشاہوں کے درباروں میں آتے جاتے تھے۔ آپ نے سلطان محمود سے تعلق قائم کرکے ایک سو گاؤں پر مشتمل جاگیر حاصل کرلی تھی۔ آپ ایک زبردست عالم دین اور شیخ الوقت ہونے کے باوجود بلند پایہ ناظم اور ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ آپ نے ایک طرف جاگیر کی دیکھ بھال کا اعلیٰ انتظام کیا دوسری طرف ایک دینی درسگاہ قائم کرکے شاندار مثال قائم کردی اور جاگیر کی ساری آمدنی طلبہ پر صرف کرتے رہے۔ آپ نے روحانی تربیت کے لیے جو خانقاہ قائم کی اس سے ہزاروں سالکان سلسلہ سہروردیہ کو تربیت ملی اور ملتان کے مضافات کے علاوہ

ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں سلسلہ سہروردیہ کی خانقاہیں قائم ہوئیں۔ آپ کے جانشین صرف سجادہ نشین نہ تھے بلکہ علمی اعتبار سے علماء کرام میں شامل تھے جو روحانی طور پر سلسلہ طریقت کو جاری رکھنے کے قابل تھے۔ انہوں نے جاگیروں کی تقسیم در تقسیم کے عمل کو جاری رکھتے ہوئے آگے جاکر ایک جاگیرداری نظام قائم کیا اور دولت کی جتنی مکروہات ہوتی ہیں وہ آہستہ آہستہ اس روحانی خانوادہ میں در آئیں۔

حضرت زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک پوتے شیخ رکن الدین سلطان محمد فیروز کے دربار کے شیخ الاسلام مقرر ہوئے۔ اس سلسلہ کے ایک بلند پایہ بزرگ شیخ ہود ہوئے ہیں وہ علمی اور روحانی طور پر تو نہایت کمزور بزرگ تھے مگر انہوں نے اپنے بزرگوں کی ساری جاگیروں کی آمدنی اور دوسری فتوحات اپنے ذاتی معاملات میں مرکوز کرلیں۔ اس طرح خانقاہ کا نظام ختم ہوگیا ''خلاصۃ التواریخ'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ ان حالات میں بادشاہ نے حکم دیا کہ شیخ ہود کے گھر کی تلاشی لی جائے۔ جب بادشاہ کے کارندے شیخ کے گھر پہنچے تو اس وقت شیخ نے جو جوتا پہن رکھا تھا وہ لعل وجواہرات سے مرصع تھا جس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ تھی بادشاہ نے جاگیر ضبط کرلی۔ اگرچہ شیخ ہود نے بادشاہ کے خلاف ایک زبردست تحریک چلائی مگر آگے چل کر شیخ ہود کو اس بغاوت کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ایک روحانی خانوادے کے جانشین کا یہ حشر قابل افسوس ہے مگر دنیا کے منحوس سائے جب خانقاہوں پر پڑتے ہیں تو اس کی روحانی قدروں کو تباہ و برباد کردیتے ہیں۔ اس کے باوجود سلسلہ سہروردیہ کے مشائخ نے وقت کے بادشاہوں سے روابط قائم رکھے اور ملکی سیاسیات میں حصہ لیتے رہے۔

سید جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ

سید جلال الدین بخاری رحمتہ اللہ علیہ جن کا لقب ''مخدوم جہان'' تھا سلسلہ سہروردیہ کے ایک بلند پایہ شیخ طریقت تھے۔ انہوں نے ملتان میں رہ کر اپنی خانقاہ کو علم وروحانیت کا مرکز بنایا۔ تاہم وہ اپنے مشائخ کی طرح بادشاہان دہلی سے رابطہ رکھتے تھے اور ملتان سے چل کر دہلی میں اکثر آیا جایا کرتے تھے اور شاہی مہمان کی حیثیت سے شاہی دربار میں قیام کرتے تھے۔ وہ فیروز شاہ تغلق کے قریبی احباب میں شمار ہوتے تھے۔ بادشاہ آپ کے احکامات کو مانتا اور آپ کی خواہشات کے مطابق احکام نافذ کرتا تھا۔ آپ کی سفارش سے جام خیرالدین کی سزائے موت معاف کر دی گئی۔ آپ کا ملکی سیاسیات پر اتنا اثر تھا کہ سندھ کے گورنر عین الملک جیسا زبردست ایڈمنسٹریٹر بھی بعض معاملات میں آپ کی سفارش لے کر دہلی جاتا تھا۔ حضرت بہاء الدین زکریا کے خانوادے کے ایک اور بزرگ شیخ یوسف سلطان، بہلول لودھی کے بہت مقرب تھے۔ آپ کو بہلول لودھی نے ملتان کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا رحمتہ اللہ علیہ نے بڑی حقیقت بھری بات کہی تھی کہ ''جن کے پاس تریاق ہو ان پر زہر اثر نہیں کرتا'' آپ کی اولاد سے ایک بزرگ شیخ صدرالدین نے یہ کہہ کر ساری دولت غربا و مساکین میں تقسیم کر دی کہ ہمارے پاس تریاق نہیں ہے لہذا ہم زہر کا ذخیرہ جمع نہیں کر سکتے وہ فرماتے تھے۔ ''اندیشہ مندم کہ بلاشبہ مال دنیوی مرا فریب دہد'' مجھے ڈر ہے کہ دنیا کا مال مجھے دھوکا دے گا''

سلسلہء سہروردیہ کے آخری مشائخ

سلسلہ سہروردیہ کے بعد میں آنے والے سہروردی مشائخ نے دنیاداری کے معاملات کو اپنے فقر وغنا کے ساتھ ساتھ جاری رکھا اگرچہ دنیاوی معاملات نے ان بزرگوں کی روحانی تعلیمات پر اثر ڈالا مگر وہ وقت کے حکمرانوں سے تعاون حاصل کرتے رہے۔ ان مشائخ کی سادہ زندگی دنیاوی جاہ وجلال میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ فقر کی جگہ غنا اختیار کرنے لگے۔ انہوں نے خانقاہوں کی جگہ دربار بنانے شروع کر دیے۔ دولت اور سیاسی معاملات نے آہستہ آہستہ ''سلسلہ سہروردیہ'' کو روحانی اقدار سے دور کر دیا حتیٰ کہ اس سلسلہ کے قدیم بزرگان دین نے روحانیت کے جو مراکز قائم کیے تھے وہ بھی سجادہ نشینوں کی ہوس زر نے ختم کر دیے اور آخری دور میں وہ مراکز معدوم ہوتے گئے۔ پاکستان بننے کے بعد یہ شاندار روحانی سلسلہ پیرزادوں وڈیروں اور درباریوں کے دنیاوی جاہ وجلال کے مراکز بن کر بے اثر ہو کر رہ گیا۔ سجادہ نشینوں نے ملکی سیاست میں حصہ لے کر وزارتیں اور گورنرشپ تک عہدے حاصل کر لیے مگر روحانیت کا کاروان جاتا رہا۔

(جہانِ رضا لاہور۔ نومبر دسمبر ۲۰۰۷ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طرابلس کی ایک شبینہ محفل

طرابلس لیبیا کا دارالخلافہ ہے جہاں کرنل قذافی سابقہ چھتیس سال سے بلاشرکت غیرے حکمرانی کر رہے ہیں۔ اس ملک کی ۹۰ فیصد آبادی مسلمان ہے، جو افریقہ کے صحراؤں اور سمندروں کے ساحلی شہروں میں آباد ہے۔ کرنل قذافی واحد مسلمان حکمران ہیں جنہوں نے امریکی طاقت کے سامنے گردن نہیں جھکائی اور یورپی سامراج کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئے۔ امریکہ نے اسے کئی بار ہوائی حملوں کا نشانہ بنایا اور بحری قزاقی سے ملک کا ایک حصہ روندڈالا مگر کرنل قذافی نے نہ گردن جھکائی نہ امریکہ کی خدائی کو تسلیم کیا۔

ہمارے چند علمائے اہلسنت قذافی کی خصوصی دعوت پر لیبیا پہنچے تو ہمیں طرابلس کے ''گرین ہاؤس'' میں ٹھہرایا گیا۔ ''گرین ہاؤس'' اگرچہ طرابلس کی ایک نہایت خوبصورت قیام گاہ ہے مگر حقیقت میں یہ دنیا بھر کے امریکہ دشمن اور یہودیت مخالف سیاسی لیڈروں کی تربیت گاہ ہے۔ دن کو تو ہم لوگ اپنے ''مشن'' کی تکمیل میں مشغول رہتے مگر رات جب اپنا دامن پھیلاتی تو ہم ''گرین ہاؤس'' کے ایک خوبصورت باغیچے میں بیٹھ کر وطن کی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے محفل برپا کرتے۔ صحرا کے شفاف آسمان پر چمکتا ہوا چاند ہماری نگرانی کرتا اور ساحل سمندر کی خوش کن ہوا بادِ شمیم بن کر ہمارے دل و دماغ کو تازہ کر دیتی۔

اس باغیچے میں کرسیاں لگادی جاتیں، سامنے قہوے کے گرم گرم سماوار ساری

رات سفید پیالیوں کے حلقوں میں دعوت نوشانوش دیتے۔ ہم بیٹھ جاتے تو ہمارے اپنے ہی ''بچے'' نوجوان علماء قہوے کی پیالیاں لاتے رہتے اور ہم طرابلس کے ''گرین ہاؤس'' کے لان میں چسکیاں لیتے رہتے اور وطن کی باتیں اور یادیں تازہ کرتے رہتے۔

ہماری صفوں میں آپ کو پروفیسر مولانا محمد سعید اسد آف فیصل آباد بیٹھے نظر آئیں گے۔ وہ ہمارے ''امام الصلوٰۃ'' ہیں۔ یہ وہی پروفیسر مولانا سعید اسد ہیں جو پاکستان میں وہابیوں اور دیوبندیوں کو میدان مناظرہ میں للکارتے ہیں، سٹیج پر شیروں کی طرح دھاڑتے ہیں اور مجالس وعظ کو سنوارتے ہیں۔ ان کے پہلو میں ان کے ایک عقیدت مند نوجوان محمد اکرم بٹر بیٹھے ہیں۔ بٹر صاحب کا ہنہ لاہور سے تعلق رکھتے ہیں مگر پروفیسر سعید اسد صاحب کی تقریر کے گرویدہ اور اس کی رفاقت میں صبح وشام استادہ رہتے ہیں۔ آپ ذرا نظریں اٹھائیں تو آپ کو صاحبزادہ سید محمد محفوظ مشہدی آف بھکھی شریف نیم مسکراہٹ کے ساتھ لبوں پر نسوار کی مسی سجائے نظر آئیں گے۔ آپ پیر سید جلال شاہ آف بھکھی شریف کے فرزند ارجمند ہیں۔ دارالعلوم بھکھی کے ناظم اور مدرس اعلیٰ ہیں اور جمعیت علمائے پاکستان کے نائب صدر ہیں۔ ان کی گفتگو افسردہ خاطر اور وطن سے دور احباب کو گل تازہ کی خوشبو بن کر خوش کر دیتی ہے۔ مگر یہ سیدزادہ غالباً اپنے نظام خانقاہی کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک نوجوان سردار محمد خان لغاری آف ڈیرہ غازی خان کو اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ سردار محمد خان لغاری اگرچہ ''انجمن طلبائے اسلام'' کی صفوں سے ابھر کر ''جمعیت علمائے پاکستان'' کی صف میں آ کھڑے ہوئے ہیں مگر وہ صاحبزادہ مشہدی صاحب کے دامن کے سایہ میں سکون پاتے ہیں۔

آپ اندرون شہر لاہور کا ایک ہلکا پھلکا نو عمر نوجوان بھی آگے بڑھتا دیکھیں گے جو راقم کے سامنے آداب بجالا کر یوں گویا ہوتا ہے امیر محترم! اگر آپ حکم فرمائیں تو قہوے کا ایک پر جوش گرم گرم جام پیش کروں، سر ہلا تو نوجوان قہوہ لے کر کھڑا تھا۔ راقم نے قہوے کی پیالی سے ایک چسکی لی اور اہل مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے یہ اشعار پڑھے۔

لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا — آئی جوان کی یاد تو تھرا کے پی گیا

پیتا بغیر اذن کے کب تھی مری مجال — در پردہ چشم یار کی شہ پا کے پی گیا

ساقی میری یہ شوخی رندانہ دیکھنا — توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرا کے پی گیا

دیکھا نگاہ یار نے میری طرف جو آج — مجھ کو بھی شرم آئی تو شرما کے پی گیا

اے رحمت تمام میری ہر خطا معاف — میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا!

اگر آپ طرابلس کی اس محفل میں موجود ہوتے تو حاضرین کی طرح بڑے محظوظ ہوتے۔ یہ قہوہ پلانے والے ہمارے جواں سال ساتھی عبدالستار غازی کونسلر میونسپل کارپوریشن لاہور اور سیکرٹری جمعیت علماء پاکستان لاہور تھے، وہ تمام علماء کے خدمت گزار اور سراپا مستعد اور ہوشیار رہتے تھے اور سفر میں وفد کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھتے۔

افسر مہمانداری حکومت لیبیا نے مقامی طور پر ہماری خدمت اور چھوٹے چھوٹے معاملات کی نگرانی کے لیے وسطی افریقہ کا ایک بلالی نوجوان ''موسیٰ'' مقرر کیا ہوا تھا۔ یہ بڑا خوش مزاج نوجوان تھا۔ اپنے علاقائی خدوخال کے لحاظ سے بڑا خوبصورت، بڑا خدمت گزار۔ ہم اسے بلاتے ''یا موسیٰ! اذہب الینا!'' تو وہ دوڑا دوڑا

آتا اور آتے ہی کہتا ''یا'' وہ عربی جانتا تھا یا اپنی مادری زبان افریقی۔ مگر بڑا خدمت گزار، بڑا فرمانبردار، ہر ایک کا جاں نثار!

سامنے ایک کرسی پر ہمارے بھاری بھر کم ساتھی فخر القراء قاری محمد سلیمان ملک آف سروبہ جلوہ فرما ہیں۔ سفید گورا رنگ، چہرہ پر نور اور لبوں پر مسکراہٹ، آپ حیدر آباد سندھ سے آئے تھے، ہمارے دل جب پژمردہ ہو جاتے تو وہ اپنی قرأت بہ لحن داؤدی سے غنچہ ہائے دل کو کھلا دیتے۔ انہوں نے طرابلس کی سب سے بڑی ''جامع مسجد جمال عبدالناصر'' میں قرآن مجید سنایا تو طرابلس کے عربی قاری بھی جھوم اٹھے۔

میانوالی کا ایک نوجوان حافظ فدا محمد وقاص اٹھا یہ ہماری محفل کا ایک چمکتا ہوا پھول، بڑا خوش آواز، بڑا شیریں مقال! طرابلس کی مجلس، آدھی رات کا وقت اور چاند کی چاندنی! ہماری استدعا پر حافظ فدا محمد نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ نعت کیا سنائی...... دل وجاں وجد کناں جھک گئے بہر تعظیم!

اٹھا دو پردہ! دکھا دو جلوہ! کہ نور باری حجاب میں ہے

زمانہ تاریک ہو رہا ہے کہ مہر کب سے نقاب میں ہے

انہیں کی بو مایۂ سخن ہے انہیں کا جلوہ چمن چمن ہے

انہیں کے گلشن مہک رہے ہیں انہیں کی رنگت گلاب میں ہے

کھڑے ہیں منکر نکیر سر پر نہ کوئی حامی نہ کوئی یاور

بتا دو آکر میرے پیمبر کہ سخت مشکل جواب میں ہے

خدائے قہار ہے غضب پر کھلے ہیں بدکاریوں کے دفتر

بچا لو آکر شفیعِ محشر تمہارا بندہ عذاب میں ہے

کریم ایسا ملا کہ جس کے کھلے ہیں ہاتھ اور بھرے ہیں دفتر
بتاؤ اے مفلسو! پھر کیوں تمہارا دل اضطراب میں ہے!
گناہ کی تاریکیاں یہ چھائیں امنڈ کے کالی گھٹائیں آئیں
خدا کے خورشید مہر فرما کہ ذرہ بس اضطراب میں ہے
کریم اپنے کرم کا صدقہ لئیم بے قدر کو نہ شرما
تو اور رضا سے حساب لینا رضا بھی کوئی حساب میں ہے!

نعت سن کر اہل مجلس جھوم جھوم گئے۔ حافظ فدا کے ایک قریبی دوست مولانا رانا محمد ارشد ایم اے بھی رونق محفل بنے بیٹھے ہیں، ان دنوں وہ واعظ شیریں مقال، مقرر بے مثال کی حیثیت سے جامع مسجد محمد راوی روڈ لاہور کے خطیب لبیب ہیں۔

آپ کو سرحد سے آئے ہوئے علمائے کرام کے درخشاں چہرے، چمکتے ہوئے آفتاب ومہتاب نظر آئیں گے۔ ان میں اکثر خطیب، ادیب اور ماہر علوم عربیہ ہیں۔ جب گفتگو کرتے تو علم وفضل کے خزانے لٹاتے جاتے ہیں۔ بلوچستان کے کچھ علماء کرام ہماری آج کی مجلس کے حسن میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ہم اگر ایک پیالی قہوہ پیتے ہیں تو وہ تین تین پیالیاں نوش فرما جاتے ہیں۔ یہ قہوہ واقعی ایسا ہوتا جو زیادہ پیتا اس کے نمبر زیادہ ہوتے۔

''پینے والوں کا شور نوشا نوش''

یہ حضرات علم وفضل کے اعتبار سے بڑے پختہ کار تھے۔ دن کے وقت جب ہم افریقی وفود سے بات کرتے تو یہ علماء حضرات ان سے فصیح عربی میں بلا تکلف گفتگو کرتے۔ محفل کا رنگ تازہ رکھنے کے لیے راقم کو بعض اوقات ایسے جملے استعمال کرنا پڑتے جس سے دل بیدار رہتے اور نیند آنکھوں کے قریب آتے ہوئے جھجکتی۔ اہل

مجلس اپنے اپنے انداز پر بات کرتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے

''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است!''

قاری محمد سلیمان آف سروبہ (حیدر آباد) اٹھے اور کہنے لگے اے امیر محترم! اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی وساطت سے تمام اہل محفل کو آج ایک واقعہ سناؤں، آج مجھے شہر طرابلس کے وسط میں ''جامع مسجد جمال عبد الناصر'' میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میرا ایک مقامی پاکستانی دوست مجھے اس عظیم الشان مسجد میں لے گیا تھا۔ یہ مسجد شہنشاہ سنوسی کے محلات کے عین درمیان واقع ہے جس میں تین سو پادری مشنری عیسائیت کی تبلیغ کا مرکز بنا کر سارے افریقی ممالک میں تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ کرنل قذافی نے انقلاب برپا کیا تو سارے شاہی محلات کو سرکاری دفاتر میں تبدیل کر دیا گیا اور خود صحرائی خیمے میں قیام کر کے انقلابی اصلاحات نافذ کرنے لگے۔ کچھ دنوں بعد اس نے عیسائی مشنریوں کو بلا کر کہا کہ وہ یہاں سے چلے جائیں اب ہمیں تمہاری تبلیغ اور مشنری خدمات کی کوئی ضرورت نہیں، اس نے انہیں ایک ماہ کی مہلت دی اور سمندر میں ایک بحری جہاز کھڑا کر دیا کہ وہ اپنا ''تبلیغی سامان'' سر پر اٹھائے اٹلی چلے جائیں۔ عیسائیوں کا یہ مرکز خالی ہوا تو کرنل قذافی نے عیسائیت کے اس مشنری مرکز کو ایک جامع مسجد میں تبدیل کر دیا۔ اب اس کا نام ''جامع مسجد جمال عبد الناصر'' ہے۔ اس مسجد میں دنیائے اسلام کے علماء آتے ہیں، قاری حضرات قرأت سناتے ہیں۔ میں مسجد میں داخل ہوا تو مصر کے ایک خوش الحان قاری الخلیل الحسنی المصری تلاوت کر رہے تھے۔

امیر محترم! میں ان کی قرأت سے جھوم گیا مگر میرے دل میں یہ جذبہ موجزن

ہوا کاش مجھے بھی یہاں قرأت سنانے کا موقع مل جائے، میں نے کوشش کی، منتظمین سے اپنا تعارف کرایا۔ الشاہ احمد نورانی الصدیقی کے وفد سے تعلق بتایا تو مجھے قرآن مجید سنانے کی اجازت مل گئی جب میں مائک کے سامنے پہنچا تو مسجد لوگوں سے لبالب بھر چکی تھی۔ میں نے تلاوت قرآن پاک کی تو لوگوں کے چہرے تمتما اٹھے، میری نظریں ان کے جذبات کو پڑھ رہی تھیں، میں ان کے ذوق وشوق کو دیکھ کر جھوم رہا تھا۔ نماز کے بعد مصری قاری مجھے اپنے گھر لے گئے، پر تکلف دعوت دی، اپنی ایک سو کیسٹیں دیں مجھے اپنی شاگردی میں قبول فرمایا، سر پر مصری ٹوپی رکھی اور میرا منہ چوم کر الوداع کیا۔

قاری محمد سلیمان صاحب کا یہ اعزاز اور کامیابی ہم سب کے لیے باعث افتخار تھی۔ سب نے مبارک پیش کی، سب نے مرحبا کہا سب نے دل کھول کر داد دی۔

قاری محمد سلیمان صاحب کی بات نے ہم سب کو خوش کام کیا۔

''چہ خوش کردی وخوش گفتی عفاک اللہ نکو کردی''

صاحبزادہ سید محفوظ مشہدی اٹھے اور فرمانے لگے لیبیا کی حکومت نے پاکستانی علماء کرام کے وفد کو سمندر کی وہ بندرگاہ دکھانے کا پروگرام بنایا ہے کہ جب سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیر کمان مصر فتح ہوا تو لیبیا کا علاقہ مصر میں شامل تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صاحب فاتح مصر عمرو ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم پر اپنی فوج لے کر سمندر کے اس ساحل کی طرف بڑھے اور جب وہ سمندر کے اس ساحل پر پہنچے تو مسلمانوں کے لشکر کے سپہ سالار عقبہ بن رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجاہدین کو لے کر اپنے گھوڑے سمندر کی لہروں میں ڈال دیے اور آگے جا کر

اسلامی جھنڈا بلند کر کے کہنے لگے ''اے اللہ! تیری زمین ختم ہوگئی ہے ورنہ تیرے نبی کا پیغام لے کر ہم وہاں تک بڑھتے جاتے جہاں سورج غروب ہوتا ہے۔'' اس بندرگاہ کا نام آج بھی ''عقبہ بن رافع'' ہے اور اس کے سمندر کا پانی نیلگوں ہونے کی بجائے کالا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

سب اہل مجلس خوشی سے جھوم اٹھے اور یک زبان ہو کر کہا کہ ہم اس سفر پر ضرور جائیں گے۔ پہلے وہ دشت دیکھیں گے جہاں سے عربی غازیوں کے گھوڑے گزرے تھے پھر وہ سمندر دیکھیں گے جہاں سے بحر ظلمات شروع ہوتا ہے۔

گزشتہ روز پاکستانی علمائے اہلسنت کے وفد کو لیبیا کی عظیم الشان یونیورسٹی ''الفاتح'' میں ایک سیمینار میں دعوت شرکت دی گئی۔ اس سیمینار میں مختلف ممالک سے آئے ہوئے سیاسی راہنماؤں نے اپنے اپنے علاقائی خطوں کے حالات پر اظہار خیال کرنا تھا۔ اگرچہ ہر مقرر اپنی اپنی زبان میں تقریر کرتا تھا مگر جو ہمیں مائیکروفون پہنائے گئے تھے ان میں اردو ترجمہ سنایا جاتا تھا۔ ہم ان مقرروں کے خیالات سے پوری طرح استفادہ کرتے رہے۔ ''الفاتح یونیورسٹی'' کے ایک پروفیسر حمزہ السعید النوری نے اپنے لیکچر میں لیبیا کے انقلاب پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر نوری کرنل قذافی کے دست راست مانے جاتے تھے اور انہوں نے بادشاہ سنوسی کا تختہ الٹتے وقت قذافی کا مکمل ساتھ دیا تھا اور اس انقلاب کے چشم دید ہی نہیں ایک انقلابی لیڈر تھے۔ وہ اپنی تقریر کے دوران انقلابی نعرے بھی لگاتے اور حاضرین کو ہم آواز بناتے جاتے۔

دوران تقریر انہوں نے کرنل قذافی کے کامیاب انقلاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے Our Leader Qadafi کے نعرے بلند کیے تو حاضرین مجلس نے ہم نوائی کی، چند نعروں کے شور کے بعد ہمارے وفد کے ایک نوجوان عبدالستار غازی نے نعرہ Our Leader Noorani بلند کیا۔ اس نعرے کی ہمنوائی سارے پاکستانی وفد نے کی۔ السعید النوری نے سمجھا کہ وہ قذافی کی بجائے ''نوری'' کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ صرف زبان اور لہجے کی وجہ سے نوری کی بجائے ''نورانی'' کہہ جاتے ہیں۔ اس نے ایک دو بار ٹوکا مگر ہمارا وفد نعرے بازی میں سارے ہال پر چھا گیا۔ آور لیڈر نورانی، آور لیڈر نورانی، آور لیڈر نورانی!

چائے کی ٹیبل پر حمزہ سعید نوری میرے پاس تشریف لائے اور میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا آپ کے وفد نے مجھے بڑی عزت بخشی اور میرے نعرے بلند کیے۔ میں نے بھی ان کی انقلابی تقریر کی تعریف کرتے ہوئے ان کے انقلابی منہ میں مٹھائی کی ایک ڈلی ڈال دی اور اسے خوش کر دیا۔ آدھی رات ڈھلتی جارہی تھی مگر جذبہ تیز ہوتا جارہا تھا۔ دل چاہا کہ مجلس کا دامن لپیٹ دیں مگر خیال آیا

ابھی تھوڑی سی رات باقی ہے　　ابھی لمبی سی بات باقی ہے

عزیزی فدا محمد خان وقاص نے ''مصطفی جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' پڑھا اور ہم اپنے کمروں میں چلے گئے۔ بایں ہمہ

''ابھی لمبی سی بات باقی ہے!''

(''جہانِ رضا'' ماہ ستمبر ۱۹۹۸ء)

قدمی هذه علی رقبة کل ولی الله

الشیخ عبدالحق محدث و محقق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں

مرتبہ و ترجمہ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی (ایم۔اے)

غوث الثقلین حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ امت رسول ﷺ میں ایسی روحانی بلندیوں پر جلوہ فرما ہیں جہاں تک کسی ولی اللہ کو رسائی حاصل نہیں ہو سکی تمام اولیائے امت کی گردنیں آپ کے فضل و کمال کے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔ آپ کا یہ اعلان کہ ''میرا قدم تمام اولیاء اللہ کی گردن پر ہے'' ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس سے کسی ولی اللہ نے انکار نہیں کیا۔ بلکہ گردنیں جھکا کر آپ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث و محقق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے سیدنا غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اس مقام کا ذکر کرتے ہوئے تمام برگزیدہ اولیاء اللہ کے اعتراف و تسلیم کو جمع کر دیا ہے۔ چونکہ ان دنوں بعض برخود غلط علمائے کرام اور مشائخ عظام نے اس مسئلہ پر قیل و قال شروع کر رکھی ہے اس لیے ہم اس فاضل یگانہ کے خیالات کو ''جہان رضا'' کے قارئین کی نذر کر رہے ہیں (ایڈیٹر)

الشیخ العالم شہاب الدین عمر سہروردی نے شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی رحمۃ اللہ علیہما کی روایت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ایک دن شیخ حماد دباس رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیٹھا تھا۔ اس مجلس میں سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی موجود تھے۔ آپ جب اٹھ کر مجلس سے باہر گئے تو شیخ حماد رحمۃ اللہ علیہ نے اہل مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ عجمی نوجوان ان دنوں سلوک و معرفت میں قدم بڑھاتا

جارہا ہے۔ اور اس کے مقامات روز بروز بلند ہوتے جارہے ہیں ایک دن آئے گا
جب اس کے قدم اولیاء اللہ کی گردن پر ہوں گے۔ اور اس نوجوان کو حکم دیا جائے گا کہ
اعلان کرے (قدمی هذه علیٰ رقبة کل ولی الله) یہ اعلان ہوتے ہی وقت
کے تمام اولیاء اللہ اپنی گردنیں جھکا دیں گے۔

مجھے بہت سے مشائخ نے بتایا اور ان میں سے حضرت شیخ عدی بن مسافر
رحمتہ اللہ علیہ کا نام بہت نمایاں ہے۔ یہ حضرت عدی رحمتہ اللہ علیہ ولی اللہ ہیں جن
کے متعلق حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ ''اگر نبوت
ریاضت کے ذریعہ حاصل ہوتی تو شیخ عدی رحمتہ اللہ علیہ نبی ہوتے۔'' شیخ عدی رحمتہ اللہ علیہ سے
پوچھا گیا کہ کیا آج سے پہلے بھی کسی ولی اللہ نے (قدمی هذه علیٰ رقبة کل
ولی الله) کا اعلان کیا؟ آپ نے فرمایا ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پھر آپ بتائیں کہ اس
اعلان کا کیا مقصد ہے؟ آپ نے بتایا۔ حضرت شیخ سید عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ اولیاء
اللہ میں ''خاص فرد'' ہیں۔ پوچھا گیا آج سے پہلے کئی فرد ہوئے ہیں انہوں نے ایسا
کیوں نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا ہاں ان افراد کو ایسا اعلان کرنے کا حکم نہیں دیا گیا
تھا۔ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان کرنے کا خصوصی حکم دیا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے
حکم سے اولیاء اللہ کی گردنوں پر قدم رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ولی کی گردن آپ
کے سامنے جھک گئی تھی۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ
السلام کو خود بخود سجدہ نہیں کیا تھا، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا تو انہوں نے حضرت آدم
علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا۔

حضرت شیخ ابی سعید قیلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے مشائخ کی روایت سے بتایا کہ

حضرت سیدنا عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے بتایا کہ (قدمی هذه علیٰ رقبة کل
ولی الله) اللہ تعالیٰ کے حکم سے کہا گیا تھا۔ یہ حکم قطب الارشاد کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں
دیا جاتا اور قطب ہونے کی یہی نشانی ہے کہ زمانے کے اقطاب کو یہ اعزاز حاصل ہوتا ہے مگر
اعلان کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اور انہیں سکوت کے بغیر گنجائش نہیں ہوتی۔ اور جسے یہ
اعلان کرنے کی اجازت دی جاتی ہے وہ اقطاب اکمل اور منفرد ہوتا ہے۔

شیخ احمد رفاعی رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا گیا آیا سیدنا عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کو
(قدمی هذه علیٰ رقبة کل ولی الله) کہنے کا حکم ہوا تھا یا انہوں نے خود اعلان
کر دیا۔ آپ نے فرمایا بیشک ایسا کہنے کا آپ کو حکم دیا گیا تھا۔

شیخ علی بن الہیتی رحمتہ اللہ علیہ کی یہ بات شیخ عارف ابو محمد بن ادریس یعقوبی رحمتہ اللہ علیہ
نے بتائی کہ جب حضرت سیدنا عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے (قدمی هذه علیٰ رقبة
کل ولی الله) کہا تو شیخ علی الہیتی رحمتہ اللہ علیہ مجلس میں موجود تھے۔ وہ دوسرے مشائخ
کے ساتھ اٹھے اور منبر کے پاس جا بیٹھے اور حضرت غوث اعظم رحمتہ اللہ علیہ کا قدم
مبارک اٹھا کر اپنے کندھوں پر رکھ لیا اور ان کے دامن کے سایہ میں بیٹھ گئے۔
دوستوں نے آپ سے پوچھا آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ نے بتایا جب سیدنا غوث
الاعظم رحمتہ اللہ علیہ کو یہ کہنے کا حکم ہوا تھا جسے میں نے خود سنا تھا۔ یاد رکھو! اولیاء اللہ
سے جو شخص اس بات سے انکار کرے گا اس کی ولایت سلب کر لی جائے گی۔ میں نے
سب سے پہلے بڑھ کر آپ کا قدم مبارک اپنے کندھوں پر رکھ لیا۔

شیخ علی الہیتی رحمتہ اللہ علیہ عراق کے ان چار مشائخ میں سے ہیں جو کوڑھ کے علاج
اور اندھوں کی شفا کے لیے مشہور تھے۔ ان میں شیخ عبد القادر، شیخ علی الہیتی، شیخ بقاء بن

بطوء اور شیخ سعید قیلوی رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ ایسے مشائخ کی ایک اور جماعت نے بھی حضرت سیدنا غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے پاؤں کے نیچے اپنی گردنیں جھکا دیں۔ ان میں سے شیخ ابو شاہ محمد محمود بن احمد کردی، شیخ سبا بن بطوء، شیخ ابو سعید قیلوی، شیخ عدی بن مسافر، شیخ علی الہیتی اور شیخ احمد رفاعی مشہور ہیں۔ یہ لوگ اس مجلس میں موجود تھے جس مجلس میں حضرت سیدنا غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ نے (قدمی ھذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللّٰہ) کہا تھا۔ ان کے علاوہ پچاس بڑے بلند رتبہ مشائخ بھی حاضر تھے سب نے وہاں ہی اپنی گردنیں جھکا دیں۔ شیخ علی الہیتی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اٹھ کر آپ کا قدم مبارک اپنی گردن پر رکھ لیا۔

مشائخ کی ایک جماعت نے خبر دی ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں اس وقت جہاں جہاں اولیاء کرام موجود تھے سب نے اپنے کشف سے اس اعلان کو سنا تو اپنی اپنی گردنیں جھکا دیں۔ حضرت شیخ ابو سعید قیلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور بیان میں فرمایا کہ جس دن سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے (قدمی ھذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللّٰہ) کا اعلان فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل پر تجلی فرمائی تھی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کو فرشتوں نے ایک خلعت پہنا کر اعزاز بخشا تھا۔ اس موقع پر تمام اولیاء امت موجود تھے۔ آپ کے ہم عصر اولیاء اللہ کے علاوہ تمام اولیاء کرام جو آپ سے پہلے گزر چکے تھے اور وہ تمام اولیاء کرام جو ابھی اس دنیا میں نہیں آئے تھے متقدمین اور متاخرین اولیاء اللہ کی ارواح کو اس مجلس میں حاضر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو جس وقت خلعت پہنائی گئی تو اولیاء اللہ کے علاوہ بے شمار فرشتے اور رجال غیب ہاتھ باندھے آسمانوں پر کھڑے تھے ہم نے دیکھا کہ اس دن

اس قدر اولیاء اللہ، رجال الغیب اور فرشتے جمع تھے کہ ساری زمین پر تل دھرنے کی جگہ خالی نہ تھی۔ مشرق سے لے کر مغرب تک بے شمار مخلوق دست بستہ موجود تھی۔ ہمیں ایسا کوئی ولی نظر نہ آیا تھا جس نے اپنی گردن نہ جھکائی ہو۔

شیخ بقا بن بطوء رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا کہ جس دن حضرت شیخ سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے (قدمی ھذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللّٰہ) کہا تھا تو فرشتوں کی صفوں سے آواز آئی اے اللہ کے بندے آپ نے سچ کہا ہے۔ حضرت بقاء بن بطوء رحمۃ اللہ علیہ مشاہیر مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا نام ان چار اولیاء کبار میں لکھا ہے جو حضرت سیدنا غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی جلیس تھے۔

ایک زمانہ تھا کہ حضرت سیدنا غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ بقاء بن بطوء کی محفل میں حاضر ہوتے تو از رہ ہیبت کانپنے لگتے اور بدن میں خون خشک ہو جاتا۔ پھر جب آپ کو اعلیٰ منصب ولایت عطا ہوا تو یہی شیخ بقا جناب غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں جاتے تو ان پر ہیبت طاری ہو جاتی اور خون خشک ہو جاتا، ان کا سارا بدن کانپنے لگتا تھا۔

حضرت شیخ مکارم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ منظر دکھایا کہ دنیا بھر میں ایسا کوئی ولی اللہ نہیں رہا جس کی ولایت پر حضرت شیخ سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مہر نہ لگی ہو۔ وہ اطراف عالم میں جہاں کہیں بھی تھے نزدیک دور، مشرق و مغرب تمام اولیاء آپ رحمۃ اللہ علیہ کے تابع قرار دیے گئے۔ دنیا میں ایسا کوئی ولی اللہ نہیں جس کے سر پر حضرت سیدنا غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا عطا کردہ تاج ولایت نہ ہو۔ آج بھی ہر ولی اللہ کے وجود پر حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تصرف کی خلعت پہنائی جاتی ہے اور شریعت و طریقت کے منقش لباس ہر ولی اللہ کو عطا ہوتے رہتے ہیں۔

جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے (قدمی هذه علیٰ رقبة کل ولی اللّٰه) فرمایا تو آپ کی روحانی مملکت کے تمام اولیاء اللہ نے سر جھکا دیے۔ حتیٰ کہ ولایت سے حصہ پانے والے سلاطین جہاں کی گردنیں بھی جھک گئیں۔ پھر کائنات ارضی کے انتظامات کے نگران دس ابدالوں نے بھی گردنیں جھکا دیں۔ ایسے ابدال اور اولیاء اللہ میں شیخ بقاء بن بطو، شیخ ابو سعید قیلوی، شیخ علی بن الہیتی، شیخ عدی بن مسافر، شیخ موسیٰ زولی، شیخ احمد رفاعی، شیخ عبد الرحمٰن طفسونجی، شیخ ابو محمد قاسم بن عبد اللہ بصری، شیخ حیات بن قیس حرانی، شیخ ابو مدین مغربی جیسے جلیل القدر اولیاء اللہ نے گردنیں جھکا دی تھیں۔

شیخ خلیفہ اکبر اکثر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضری کا شرف پاتے تھے۔ ایک دن انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گذارش کی حضور! سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا دعویٰ (قدمی هذه علیٰ رقبة کل ولی اللّٰه) کہاں تک درست ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کا دعویٰ درست ہے اور ہم نے انہیں اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔ وہ وقت کے قطب الارشاد ہیں۔

مشائخ میں سے ایک بزرگ کا نام شیخ لولوء تھا۔ ان کا خطاب "علی الانفاس" تھا۔ جس دن سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے (قدمی هذه علیٰ رقبة کل ولی اللّٰه) کا اعلان فرمایا اس وقت آپ مکہ مکرمہ میں تھے۔ وہاں دوسرے مشائخ کی ایک جماعت نے اپنے اپنے دلوں میں خیال کیا کہ حضرت شیخ لولوء رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی نسبت کہاں ہے۔ آپ نے ان حضرات کے دلوں کے خیالات کو بھانپ کر فرمایا میں سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے روحانی نسبت رکھتا ہوں۔ جس دن آپ نے (قدمی هذه علیٰ رقبة کل ولی اللّٰه) فرمایا تھا تو میں نے دیکھا کہ تین سو تیرہ اولیاء اللہ

نے زمین کے افق پر بیٹھے بیٹھے اپنی گردنیں جھکا دی تھیں۔ آج حرمین شریفین میں سترہ اولیاء اللہ، عراق میں ساٹھ، عجم میں چالیس، شام میں بیس، مصر میں بیس، مغرب میں ستائیس، مشرق میں تیس، حبشہ میں گیارہ، سد سکندری کے اس پار یاجوج ماجوج کی سرزمین میں سات، سراندیپ (سری لنکا) میں سات، کوہ کاف میں ستائیس، سمندری جزیروں میں چوبیس ایسے اولیاء اللہ ہیں جو مقام قرب پر فائز ہیں۔ ان تمام حضرات نے گردنیں جھکا دی تھیں۔

شیخ ابی محمد بن عبد اللہ بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس دن حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو (قدمی هذه علیٰ رقبة کل ولی اللّٰه) کہنے کا حکم ہوا تھا میں نے دیکھا کہ مشرق و مغرب میں جتنے اولیاء اللہ ہیں سب نے اپنے سروں کو نیچے کر لیا تھا۔ مجھے عجم میں ایک ولی اللہ ایسا بھی نظر آیا جو گردن جھکانے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا کچھ عرصہ بعد اس کا حال دگرگوں دیکھا۔

شیخ احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ ایک دن اپنی مسجد کے محراب میں بیٹھے تھے۔ بیٹھے بیٹھے آپ نے سر جھکا لیا اور زبانی کہا "میری گردن پر بھی!" لوگوں نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے، فرمایا ابھی ابھی شیخ عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے بغداد میں (قدمی هذه علیٰ رقبة کل ولی اللّٰه) کا اعلان فرمایا ہے۔ میری گردن پر آپ کا پاؤں ہے۔ لوگوں نے وہ تاریخ لکھ لی۔ معلوم ہوا کہ واقعی اس وقت یہ اعلان ہوا تھا۔

شیخ ارسلان نے جب اپنی گردن جھکائی تو آپ نے کہا آج شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بغداد میں یہ اعلان کیا ہے میری گردن جھک گئی ہے دوستوں نے وہ تاریخ لکھ لی واقعی اس تاریخ کو بغداد میں سید عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے (قدمی

هذه علیٰ رقبة کل ولی اللہ) کا اعلان فرمایا تھا۔

اسی طرح بعض مشائخ نے بتایا کہ شیخ عبدالرحمٰن طفسونجی رحمۃ اللہ علیہ نے طفسونج میں بیٹھے بیٹھے اپنی گردن اتنی جھکا دی کہ ماتھا زمین کے فرش پر لگنے لگا اور زبان سے فرمایا میرے سر پر! احباب نے پوچھا تو آپ نے فرمایا بغداد میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے آج (قدمی هذه علیٰ رقبة کل ولی اللہ) کا اعلان فرمایا ہے۔

شیخ رغبت رجی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا تھا جس دن حضرت شیخ سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے (قدمی هذه علیٰ رقبة کل ولی اللہ) کا اعلان فرمایا تو میں دمشق میں شیخ ارسلان کے پاس بیٹھا تھا۔ آپ نے فوراً گردن جھکا دی اور پھر اپنے دوستوں کو صورتحال سے آگاہ کیا اور فرمایا جس نے دریائے معرفت الٰہی سے ایک گھونٹ پیا وہ معرفت کے فرش پر براجمان ہوگیا۔ اس کی روح نے اللہ تعالیٰ کی عظمت، ربوبیت کا احترام اور وحدانیت کی عزت کا مشاہدہ کر لیا، اس کے اوصاف حضرت قدس کی قربت میں منظم ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی ہیبت وجلال میں فنا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ اسے بلند زینوں پر چڑھاتا ہے یہاں تک کہ وہ "مقام قرار" کو جا پہنچتا ہے اس کی روح تسکین کی فضاؤں میں پرواز کرتی ہے اور بادِ نسیم نورانی مقامات تک لے جاتی ہے۔ اس کے دل پر پوشیدہ اسرار ظاہر ہو جاتے ہیں ایسا فرد نہ بے ہوش ہوتا ہے نہ غفلت اختیار کرتا ہے۔ وہ سکر کی کیفیت سے مبرا کر دیا جاتا ہے۔ وہ ایسے مقامات سے اوپر چلا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں باہوش، باصفا، باادب کھڑا ہوتا ہے آج ان اوصاف سے سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ متصف ہیں۔

شیخ ابو یوسف انصاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ رغبت رجی سے سنا

تھا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ قطب اعلیٰ ہیں۔ تمام اقطاب امت ان کے زیر سایہ ہیں۔ وہ "سامی فرد" ہیں اور تمام "افراد" ان کے تابع ہیں۔ وہ علوم و معارف کی سلطنت کے شہنشاہ ہیں۔ ان پر یہ مقام منتہی ہوتا ہے۔ معالم حق کے شہسوار ہیں اور ان کے ہاتھ میں مہاریں ہیں۔ عارفوں میں جتنے شہبازان طریقت ہوئے ہیں وہ تمام کے سردار ہیں۔ وہ محبان صادق کے قافلے کو آگے لے جاتے ہیں۔ ان کے چہرے کی ہیبت وجلال سے بڑے بڑے ارباب عرفان کی عقلیں اڑ جاتی ہیں۔ ان کی خاموشی سے پہاڑ کانپتے ہیں۔ وہ اولیاء اللہ کے سینوں میں چھپے ہوئے احوال پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ قبروں میں سوئے ہوئے اولیاء اللہ کے احوال پر نظر ڈالتے رہتے ہیں۔ ان کے وسیلے سے اولیاء اللہ مراتب حاصل کرتے ہیں۔

مشائخ نے شیخ ابی مدین شعیب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بتایا کہ آپ پچھم میں اپنے احباب میں بیٹھے تھے بیٹھے بیٹھے گردن جھکا دی اور فرمایا میں انہی میں سے ہوں۔ اے اللہ! تیرے فرشتے گواہ رہیں میں نے گردن جھکا دی ہے۔ میں نے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا اعلان سنا اسے تسلیم کیا۔ دوستوں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا آج سید عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے (قدمی هذه علیٰ رقبة کل ولی اللہ) کا اعلان کیا ہے۔

شیخ عبدالرحیم مغربی رحمۃ اللہ علیہ نے صنعاء شہر میں بیٹھے بیٹھے گردن جھکا دی اور فرمایا ایک سچے انسان نے سچ کہا۔ لوگوں نے پوچھا تو فرمایا بغداد میں سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے (قدمی هذه علیٰ رقبة کل ولی اللہ) کا اعلان فرمایا ہے۔ آج اس اعلان پر مشرق و مغرب میں بیٹھے ہوئے اولیاء اللہ کی گردنیں جھک گئی ہیں۔

حضرت شیخ ابی نجیب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس

میں اس دن بغداد میں بیٹھے ہوئے تھے جس دن آپ نے (قدمی ھذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ) کا اعلان فرمایا۔ حضرت سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا سر جھکا دیا، قریب تھا کہ آپ کی پیشانی زمین کے فرش پر جا لگے اور آپ نے زبان سے تین بار کہا میرے سر پر میری آنکھوں پر۔

شیخ عثمان بن مرزوق رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ ابی مکرم رحمۃ اللہ علیہ دونوں مصر سے بغداد آئے اور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لیے مسجد میں حاضر ہوئے۔ اس مجلس میں عراق کے بہت سے مشائخ موجود تھے۔ حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے (قدمی ھذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ) کہا تو مجلس میں تمام اولیاء اللہ نے اپنی گردنیں جھکا دیں۔ مجلس برخاست ہوئی تو شیخ ابی مکرم نے نگاہ بصیرت سے مشرق و مغرب کے افقوں پر نگاہ ڈالی آپ نے دیکھا دنیا کا کوئی ولی اللہ ایسا نہیں جس نے گردن نہ جھکا دی ہو۔ فرماتے ہیں مجھے اصفہان میں ایک بزرگ نظر آیا جس نے گردن نہیں جھکائی تھی کچھ دنوں بعد اس کو خراب حال دیکھا۔

شیخ ابو قاسم بطائحی حدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں کوہ لبنان میں قیام پذیر تھا۔ کوہ لبنان میں ایک شیخ عبداللہ جبلی ایک عرصے سے قیام پذیر تھے، میں ان کے پاس آ بیٹھا اور پوچھنے لگا حضرت آپ کو یہاں قیام پذیر ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟ انہوں نے بتایا ساٹھ سال ہو گئے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ یہاں کوئی عجیب بات دیکھی ہو تو بیان فرمائیں۔ آپ نے فرمایا میں یہاں اکثر دیکھتا ہوں کہ کوہستانی لوگ چاندنی رات میں روشن چہروں کے ساتھ جمع ہوتے رہتے ہیں اور قافلہ در قافلہ بغداد کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ میں نے ایک ایسے پرواز کرنے والے سے پوچھا آپ لوگ ہر روز کدھر جاتے ہیں۔

اس نے بتایا کہ ہمیں حکم ہوا ہے کہ ہم بغداد میں ایک شخص سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری دیا کریں۔ میں نے بھی ان کے ساتھ جانے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اس نے کہا آپ بھی چلیں۔ ہم ایک چاندنی رات اڑتے ہوئے بغداد پہنچے۔ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بے شمار اولیاء اللہ صف بستہ دست بستہ کھڑے تھے۔ آپ جدھر نگاہ اٹھاتے اولیاء اللہ سر جھکا دیتے۔ جب آپ اشارہ ابرو سے اجازت دیتے تو صف در صف اولیاء اللہ پرواز کرتے اپنے اپنے وطن کو روانہ ہو جاتے۔ جس دن آپ نے (قدمی ھذہ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ) کا اعلان کیا ہماری گردنیں جھک گئی تھیں۔ (تفصیلات کے لیے "زبدۃ الآثار" مولفہ شیخ عبدالحق محدث محقق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا مطالعہ کریں۔)

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

گردنیں جھک گئیں ، سر بچھ گئے دل لوٹ گئے
" کشف ساق" آج کہاں! یہ تو قدم ہے تیرا
تاج فرق عرفا کس کے قدم کو کہیے ؟
سر جسے باج دیں وہ پاؤں ہے کس کا ؟ تیرا !
سکر کے جوش میں جو ہیں وہ تجھے کیا جانیں
خضر کے ہوش سے پوچھے کوئی رتبہ تیرا
مزرع چشت و بخارا و عراق و اجمیر
کون سی کشت پہ برسا نہیں بھالا تیرا

("جہانِ رضا" ماہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۹ء)

لاہور میں ''جام نور دہلی'' نے نور کی محفلیں سجا دیں

''جام نور دہلی'' کے مدیر اعلیٰ علامہ خوشتر نورانی صاحب ۲۷ فروری ۲۰۰۸
کی شام کی فلائٹ سے لاہور پہنچے ان کے استقبال کے لیے ایڈیٹر ''جہان رضا'' پیر
زادہ اقبال احمد فاروقی، مفتی محمد خان صاحب قادری، مہتمم دار العلوم اسلامیہ، [illegible]
ٹریولرز کے ناظم اعلیٰ محمد عزیز خان صاحب قادری، الخضر ی ایجوکیشن سسٹم کے [illegible]
الجامعہ علامہ محمد نعیم نوری، علامہ اقبال ایئر پورٹ لاہور پر موجود تھے۔ علامہ خوشتر نورانی
اپنی والدہ محترمہ اور والد گرامی کے ہمراہ پاکستان میں آئے تھے۔ آپ حضرت علامہ
ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے ہیں۔ اور ''ماہنامہ جام نور'' دہلی کے چیف ایڈیٹر
ہیں۔ ان کی آمد پر لاہور میں جام نور کے کئی دور چلے۔

سب سے پہلے پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کے میخانہء فاروقی کو [illegible]
یہ دور لاہور میں جام نور کے پہلے دور آغاز ہوا۔

آمد سنی کسی کی تو واللہ رے اشتیاق — آنکھیں بچھائیں ہم نے جہاں تک نظر گئی

علی الصبح حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے دربار کی حاضری تھی۔ حاضری کے
بعد ''جام نور'' کا دوسرا دور دار العلوم نعمانیہ لاہور میں مرکزی مجلس رضا کے دفتر میں
چلا۔ دار العلوم نعمانیہ کے اساتذہ ناظمین اور طلبہ کے علاوہ مختلف علماء کرام بھی اس
محفل میں موجود تھے۔ استقبالیہ دیا گیا اور علامہ خوشتر نورانی نے مدیر ''جہان رضا''
کی خدمات کو ہدیہ تحسین پیش کیا اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے افکار کو چار دانگ
عالم میں پھیلانے پر ''جہان رضا'' کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اس دوران [illegible]

جہان رضا'' سے خصوصی انٹرویو لیا گیا۔ یہ انٹرویو جام نور دہلی کے شمارہ برائے اپریل
۲۰۰۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔

یکم مارچ کی شام کو ''جام نور'' کا تیسرا دور شروع ہوا یہ جامع مسجد نبویہ،
بیرون دہلی دروازہ لاہور میں صاحب ''تفسیر نبوی'' مولانا محمد نبی بخش حلوائی اور ان
کے خلیفہء مجاز مولانا باغ علی نسیم کی یاد میں ایک تقریب تھی، جس میں مفتی محمد خان
صاحب قادری، وزیر اوقاف و مذہبی امور آزاد کشمیر علامہ حامد رضا صاحب، مولانا محمد
منشاء تابش قصوری، مولانا محمد نعیم صاحب نوری، مولانا محمد صادق صاحب قادری نے
اظہار خیال فرمایا۔ اس دور کے آخر میں علامہ خوشتر نورانی نے ہندوستان میں علمائے
اہلسنت کی مسلکی خدمات پر روشنی ڈالی۔

''جام نور'' کا چوتھا دور جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو کے اساتذہ اور علماء کرام کی
محفل میں چلا۔ اس محفل میں جامعہ نعیمیہ کے سربراہ ڈاکٹر محمد سرفراز صاحب نعیمی نے
مہمان گرامی کا استقبال کیا اور ان کی آمد پر خوش آمدید کہا۔ مہمان گرامی علامہ خوشتر
نورانی نے ہندوستان کے سنی تدریسی اداروں کے کردار پر روشنی ڈالی اور جامعہ نعیمیہ کی
خوبصورت لائبریری کے لیے ''جام نور'' کی خوبصورت فائل پیش کی۔

جام نور کا پانچواں دور دار العلوم اسلامیہ میں چلا۔ جہاں شیخ الجامعہ مفتی محمد
خان صاحب قادری نے مہمان گرامی کو خوش آمدید کہا اور جامعہ اسلامیہ کی علمی اور تصنیفی
خدمات کا تعارف کرایا۔ علامہ خوشتر نورانی نے مفتی محمد خان قادری صاحب کے
تصانیفی کارناموں کو ہدیہء تحسین پیش کرتے ہوئے قلم کی اہمیت، کتاب کی افادیت
اور تحریر کے دور رس اثرات سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آپ نے دار العلوم

اسلامیہ کی تدریسی خدمات کو اہل سنت کے لیے نہایت مفید قرار دیا۔

''جام نور'' کا چھٹا دور علامہ محمد نعیم نوری صاحب کی کھجور والی مسجد، چوبرجی پارک میں چلا۔ چوبرجی پارک کے ان نمازیوں کو ہدیہء تبریک پیش کیا گیا۔ جو چند ہفتے پہلے حج و زیارت سے لوٹے تھے۔ اس مختصر سی محفل میں مولانا محمد خان قادری، مولانا محمد منشا تابش قصوری اور مہمانِ گرامی نے حجاج کو خوش آمدید کہا۔ مولانا محمد نعیم نوری صاحب نے حجاج کے استقبالیہ کی ایک عمدہ مثال پیش کر کے بڑا اہم کام کیا یہ روایت اب ناپید ہوتی جا رہی ہے۔

حضرت صاحبزادہ میاں سلیم حماد صاحب، سجادہ نشین درگاہ حضرت داتا گنج بخش نے ہندوستان سے آئے ہوئے مہمانانِ گرامی کے اعزاز میں ''کاشانہ ہجویری'' میں عصرانہ دیا۔ یہ ''جام نور'' کا ساتواں دور تھا۔ جس میں مہمانانِ عزیز کو حضرت داتا گنج بخش کے روحانی فیض سے آگاہ کیا گیا اور تبرکات سے تواضع کی گئی علامہ خوشتر نورانی کو ''ہجویری شیلڈ'' سے نوازا گیا۔ میاں سلیم حماد صاحب نے مہمان عزیز کو حضرت داتا ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی خدمات پر مشتمل اپنی کتابوں کا ایک سیٹ بھی بطور نذرانہ پیش کیا۔

''جام نور'' کا آٹھواں دور پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کی محفل میں رات گئے تک جاری رہا۔ اس محفل میں علامہ محمد نعیم نوری صاحب نگرانِ مہمان نوازی تھے۔ آپ نے اپنے ادارہ خضری سسٹم آف ایجوکیشن کا بھرپور تعارف کرایا اور مہمانِ عزیز کو ہر طرح کا آرام پہنچایا۔

ماہنامہ ''جام نور'' کے یہ چھلکتے ہوئے جام رات گئے تک پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کے کاشانہ میں گردش کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ فاروقی نے ''پیر

مغاں'' کا کردار کیا اور فاضل نوجوان محمد نعیم نوری نے ''ساقی'' کے فرائض سرانجام دیے۔ آدھی رات تک اہل ذوق جام پہ جام لنڈھاتے رہے اور ''جام نور'' کے ایڈیٹر کو ہدیہء تحسین پیش کرتے رہے۔ آدھی رات گزری تو خوشتر نورانی صاحب کے ایک لاہوری دوست محفل میں وارد ہوئے اور محفل کے رنگ میں اضافہ کیا۔

یہ کہہ کے آدھی رات در میکدہ کھلا
مانگی ہے اک بزرگ تہجد گزار نے

(''جہانِ رضا'' لاہور ماہ مارچ ۲۰۰۵ء)

علامہ خوشترنورانی چیف ایڈیٹر جام نور دہلی جہانِ رضا کے دفتر میں

ایڈیٹر جہانِ رضا پیرزادہ اقبال احمد فاروقی سے ایک انٹرویو ایک تعارف

آج یکم مارچ 2005ء کو میں لاہور پاکستان میں اہل سنت کے عظیم الشان اشاعتی ادارہ مرکزی مجلس رضا کے آفس میں کرم فرمائے اہل سنت حضرت مولانا پیر زادہ اقبال احمد فاروقی صاحب سے اپنے قارئین کیلیے انٹرویو لے رہا ہوں۔ موصوف کی شخصیت افکار رضا کی اشاعت کے حوالے سے ہندو پاک میں تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی ولادت پاکستان کے ضلع گجرات کے ایک پسماندہ گاؤں میں 1928ء میں ہوئی۔ مڈل تک اپنے علاقے میں ہی تعلیم حاصل کی اور پھر لاہور تشریف لے آئے، دینی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور دلچسپی بڑھی تو تفسیر نبوی کے مؤلف حضرت علامہ محمد نبی بخش حلوائی کے زیر سایہ درس نظامی کی منتہی کتابوں پر عبور حاصل کرلیا، کچھ عرصے کیلیے ریاست بہاولپور چلے گئے جہاں ''جامعہ عباسیہ'' سے ''علامہ'' کی منفرد ڈگری حاصل کی، پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا اور لاء کالج سے قانون کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد گورنمنٹ کی ملازمت میں آگئے اور ترقی کرتے ہوئے اپنے محکمہ کے انیس گریڈ کے آفیسر بن گئے اور ساٹھ سال کی عمر میں ریٹائر ہوگئے۔ ملازمت کے دوران آپ نے اپنی مذہبی اور علمی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ممتاز علمائے اہل سنت کے رابطے میں رہے اور 1960ء میں تصنیف وتالیف اور ترجمے کی طرف متوجہ ہوئے اور اہل سنت کی کتابوں کی اشاعت کیلیے ''مکتبہ نبویہ'' قائم کیا، بہت سی کتابیں تصنیف وتالیف کیں نیز کئی ضخیم کتابوں کے اردو میں ترجمے بھی

کیے جن میں ''معارج النبوۃ'' تین جلدوں میں، قصر عارفاں'' اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ''تکمیل الایمان'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اپنے استاذ گرامی کی تفسیر نبوی کا بھی اپنے رفقاء کی مدد سے ۱۵ جلدوں کا ترجمہ اردو میں کیا۔ آپ مرکزی مجلس رضا لاہور کے بانی رکن بھی ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کے دور میں مجلس رضا ٹوٹ گئی تھی تو آپ نے ہی آگے بڑھ کر اس کو سنبھالا اور مرکزی مجلس رضا کے پلیٹ فارم سے افکار رضا پر مشتمل تقریباً پانچ لاکھ کتابیں شائع کر کے عوام وخواص کے درمیان مفت تقسیم کیں۔ نیز 1991ء میں ''ماہنامہ جہانِ رضا'' کا اجراء کیا جو مسلسل کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے قارئین ''جام نور'' کیلیے موصوف سے لیا ہوا انٹرویو حاضر ہے۔

سوال: آپ کی سرپرستی میں مرکزی مجلس رضا لاہور، رضویات کی اشاعت میں غیر معمولی اسپرٹ کے ساتھ مصروف ہے، کیا آپ بتائیں گے کہ اس کی موجودہ سرگرمیاں کیا ہیں؟

جواب: سب سے پہلے تو میں آپ کا ذاتی طور پر ممنون ہوں کہ آپ مرکزی مجلس رضا لاہور کی کارکردگی اور اس پر میری خدمات سننا چاہتے ہیں، اس تعلق سے کچھ گفتگو کرنے سے قبل میں اپنی اور علمائے لاہور پاکستان کی جانب سے آپ کی یہاں آمد پر پُرجوش خیر مقدم کرتا ہوں۔ ۱۹۶۸ء میں محسن اہل سنت حضرت حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب نے رضویات کے فروغ کیلیے یہاں لاہور میں مرکزی مجلس رضا کی بنیاد رکھی اور ایک چھوٹی سی کمیٹی قائم کی جس کے تعاون سے وہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی رضی اللہ عنہ کے افکار اور ان کی کتابوں کی اشاعت کرنے لگے۔ انہوں نے

۲۰ رسال کے عرصے میں اسی لاکھ کتابیں شائع کر کے عالم اسلام اور پڑھے لکھے طبقوں میں پھیلا دیں، یہ وہ دور تھا جب امام احمد رضا کے نظریات اور ان کی کتابوں سے بہت کم لوگ واقف تھے لیکن انہوں نے شب و روز محنت کر کے گھر گھر میں فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کے افکار پہنچانے شروع کیے۔ پہلے پہل تو یہ مجلس اعلیٰ حضرت کی فقہی اور اعتقادی کتابوں کو ہی شائع کر کے مفت تقسیم کرتی رہی مگر اس کے بعد پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب مظہری ان کی زندگی کے دیگر گوشوں کو سامنے لائے تو حکیم صاحب نے دیگر حلقوں میں بھی اعلیٰ حضرت کی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور پھر لوگ جوق در جوق اہل سنت کے نظریات کے حامی ہوتے چلے گئے۔ آپ نے غالباً یہ بھی سوال کیا ہے کہ ''مرکزی مجلس رضا'' کے پلیٹ فارم سے اعلیٰ حضرت کے افکار کو فروغ دینے پر میری کیا خدمات ہیں۔

ایڈیٹر: نہیں، میں نے مجلس کی موجودہ سرگرمیوں کے تعلق سے سوال کیا ہے؟

فاروقی صاحب: اچھا اس سلسلے میں میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ حکیم صاحب کے مرکزی مجلس رضا سے دستبردار ہونے کے بعد میں نے مرکزی مجلس رضا کی باگ ڈور سنبھالی اور اس کے بعد افکار رضا پر مشتمل تقریباً پانچ لاکھ کتابیں شائع کر کے مفت تقسیم کیں، ایک وقت آیا میں نے سوچا کہ اعلیٰ حضرت کے افکار کو صرف کتابوں کے ذریعے ہی نہیں بلکہ میگزین کی صورت میں بھی ہر ماہ شائع کر کے پھیلانا چاہیے، جس کے نتیجے میں میں نے ۱۹۹۱ء میں ماہنامہ 'جہانِ رضا'' کا آغاز کیا اور اس میں مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہونے لگے۔

سوال:۔ آپ کے سامنے مرکزی مجلس رضا کے مستقبل کے منصوبے اور مقاصد

ہوں تو ذرا تفصیل سے بیان کیجیے؟

جواب:۔ میرے سامنے اس وقت کئی منصوبے ہیں، مگر میں اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے ان منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں بہت زیادہ تگ و دو نہیں کر پا رہا، ہاں! مرکزی مجلس رضا کے قیام اور اس کی تحریک کی وجہ سے الحمدللہ اب پاکستان میں کئی ادارے، بزمیں اور مکتبے قائم ہو چکے ہیں جو افکار رضا کے فروغ میں کوشاں ہیں، میری نظر میں بھی اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کا جو صحیح علمی اور فقہی مقام ہے وہ صحیح طور پر متعین نہیں ہو سکا ہے اس کیلیے مزید محنت کی ضرورت ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ پاکستان میں ایک رضا کمپلیکس بنایا جائے ایک ''رضا لائبریری'' قائم ہو جس میں ہر کتاب جو اعلیٰ حضرت کے فکر کو اجاگر کرتی ہو رکھی جائے ایک عالمی نیٹ ورک قائم کیا جائے جو ساری دنیا کی راہنمائی کرے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں ''مراکز رضا'' قائم کیے جائیں مگر حالات کی ناہمواری نے مجھے یہ کام نہ کرنے دیا۔

سوال:۔ ''جہانِ رضا'' مجلس رضا کا ترجمان ہے، لیکن عام رائے یہی ہے کہ جس طرح یہ مجلس علمی ہے اس طرح اس کا ترجمان علمی انداز میں شائع نہیں ہوتا ہے، اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گے؟

جواب:۔ نہیں یہ ایک علمی رسالہ ہے مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ ''جہانِ رضا'' کے قارئین عموماً بہت زیادہ پڑھے لکھے اور دقیق عبارات نہیں پڑھ سکتے جو افکار رضا پر مشتمل ادق مضامین کو پڑھ کر مستفید ہو سکیں، جس کیلیے میں نے اسے عوامی سطح پر لا رکھا ہے تاکہ وہ علمی گہرائیوں میں نہ کھو جائیں بلکہ سیدھے سادے انداز میں اہل سنت

کے نظریات کو سمجھیں، الحمدللہ میں اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں اور لوگ اس کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ایڈیٹر:۔ یہ تو ایک درمیانی طبقے کیلیے ہو گیا، مگر کیا آپ محسوس نہیں کرتے ہیں کہ دانشوروں اور پڑھے لکھے طبقوں کیلیے بھی کوئی خالص علمی رسالہ ہونا چاہیے؟ تا کہ افکار رضا کی علمی ترجمانی ہو سکے؟

فاروقی صاحب: جی ہاں! یہ ضرورت تو محسوس ہوتی ہے، مگر اس سے پہلے میری نظر میں یہ زیادہ ضروری ہے کہ درمیانی طبقوں میں تبلیغ کی جائے، یہ تو جانے دیجیے کچھ لوگ تو مجھے یہ بھی مشورہ دیتے ہیں کہ جہان رضا کو مزید سہل کیا جائے اور بالکل پرائمری سطح پر لایا جائے، مگر میں اس کو مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ یہ معیار اعلیٰ حضرت کے علمی مقام کیلیے بہتر نہیں ہے۔

سوال:۔ ہندو پاک کے کئی ایک ادارے رضویات کی اشاعت میں مصروف ہیں، مگر کیا آپ کو نہیں لگتا کہ فاضل بریلوی کی ہمہ جہت شخصیت کے کئی ایک پہلو مثلاً ان کا سائنسی مقام اور سیاسی تدبر وغیرہ اب بھی تشنہ کام ہیں، آپ کی نظر میں رضویات کے وہ کون سے ابواب ہیں جن پر اس وقت کام کرنا نہایت ضروری ہے؟

جواب:۔ یہ آپ نے بہت اچھا سوال کیا، اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل سے بتاتا کہ اس وقت پاک و ہند میں کون کون سے ادارے یا افراد کام کر رہے ہیں، ہمارے یہاں اعلیٰ حضرت پر بے شمار لوگ اس وقت کام کر رہے ہیں مگر وہ سب کے سب انفرادی طور پر ہی کر رہے ہیں، ہمارے یہاں اجتماعی طور پر ابھی کام کرنے کا رجحان پیدا نہیں ہوا ہے، اگر ہم متحد ہو کر منصوبے اور مقاصد کے تحت کام کریں اور موضوعات

کو بانٹ لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ رضویات کے ہر گوشے پر اطمینان بخش کام ہو سکتا ہے۔

سوال:۔ اچھا یہ بتایئے کہ رضویات کے تشنہ ابواب پر کام کرنے کے لیے اس دور میں کون کون سے طریقے ہو سکتے ہیں؟

جواب:۔ میں نے تو اب تک تحریری طریقے کو ہی اپنایا، دوسرے ذرائع کو نہیں اپنا سکا، کیونکہ کسی بھی نظریہ کے فروغ کیلیے تحریر ہی کو سب سے مضبوط ذریعہ مانتا ہوں، ہاں آج بہت سے ذرائع اور طریقہ کار افکار رضا کے سامنے ہیں جن کو اپنانے کے لیے مختلف بزمیں اور انجمنیں کام کریں تو اچھا ہوگا تا کہ اعلیٰ حضرت کا صحیح علمی اور فقہی مقام متعین ہو سکے، ابھی تو ہم ابتدائی دور سے ہی گزر رہے ہیں۔ افکار رضا کی ترویج کیلیے ابھی بہت سے کام کرنے باقی ہیں، اب فتاویٰ رضویہ کو ہی لے لیں، اس پر اب تک Systematical کام نہیں ہو سکا ہے اس سے اٹھا کر مسائل بیان کر دینا ایک الگ چیز ہے، مگر ارباب علم وفن کے سامنے اس کو احسن طریقے سے پیش کرنا ایک اہم کام ہے۔ اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری کو ہی لے لیں تو اس کے بھی ابھی فنی، علمی اور ادبی محاسن پر بہت زیادہ نہیں لکھا گیا ہے۔ ''نعت رنگ کراچی'' نے ارباب ادب کے تعاون سے اس کے مختلف گوشوں پر کام کیا ہے اور اب اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری پر وہ ایک منفرد اور ضخیم نمبر بھی نکال رہے ہیں جو نہایت مستحسن قدم ہے، لیکن یہ اپنی نوعیت کا پہلا قدم ہے اس جہت میں مزید کام کی ضرورت ہے۔

ایڈیٹر: یعنی آپ یہ چاہ رہے ہیں کہ تحریری طور پر ہی زیادہ کام ہو؟

فاروقی صاحب:۔ جی ہاں! تحریری طور پر نظریات اور تحریک کے فروغ میں جو

استحکام آتا ہے وہ کسی اور میڈیا کے ذریعے نہیں ہوتا، جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ دوسرے مکاتب فکر موجودہ جدید ذرائع ابلاغ کو عالمی سطح پر استعمال کر کے اپنے گمراہ کن نظریات کو فروغ دے رہے ہیں تو میں بھی اعلیٰ حضرت کے پاکیزہ نظریات پر اسی انداز میں کام کروں، مگر افسوس میرے پاس ذرائع نہیں میں اپنے آپ کو اس کام کا متحمل نہیں پاتا، کیونکہ میرے وسائل ایسے نہیں ہیں کہ اس میدان کو اپناؤں۔

سوال:۔ فاضل بریلوی کی عبقری شخصیت کا جو بین الاقوامی سطح پر تعارف ہونا چاہیے تھا اس میں مرکزی مجلس رضا لاہور اور دوسرے ادارے کتنے کامیاب ہیں اور ابھی اس راہ کے کتنے مراحل طے کرنا باقی ہیں؟

جواب:۔ یہ ایک ایسا بحر بیکراں ہے جس کو عبور کرنے کیلیے جگر بھی چاہیے، وقت بھی اور حوصلہ وعزم بھی مگر اس کے باوجود میں کہنا چاہوں گا کہ جن لوگوں نے بھی اخلاص اور عزم کے ساتھ اس راہ میں کام کیا ہے، وہ بہت کامیاب ہیں ان کے نتائج مایوس کن نہیں ہیں بلکہ نہایت حوصلہ افزا ہیں۔ یہاں لاہور میں مرکزی مجلس رضا نے اس کی بنیاد رکھی ہے، جس کو دیکھتے ہوئے اب دوسرے حضرات نئے نئے اور مختلف زاویے سامنے لا رہے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔ آج ہی ہندوستان کے دور دراز علاقہ سے رضویات کے موضوعات پر چند کتابوں کا مجھے ایک بنڈل ملا ہے، جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ہم مرکزی مجلس رضا کی بنیادوں پر ہی کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں اس پر فخر کرتا ہوں کہ مجلس کا کام دوسروں کیلیے رہنمائی کا سبب بنا ہے۔

سوال:۔ آج ہند و پاک کے روابط کافی اچھے ہو رہے ہیں، ہر معاملے میں اشتراک

اور ایک دوسرے سے قربت بڑھتی جا رہی ہے، ایسے میں آپ کے نزدیک وہ کون سی تدبیر ہے یا کون سا نقطہ اجتماع ہے جس پر ہندوستان اور پاکستان کے سنی علماء جمع ہو کر اتحاد و اشتراک کے ساتھ فروغ رضویات کے کام کو آگے بڑھائیں؟

جواب: اب تک تو پاک و ہند کے درمیان اچھے روابط پیدا کرنے کیلیے سیاسی فلمی اور کھیلوں سے تعلق رکھنے والے افراد ہی پیش قدمی کر رہے ہیں، مذہبی سطح پر آپسی تال میل کیلیے ابھی ہم لوگوں نے کچھ نہیں کیا ہے، لیکن اگر فضا ہموار ہو گئی تو پاک و ہند کے علماء کو رضویات اور سنیت کے حوالے سے کام کرنے کیلیے یکجا ہونا پڑے گا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ پاکستان میں رضویات کے حوالے سے جتنا کام ہوا، اتنا ہندوستان میں نہیں ہو سکا، مگر اب وہاں بھی بیداری آ رہی ہے، بعض ادارے اور افراد اعلیٰ حضرت کے کاموں کو مختلف زاویوں سے سامنے لا رہے ہیں لیکن اگر ہم یکجا ہو گئے تو یقیناً ایک دوسرے سے بہت استفادہ کریں گے۔

سوال:۔ آپ نے ذاتی طور پر اب تک رضویات پر کون کون سے کام کیے ہیں، قارئین ''جام نور'' کے استفادہ کے لیے براہ کرم اسے بھی بیان کریں؟

جواب:۔ میری زندگی کا جو کچھ بھی حاصل ہے وہ مرکزی مجلس رضا کی شکل میں ہے یا پھر جہان رضا کے صفحات پر ہے، ان دونوں کاموں سے ہٹ کر میں خود کوئی بہت زیادہ کتابیں تصنیف نہ کر سکا اور نہ ترتیب دے سکا، مگر پھر بھی رضویات کے تعلق سے کوئی بھی انوکھا کام جواب تک نہیں ہو سکا وہ مجھے نظر آتا ہے تو میں اسے کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مثلاً پچھلے ۷۰ برسوں سے ''حیات اعلیٰ حضرت'' مکمل نہیں چھپ سکی تھی جبکہ چند علمائے ہندوستان کے مابین اس نایاب کتاب کا مسودہ پچھلے

۳۰ برسوں سے گھوم رہا تھا، میں نے الحمدللہ اسے بڑھ کر مرتب کیا، عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق میں نے اسے سجایا اور اسے شائع کر کے دنیائے سنیت کے سامنے پیش کیا، میں اس پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے ایک عظیم کام کرنے کا موقع ملا جو مدتوں سے گوشہ گمنامی میں پڑا ہوا تھا اب الحمدللہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اسی کتاب کو ہندوستان کے علماء نے بھی ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ جس کا انداز اور ترتیب بالکل مجھ سے مختلف بھی ہے اور ایک جلد کم بھی ہے مگر میری ترتیب دی ہوئی ''حیات اعلیٰ حضرت'' معیاری بھی ہے اور مکمل بھی۔

ایڈیٹر: غالباً آپ نے ہندوستان میں مفتی مطیع الرحمٰن مضطر صاحب کی ترتیب دی ہوئی ''حیات اعلیٰ حضرت'' بھی پڑھی ہوگی، اب آپ بلا تکلف نہایت ایمانداری کے ساتھ یہ بتائیں کہ کون سی ترتیب زیادہ اچھی اور موثر ہے؟ آپ کی مرتب کردہ یا ہندوستانی ایڈیشن؟

فاروقی صاحب:۔ ایک بات میں آپ کو بتادوں کہ جس وقت میں اپنی کتاب ترتیب دے رہا تھا تو اس وقت ہندوستانی ایڈیشن میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ میری کتاب شائع ہونے کے بعد میں نے ہندوستانی ایڈیشن دیکھا ہے، اس لیے اب میں یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میری کاوش ان بزرگوں سے بہت بہتر ہے جنہوں نے ہندوستان میں اسے ترتیب دی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک جلد بھی کم چھاپی ہے وہ مکمل نہیں ہے یہ تاثرات آپ ''حیات اعلیٰ حضرت'' کے قارئین سے بھی لے سکتے ہیں۔

ایڈیٹر:۔ لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے بھی ایک جلد کم چھاپی ہے؟

فاروقی صاحب:۔ الحمدللہ ایسا نہیں ہے، آپ میری کتاب ملاحظہ فرمائیں، ہم نے تین حصوں کو مکمل ایک جلد میں کر دیا ہے مگر کوئی چیز چھوڑی نہیں ہے۔ انڈیا ایڈیشن نے ایک حصہ نہیں شائع کیا، اب ایسا انہوں نے کیوں کیا؟ مجھے نہیں معلوم، انہیں وہ حصہ نہیں ملا یا پھر دیدہ ودانستہ ایسا کیا گیا ہے۔ لیکن محسوس تو یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ہی اپنے ملک کے سیاسی حالات کی وجہ سے ایسا کیا ہے، کیونکہ اس میں تحریک ترک موالات ہندو نواز کانگریسی علماء وغیرہ کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت نے ہندوؤں کو خوب لتاڑا ہے اور اس میں قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال کی طرح فطرتی طور پر دو قومی نظریہ پیش کیا ہے اگر وہ اس کو شائع کر دیتے تو ممکن ہے انہیں ہندوستان میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

ایڈیٹر:۔ نہیں میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے، میں وہاں کے سیاسی حالات سے واقف ہوں، میرا خیال ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے؟

فاروقی صاحب:۔ ہو سکتا ہے کہ ان کو وہ جلد نہ ملی ہو لیکن مجھے ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو صاحب نے بتایا تھا کہ ''حیات اعلیٰ حضرت'' کا سارا مسودہ مولانا محمد احمد قادری رفاقتی صاحب لے گئے تھے، اب ان سے یہ مسودہ گم ہو گیا یا انہوں نے دیدہ ودانستہ ایک حصہ الگ کر دیا مجھے نہیں معلوم۔ البتہ کتابیات پر جو کتاب مرتب ہوئی ہے وہ میں نے مرتبین کے شکریے کے ساتھ پاکستان میں شائع کر دی ہے۔

سوال:۔ رضویات کے فروغ میں کتابوں کے علاوہ اخبارات و رسائل کا کیا کردار رہا ہے اور خاص طور پر اس وقت رسائل کے کیا فوائد سامنے آرہے ہیں؟

جواب:۔ میں سمجھتا ہوں رضویات کے حوالے سے پاکستان میں مختلف اداروں اور

انجمنوں کے ذریعے تقریباً ہزاروں رسائل وجرائد منظر عام پر آئے ہیں جنہوں نے علمی اور عوامی دونوں طبقوں میں ہی سنیت کی فضا ہموار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیے اور یہ بڑی بات ہے۔ مرکزی مجلس رضا کے رسائل وجرائد کا سنیت کیلیے فضا سازگار کرنے کا ہی یہ اثر ہے کہ کل تک کنزالایمان ترجمہ قرآن کو شائع کرنے کیلیے کوئی تیار نہیں تھا۔ ہم وفد لے کر تاج کمپنی والوں کے پاس جاتے تھے کہ اسے آپ شائع کریں، مگر وہ تیار نہیں ہوتے تھے کہ اسے کون خریدے گا؟ الحمدللہ! آج چار سو ناشران صرف پاکستان کے اندر ''کنزالایمان'' شائع کررہے ہیں جن میں سنی، دیوبندی، جماعت اسلامی اور اہل حدیث بھی طبقے شامل ہیں۔

سوال:۔ ماہنامہ ''جام نور'' اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

جواب:۔ ماہنامہ ''جام نور'' نے پچھلے دو سالوں میں بڑی تیزی کے ساتھ پاک وہند کے پڑھے لکھے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے، میں بھی اس کا مستقل قاری ہوں، مجھے اس میں بڑے ہی اچھوتے اور علمی مضامین ملتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ رسالہ پرانی لکیریں نہیں پیٹ رہا ہے بلکہ جدید طرز پر جماعتی وملی مسائل کو حل کرنے کیلیے نہایت جدوجہد کررہا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ہمارے قارئین اس طور پر بھی لگائیں گے کہ میں یہاں لاہور میں جام نور کی سوسو کاپیاں منگواتا ہوں اور چند دنوں میں ہی لوگ لے جاتے ہیں اور مطالعہ کے بعد مجھ سے اور دیگر مجلسوں میں اس کے دلچسپ مضامین، مباحث اور خاص طور پر اداریوں پر ہدیۂ تحسین پیش کرتے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ آپ (ایڈیٹر) کے پاس لوگ اپنے تاثرات روانہ کرتے ہیں کہ نہیں لیکن یہاں مجھ سے تحریری، زبانی اور فون پر بے پناہ خوشی کا اظہار

کرتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ آج معاشرے میں اعتقادی اور فکری بے راہ روی کا جو دور ہے اس کی اصلاح کیلیے ''جام نور'' یونہی کامیابی کے ساتھ ملت کا ترجمان بن کر شائع ہوتا رہے میں آپ کی خدمات کو بھی ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں کیونکہ آپ نے جماعت اہل سنت کو ایک نئی جہت اور فکر دی ہے۔ پھر آپ کی پاکستان آمد پر ''جام نور'' کا حلقہ وسیع تر ہوگا۔

(۱۔ ماہ نامہ ''جہانِ رضا'' مارچ ۲۰۰۵ء ۲۔ ''جام نور دہلی''۔ اپریل ۲۰۰۵ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محبت کے چیدہ چیدہ پھول

(۱) محمد عالم مختارِ حق ایک دانشور ایک علمی شخصیت اور کتاب دوست سکالر ہیں۔ وہ ہمارے مخلص دوست ہیں۔ چالیس سال سے ان کا معمول رہا ہے جسے اب تک نبھائے جا رہے ہیں۔ ہفتہ کی صبح گھر سے نکلتے ہیں۔ علمی احباب سے ملنا، علمی شخصیات سے ملاقات کرنا، نادر و نایاب کتابوں کی تلاش میں کتب فروشوں کے پاس جانا خصوصاً حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم کے دواخانہ میں حاضری دینا، اپنے احباب کی یادوں کو تازہ کرنا، پھر ہمارے پاس آکر علمی راہنمائی کرنا، اہل علم و کتاب کے متعلق گفتگو کرنا ان کے ہفت روزہ مشاغل میں شامل ہے۔ وہ ہمارے پاس آئے۔ کتابوں کا ایک تھیلا اٹھا کر لائے۔ پوچھا تو فرمانے لگے ''یہ خیابان علم کے کتابی پھول ہیں'' ہاتھ بڑھایا تو اپنی تازہ تصنیف ''نذر شمس'' کی بارہ جلدیں لے آئے۔ فرمانے لگے۔

؎ کہ من سی پارۂ دل می فروشم!

(۲) علامہ عبدالحق ظفر چشتی اپنے دوست ہیں۔ عالم ہیں۔ فاضل ہیں۔ ادیب ہیں۔ خطیب ہیں۔ ساری زندگی درس و تدریس میں گذاری۔ علی الصبح موبائل پر ان کی آواز گونجی۔ فرمانے لگے حضرت! میں داتا گنج بخش کے مزار کی دہلیز پر بیٹھا ہوں۔ آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ عرض کیا چلے آیئے۔ نورانی چہرہ لیے غریب کدہ پر آپہنچے۔ سورج سوا نیزے پر آیا تو فرمانے لگے۔ چلو آج ''ٹوپیوں والی سرکار'' کے پاس چلیں۔ ٹوپیوں والی سرکار مغل شہنشاہ شاہجہان کے بیٹے دارا شکوہ کے محلّہ لاہور

کے ایک حجرہ میں رہتے ہیں۔ جس طرف نگاہ اٹھی ٹوپی ہی نظر آئی۔ فرمانے لگے کس جانور کی کھال کی ٹوپی چاہیے۔ عرض کی ''حضور عقاب کا چمڑا ہو، شاہین کا پر ہو اور باز کے پر کی کلغی ہو'' نظر اٹھائی۔ فرمانے لگے ''پہلے آپ بال جبریل پڑھ کر آئیں''۔ علامہ ظفر چشتی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ بکرے، چھترے، دنبے، ہرن، لومڑی، شیر، چیتے بلگڑ بگڑ کے چمڑوں کی ٹوپیاں موجود ہیں۔ ''روسی قراقلی'' کا جواب نہیں۔ یہ ہے جناح کیپ۔ یہ ہے ترکی۔ یہ ہے سندھی۔ یہ ہے لاہوری۔ یہ ہے ایرانی۔ یہ ہے افغانی۔

''بنہ بر سر برو ہر جا کہ خواہی!''

(۳) راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو! ہمارے دوست علامہ کوکب نورانی ساری رات نہیں سوتے، ہم سوتے ہیں۔ مگر کروٹیں بدل بدل کر رات گذارتے ہیں جیسے شب ہجراں والے رات کاٹتے ہیں:

کسی کی شب ہجر روتے کٹے ہے — کسی کی شب وصل سوتے کٹے ہے
ہماری بھی شب کیسی شب ہے الٰہی — نہ سوتے کٹے ہے نہ روتے کٹے ہے

رات کے تین بجے آنکھ کھلی تو کوکب نورانی کو فون کیا ان کی تر و تازہ آواز سنائی دی۔ پھر تو ہم نے آدھ گھنٹہ تک ان سے گفتگو کی نہ ڈر نہ خطرہ۔ نہ تکلف نہ تردّد۔ ملکی حالات، مسلکی ناہمواریاں، علماء اہل سنت کے اختلافات، اپنوں کی باتیں، بیگانوں کے افسانے، عالم اسلام کی حالت، یہود و نصاریٰ کی مکاریاں، گستاخانِ رسول کا کردار.......... اور لائن کٹ گئی!

(۴) خدا رحمت کند بر عاشقان پاک طینت را: حافظ عنایت اللہ مجدّدی طالب علمی سے اپنے دوست ہیں۔ معلّم ہیں۔ عالم ہیں۔ واعظ ہیں۔ خطیب ہیں۔ اب

آہستہ آہستہ ولی اللہ بن گئے ہیں۔مگر ہر حالت میں ہمارے دل کے قریب رہے ہیں۔درود پاک پر ان کی خوبصورت کتاب "تحفۃ الصلوٰۃ الی النبی المختار" چھپی تو خود لے کر آئے۔تحفۃً عنایت فرمائی۔فرمانے لگے یہ کتاب ہر عالم دین اور درود پاک سے محبت کرنے والے اور بارگاہِ رسالت میں درود پڑھنے والے کے لیے محبت کا نذرانہ ہے اور ان کے لیے مفت ہے۔ہمارے پاس جو آئے گا لے جائے گا۔

(۵) سابق وزیر اعلیٰ محمد حنیف رامے مرحوم کے برادرزاد عبدالرحمٰن رامے تشریف لائے۔"شرح درود تاج" کا نفیس تحفہ عطا فرما کر چلے گئے۔یہ تحفہ ادیب رائے پوری مرحوم کی کاوش ہے۔ایک ہزار صفحات آرٹ پیپر، طباعت تین رنگوں میں مزیّن نفیس خوبصورت جلد۔دل خوش ہو گیا۔

(۶) جناب عبدالعزیز خاں قادری "حزب قادریہ" کے ناظم اعلیٰ ہیں۔کئی کتابیں چھپوا کر اہل محبت میں تقسیم کر چکے ہیں۔قطب مدینہ مولانا ضیاء الدین مدنی رحمۃ اللہ علیہ پر دو جلدوں میں مبسوط کتاب اہل محبت میں تقسیم کرتے رہے ہیں۔جب ہم نے حضور کی بارگاہ میں حاضری دینی ہوتی ہے تو ہمیں دیارِ حبیب تک پہنچاتے ہیں۔سیدنا غوث اعظم کے معمولات کا خوبصورت تحفہ درود شریف "البشائر الخیرات" کی کئی جلدیں لے کر آئے اور ہمارے احباب کو خوش کرتے گئے۔ان کا یہ تحفہ ہمارے لیے ویزا ہے۔جو براستہ بغداد، مدینہ تک پہنچائے گا۔

(۷) رات سونے کی تیاریاں شروع ہوئیں تو موبائل کی سریلی آواز آئی۔"میں پیر سید حسن شاہ نوری الگیلانی سرکار دو عالم کے گنبد خضرا کے سامنے کھڑا آپ کو یاد کر رہا ہوں۔آپ کا سلام پیش کر چکا ہوں۔دعا کے لیے ہاتھ اٹھے ہیں آپ کی یاد آئی

ہے۔"دل و جاں وجد کناں جھک گئے بہرِ تعظیم!"

(۸) علامہ شبیر احمد ہاشمی اپنے پرانے یار ہیں۔ہماری تقریر، ہماری تحریر کو پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ خود پسندیدہ قلم اور زباں کے مالک ہیں۔قائد اہلسنت مولانا الشاہ احمد نورانی کے رفیق سیاست رہے ہیں۔ساری زندگی ان کی رفاقت میں گذار دی۔خطیب ہیں۔ادیب ہیں۔شاعر ہیں۔ناقد ہیں۔پچھلے سال حقوق نسواں بل نافذ ہوا تو وقت کے حکمرانوں کو للکارنے لگے۔صدر مملکت اور وزیر اعظم کو نشانہء تنقید بنایا۔پکڑے گئے۔ایک سال پانچ ماہ جیل میں رہے۔رہا ہوئے تو ڈاکٹر سرفراز نعیمی نے اپنے دار العلوم نعیمیہ میں استقبالیہ دیا۔ڈاکٹر سرفراز نعیمی کا جیل میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔وہ قیدیوں سے محبت کرتے ہیں۔ہاشمی صاحب نے علماء اہلسنت کو قید و بند کی دعوت دی اور جیل کی "خوشگوار زندگی" کے واقعات سنائے۔اور مولانا روم کی مثنوی سے ایک بچے کی زباں سے بتا رہے تھے، جسے آگ میں ڈالا گیا ہے۔تو کہہ رہا تھا!

"اندر آ مادر کہ من این جا خوشم!"

(۹) صاحبزادہ پیر محمد احمد ہاشمی صاحب درگاہ تو کلیہ محمدیہ صدیقیہ سیدا شریف گجرات کے سجادہ نشین ہیں۔ہماری کتاب "رجال الغیب" دیکھی تو خود ملنے آ گئے۔اور اپنے پیر و مرشد کی کتابوں کے تحائف عطا فرماتے گئے۔ذکر خیر، خیر الخیر، [illegible] محبوب، اسلامی تصوف، نذر حسین، تنویر الابصار جیسی خوبصورت کتابیں عطا کر کے چلے گئے...... سرِ من فدائے راہت!

(۱۰) دونوں ہی آفتاب ہیں۔دونوں ہی ماہتاب۔مشرف کے برخورداروں کا تختہ الٹا تو کئی بُرج گرنے لگے۔آٹھ سو سے زائد افسران کرام بھی جنہیں بعد از

ریٹائرمنٹ خصوصی طور پر ڈٹے رہنے کا اعزاز حاصل تھا۔ تھرتھرا کر گر گئے۔ علامہ مقصود احمد چشتی خطیب جامع مسجد داتا گنج بخش لاہور بھی اس حکم کی زد میں آ گئے۔ وہ ہمارے دوست ہیں۔ عالم ہیں۔ فاضل ہیں۔ خطیب ہیں۔ لبیب ہیں۔ مختلف علمی مراحل طے کرتے کرتے جامع مسجد داتا گنج بخش لاہور کے محراب و منبر کی زینت بنے۔ بڑا مقام پایا۔ دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پذیرائی پائی۔ حضرت داتا کا تصرّف تھا یا ان کی علمی وجاہت، جہاں جہاں گئے، عزت پائی۔ ان کی جگہ محکمہء اوقاف پنجاب کے ایگزیکٹو آفیسر علامہ صاحبزادہ سلیم اللہ قادری اویسی صاحب ایم اے مسند خطابت پر جلوہ فرما ہوئے۔ وہ عالم ہیں۔ استاذ ہیں۔ ادیب ہیں۔ خطیب ہیں اور روحانی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کی علمی خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے۔ وہ علما اکیڈمی کے ڈائریکٹر رہے ہیں۔ ''معارف اولیاء'' کے مدیر رہے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ لاہور کے کئی مقامات پر درس قرآن دے رہے ہیں۔ امید ہے حضرت داتا گنج بخش کے علمی اور روحانی مرکز کو اپنی محنت سے دارالارشاد بنا دیں گے۔ ہم ان دونوں کے نیاز مند ہیں ہمارے لیے دونوں ہی آفتاب ہیں، دونوں ہی ماہتاب ہیں۔

(۱۱) حضرت مولانا محمد حنیف قادری رضوی کی علمی کتابیں ہندوستان کی سرحدوں کو عبور کر کے بریلی سے پاکستان کے اہل علم کو دعوت مطالعہ دینے لگی ہیں۔ سیرت مصطفیٰ ''جان رحمت'' کے علاوہ ان کے کئی علمی شاہکار ہیں۔ بریلی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ گلستان بریلی کے پھول چاروں طرف کھلتے رہے ہیں۔ ممبئی سے زبیر خاں قادری ''افکار رضا'' سے نوازتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد جابر شمس مصباحی اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے گلشن کی کلیاں بکھیرتے ہیں تو ہمیں ''از بوئے دلآویز تو مستم'' بنا

دیتے ہیں رضا اکیڈمی ممبئی کے سعید نوری تو مفتی اعظم کے باغ کے باغبان بن کر دنیائے رضویت کو باغ و بہار بنا دیتے ہیں۔ دہلی کے ''جام نور'' اور ''کنز الایمان''۔ علامہ خوشتر نورانی اور غلام یٰسین مصباحی کے قلمی پھول ہماری جھولی بھر دیتے ہیں۔ مبارک پور سے علامہ مبارک حسین مصباحی کا ''الاشرفیہ'' ہر ماہ گلِ تازہ بن کر آتا ہے۔

(۱۲) بریلی شریف کے ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی، شمع شبستان رضا کے پروانے ہیں۔ ان کی تحریریں اعلیٰ حضرت کے افکار و نظریات کو سارے جہاں میں پھیلاتی رہتی ہیں۔ جب وہ ڈاکٹریٹ کرنے لگے تو انہیں ''اردو نعت گوئی اور فاضل بریلوی'' کا موضوع ملا کامیاب ہوئے۔ تو اپنے تھیس کو کتابی شکل میں شائع کر دیا اور دنیائے رضویت کو رنگا رنگ پھولوں سے سجا دیا۔

(۱۳) فاضل بریلوی کی تاریخی کتاب ''الدولۃ المکیہ بالمادۃ الغیبیہ'' کا اردو ترجمہ کیا آیا۔ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کو ہر طرف سے ہدیہ تحسین آنے لگے۔ کراچی کے ایک رضوی سکالر محمد فرحان قادری رضوی نے ایک سو جلدیں خریدیں۔ علماء و طلبہ میں تقسیم کر کے اعلیٰ حضرت کی روح کو خوش کر دیا۔ بارگاہِ رضویت میں یہ نذرانہ ایک خوبصورت انداز سے پیش کیا گیا۔

(۱۴) ہم جنوبی افریقہ سے میمونہ صدیق صاحبہ کے ٹیلی فونک پیغام پر خوشی کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جنہوں نے بتایا کہ انہوں نے ہماری ''رجال الغیب'' کتاب پڑھی پھر کتاب میں لکھا ہوا وظیفہ پڑھا تو انہیں حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اس بات سے اتنی خوش تھیں کہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔

(۱۵) اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے! صاحبزادہ محمد معروف مجدّدی

پیر طریقت میاں جمیل احمد شرقپوری کے علمی سیکرٹری ہیں۔ فون کیا، بتایا کہ ڈاکٹر محمد مسعود احمد مظہری کا کراچی میں انتقال ہوگیا ہے۔ دل پر ایک تیر لگا۔ ہائے ہائے! آفتاب سنیت، ماہرِ رضویت، ترجمانِ افکارِ مجدد الف ثانی مرتب جہانِ امام ربانی، علم وتعلیم کا شہنشاہ اور ہزاروں عقیدت مندوں کی جائے پناہ، آج اس دنیائے فانی سے چلا گیا۔ نور اللہ مرقدہٗ میاں جمیل احمد شرقپوری تشریف لائے۔ اپنے مجددی دوست کی موت پر اظہارِ ملال کرتے رہے۔ ان کے علمی اور روحانی اوصاف بیان کرتے رہے۔ پھر ایصالِ ثواب کے لیے فاتحہ خوانی کی اور ہمیں شریکِ ثواب کیا۔ اس مجددی بزرگ کی رحلت پر میاں صاحب کو بڑا صدمہ ہوا۔ اشکِ رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

(۱۶) ''افکارِ رضا'' ممبئی کا خصوصی نمبر آ گیا۔ زبیر خان قادری ''تحریک فکرِ رضا ممبئی'' کے ناظمِ اعلیٰ ہیں۔ خصوصی نمبر نکالا۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے افکار کو دنیائے رضویت میں پھیلا دیا۔ پانچ سو صفحات کا ''افکارِ رضا'' کیا آیا۔ یوں محسوس ہوا کہ گلستان میں بہاریں آ گئیں!

(ماہنامہ ''جہانِ رضا'' اپریل، مئی ۲۰۰۸ء)

ہماری مجلس کی باتیں

ڈاکٹر محمد مسعود احمد مظہری کتنی جلدی ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ وہ ماہر رضویات تھے۔ انہوں نے مرکزی مجلس رضا لاہور سے اعلیٰ حضرت محدث بریلوی کی سیاسی زندگی کے شب و روز کو پیش کیا۔ معارف رضا کراچی کو اعلیٰ حضرت کے علمی اور فقہی مقالات سے مزین کیا۔ ''جہانِ امام ربانی'' سے جہان مجدد الف ثانی کو گلہائے رنگارنگ سے مہکا دیا۔ ابھی وہ سیرت پاک کا آغاز کرنے والے تھے کہ پیغام وصل پر لبیک کہتے ہوئے ہمیں چھوڑ گئے۔

سید محمد حسن شاہ نوری الگیلانی ہمارے کرم فرما ہیں۔ ہماری مجالس کا حسن ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی کتابوں کے ناشر ہیں۔ نوری کتب خانہ سے محدث بریلوی کی سیکڑوں کتابیں شائع کیں۔ وہ سادہ چک گجرات کے سجادہ نشین ہیں۔ ان کے برادر گرامی پیر طریقت سید محمد حسین شاہ نوری الگیلانی طویل علالت کے بعد ۹۰ سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ آپ نے ایک سو سے زیادہ مساجد تعمیر کیں۔ مدرسے بنائے۔ دینی ادارے قائم کیے اور ہزاروں لوگوں کو راسخ العقیدہ بنایا۔ کہ مسلسل ۷۰ سال سے دیار حبیب کی حاضری دیتے اور اہل محبت کا قافلہ لے کر حاضری دیتے۔ آپ کی رحلت نے ہزاروں دلوں کو صدمہ سے دوچار کیا۔ لاکھوں آنکھوں کو اشک بار کیا۔

لاہور میں ایک دن میں سنیوں کے تین باوقار اجتماع

ایک اتوار کو علمائے اہلسنت نے اپنے کلام و بیان سے اہل لاہور کو خوش کر دیا۔ غزالی زمان کے تینوں نامور فرزند حضرت سید حامد رضا کاظمی ایم این اے، حضرت

علامہ مظہر کاظمی اور صاحبزادہ محمد ارشد کاظمی ایم اے قذافی اسٹیڈیم کے بالمقابل تاج محل شادی ہال میں جلوہ افروز ہوئے۔ ایک ہزار سے زائد سامعین وحاضرین کو اپنے افکار عالیہ سے نوازا۔ اسی دن ''ایوان اقبال'' لاہور میں جماعت اہلسنت کے امیر سید ریاض حسین شاہ صاحب اپنے علمی احباب کے ساتھ بھرپور اجتماع میں خطاب کر رہے تھے اور ہزاروں سامعین کو نواز رہے تھے۔ تیسرا اجتماع جامعہ نعیمیہ لاہور میں کونسل جرائد اہل سنت کا بڑا اجتماع ہوا۔ سارے پنجاب بلکہ سارے پاکستان سے چیدہ چیدہ جرائد کے مدیران گرامی نے اپنی تجاویز سے نوازا اور مستقبل کا لائحہ عمل تیار کیا۔

ہماری مجالس میں جہاں اہل علم وفضل تشریف لا کر اپنی گفتگو سے خوش کام کر دیتے ہیں کبھی کبھی ایسی بے چین روحیں بھی چلی آتی ہیں جو اپنی باتوں سے ہمارے زخم جگر کو کریدتے رہتے ہیں۔ ان میں ایک مولوی معصوم ہیں۔ ہم اسے مولوی بھوڑی کہتے ہیں۔ نام معصوم باتیں نامعقول۔ ہماری مجلس میں آ گئے لوگ میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔ مگر آپ آتے ہی گرجے۔ ہم نے کہا مولوی بھوڑی اگر تو نہ آتا تو اچھا تھا، کہنے لگا میں خالی ہاتھ تو نہیں آیا آپ کے لیے تحفے لایا ہوں۔ یہ لو ایک عالم دین نے ''حضور نبی کریم ﷺ کو چالیس سال کی عمر تک نبی ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ کہتے ہیں وہ چالیس سال تک ولی اللہ تھے۔ لوگوں نے انہیں خواہ مخواہ حضرت آدم سے پہلے نبی قرار دے دیا''۔ ابھی ہم اس کی بات پر توجہ نہ دے سکے۔ تو ایک اور کتابچہ بغل سے نکال کر کہنے لگے لو ''شیخ الاسلام'' نے علی ولی اللہ خلیفۃ اللہ بلافصل کے بعد ''حضرت ابوبکر کو خلیفۃ الرسول بلافصل'' بنا دیا۔ ابھی ہم دیکھنے نہ پائے تھے کہ مولانا اقتدار گجراتی کا ایک کتابچہ بغل سے نکالا اور کہنے لگے ''گولڑے والی سرکار وہابی ہو گئی''۔ ابھی ہم اس

کا منہ دیکھ رہے تھے کہ مولوی بھوڑی نے ایک موٹی سی کتاب دکھائی اور کہنے لگا۔ اب تو سنی علماء بھی لَکَ کا معنی یہ کرنے لگے ہیں کہ ''آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے ہیں''۔ ابھی ہم مولوی بھوڑی کا منہ بند کرنے والے ہی تھے کہ وہ ہندوستان کے چند سنی رسالے نکال کر ہمیں مخاطب کر کے کہنے لگا۔ آپ ''اعلیٰ حضرت'' کے ''مسلک رضا'' ''فکر رضا'' ''تاجدار بریلی'' کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ دیکھو سنیوں نے ''اعلیٰ حضرت عظیم البرکت'' تاجدار بریلی، مسلک رضا، فکر رضا، کی ساری باتوں سے انکار کر دیا ہے۔ آپ علمائے اہلسنت کو انتشار پسند، بکھرے بکھرے، مارے مارے کہتے پھرتے ہیں۔ یہ کتابیں پڑھو غور کرو۔ دل میں آیا مولوی بھوڑی کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دیں۔ مگر چائے آ گئی اور مولوی بھوڑی نے ہاتھ بڑھا کر چائے کی پیالی اٹھائی ایک گھونٹ پیا تو تھو تھو کرنے لگا۔ چائے والا لڑکا غلطی سے پیالی میں چینی ڈالنے کی بجائے تیز نمک ڈال لایا تھا۔ مولوی بھوڑی اپنا تھیلا لے کر بھاگا اور کہنے لگا اب تو یہاں بھی کڑوی چائے ملنے لگی ہے۔ ایک دوسرے شخص نے ہمیں مخاطب کر کے کہا

کیسے کیسے لوگ تمہارے دل کو جلانے آ جاتے ہیں!

''رضا اکیڈمی ممبئی'' کے سربراہ سعید نوری صاحب اور ان کے رفیق قلم مولانا غلام مصطفیٰ رضوی مالی گاؤں ضلع ناسک انڈیا کو خدا خوش رکھے۔ ہمیں اداس پا کر ایک پارسل بھیج دیا جس میں یادگار رضا ۲۰۰۸ء ''رضا بک ریویو'' پٹنہ بہار ''کہی ان کہی'' از مولانا عبدالستار ہمدانی ''کلام رضا میں محاورات اور ضرب المثال'' از ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی بریلوی کے تحفے موجود تھے۔ عالمی معیار کا ''اعلیٰ حضرت نمبر'' بھی چھم چھم کرتا آ گیا۔

(ماہ نامہ ''جہانِ رضا'' جون، جولائی ۲۰۰۸ء)

اس شمع کو جلائے رکھیں

میں ''افکار رضا'' کا قاری ہوں۔ اسکا صفحہ صفحہ میرے سامنے کھلتا ہے تو دل وجان وجد کرنے لگتے ہیں۔ اسکے اداریے ''افکار رضا'' کی روشن تحریریں ہیں۔ بلند پایہ مضامین اور علمی مقالات مجھے دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔ مجھے افکار رضا کے ''رضانامے'' اور ''اداریے'' گلہائے رنگارنگ دکھائی دیتے ہیں۔ ''رضاناموں'' میں تنقید وتحسین کے نقش ونگار ''افکارِ رضا'' کا حسن دوبالا کرتے ہیں۔ یہ واحد جریدہ ہے جو سارے ہندوستان میں فکررضا کی ترجمانی کرتا ہے اور دنیائے رضویات کے اہل علم وفضل اسے نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

سابقہ چند ماہ سے ''افکار رضا'' کے مدیر محمد زبیر احمد قادری اس شمع کو گل کردینے کے اعلانات کررہے ہیں۔ جس سے دل بیٹھا جاتا ہے۔ وہ اپنے حالات، احباب کی بے اعتنائی، اہل قلم کی بے نیازی اور سب سے بڑھ کر اہلسنت کی ''مفت خوانی'' کا شکوہ کررہے ہیں اور افکار رضا کو بند کررہے ہیں۔ انہیں شاید معلوم نہیں کہ ''افکار رضا'' افکار رضا کا ترجمان ہے کاروانِ رضا کا ہدی خوان ہے۔ یہ خیابان رضا کا مہکتا ہوا پھول ہے۔ یہ شمع شبستان رضا ہے۔ یہ آسمان رضویت کا ماہتاب ہے۔ یہ جہان رضا کا آفتاب ہے۔ اسکے مدیر کو شاید ''افکار رضا'' کے مقام کا اندازہ نہیں ہے نہ اپنے مقام کا علم ہے!

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے   کچھ اس میں تکلف نہیں واللہ نہیں ہے

ایک زمانہ تھا۔ ممبئی میں ہمارے ایک دوست معین الدین احمد مالک اجمیری کتب خانہ،

پاکستانی مطبوعات منگوایا کرتے تھے۔ ہم ان کتابوں میں ''جہانِ رضا'' کے چند شمارے رکھ دیا کرتے تھے۔ محمد زبیر خاں قادری چلتے پھرتے ''جہانِ رضا'' اٹھاتے اور اوّل سے آخر تک پڑھتے اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے افکار کو دل کی گہرائیوں میں سمیٹتے۔ یہ مطالعہ، یہ محبت، یہ عشق انہیں کشاں کشاں بریلی کی گلیوں میں لے گیا۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے مزار پر لے گیا۔ اعلیٰ حضرت کی کتابوں کے ذخیروں میں لے گیا۔ افکار رضا کی وادیوں میں لے گیا۔ پھر گلستان رضا کے باغوں میں لے گیا اور انہوں نے اعلان کیا کہ تحریک فکر رضا ممبئی ''افکار رضا'' جاری کرے گی اور لوگوں کو آواز دے کر کہا کہ

''رضا کی زبان تمہارے لیے''   رضا کی فغاں تمہارے لیے

ممبئی سے ''افکارِ رضا'' دراصل ''جہان رضا لاہور'' کے باغوں کا ایک پھول بن کر نکلنے لگا۔ یہ مے خانہء جہانِ رضا کا مغ بچہ بن کر آیا اور سارے جہان رضا میں روشنیاں پھیلاتا آیا اور عاشقان رضا کو دعوت فکر دیتا ہوا آیا اور یوں محسوس ہوا کہ

رضویت کا چاند ابھرا نور برساتا ہوا

ہمیں فخر تھا کہ محمد زبیر قادری نے ''جہانِ رضا'' کا نقش جمیل ہندوستان میں جاری کیا ہے، افکار رضا کو دنیا کے گوشے گوشے تک پھیلانے لگا ہے اور اپنے خصوصی انداز میں اعلیٰ حضرت کی تعلیمات کو گھر گھر پہنچانے لگا ہے۔

زبیر قادری اپنے ''افکار رضا'' کے سلسلے میں کئی بار پاکستان آئے۔ کراچی آئے۔ لاہور آئے۔ جہان رضا کے دفتر میں آئے۔ فکر رضا کی اشاعت کے لیے پاکستان کے دور دراز علاقوں میں گئے۔ ہر باغ، ہر پھول، ہر کلی کو سونگھا اور شہد کی مکھی

کی طرح برصغیر میں پھیلے ہوئے ہزاروں پھولوں کا رس چوس کر ''افکار رضا'' کے چھتے میں وہ شہد تیار کیا جس میں بریلی کے پھولوں کی مٹھاس تھی اور فکر رضا کی شیرینی۔ آج دنیائے رضویت کے اہل علم وفضل جانتے ہیں کہ ''افکار رضا'' نے انہیں کیا کیا دیا۔ آج دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں بسنے والے اہل ذوق جانتے ہیں کہ ''افکار رضا'' نے کتنا عظیم کام کیا۔ آج مغرب ومشرق کے اہل محبت تسلیم کرتے ہیں کہ افکار رضا کی شہرت جانے کہاں کہاں پہنچی ہے۔ سارے ہندوستان میں جب اعلانات کی بات چلتی ہے تو افکار رضا کے صفحات کھلتے نظر آتے ہیں اور لوگ فکر رضا کی بات کرتے ہیں تو ان کی زبان پر بے اختیار یہ شعر آتا ہے:

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے   چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

گلشن رضا کا کاروبار تو ''افکار رضا'' کی اشاعت ہے اگر یہ بند ہو گیا تو گلہائے رضا میں رنگ کون بھرے گا؟ اور شہر بریلی کی بادِ نو بہار کس طرح چلے گی اور گلشن رضویت کا کاروبار کس طرح جاری رہے گا؟

مدیر ''افکار رضا'' کو شاید احساس نہیں کہ ان کا قلم کتنے پھول برساتا ہوا جہان رضویت کی وادیوں کو شاداب کرتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی افکار رضا کے صفحات محققین، مدققین، مصنفین، مطولین اور ناقدین کے مضامین سے بوجھل ہو جاتے ہیں۔ اگر انتخابِ مضامین کا خیال رکھا جائے تو ان شاء اللہ یہ شمع جلتی رہے گی۔ لوگ آگے آئیں گے اور فکر رضا کی روشنیاں پھیلتی رہیں گی۔

''افکار رضا'' کی کارکردگی کا اندازہ لگانے کے لیے اسکی فائل کی ورق گردانی کرنی چاہیے۔ جہاں صفحہ صفحہ پر موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ اہل علم وفضل نے

اعلیٰ حضرت فاضل بریلی کے علوم پر مختلف انداز سے روشنی ڈالی ہے اور افکار رضا ان علوم کو دنیائے گوشے گوشے تک پھیلاتا جا رہا ہے۔ ہندوستان کی سرحدوں سے نکل کر ''افکار رضا'' پاکستان کے تقریباً ہر شہر میں پہنچتا ہے۔ مختلف گوشوں میں بسنے والے علماء کرام کے دروازوں پر دستک دیتا ہے۔ جنہیں ''افکار رضا'' نہیں ملتا وہ اسکی تلاش میں نکلتے ہیں اور دامن طلب بچھاتے ہیں۔ ہندوستان میں چھپنے والے بے شمار جریدے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر شائع ہوتے ہیں۔ مگر جب فکر رضا کی تلاش ہوتی ہے، تو ہر شخص ''افکار رضا'' کا رخ کرتا ہے اور اسے کہنا پڑتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کی مجالس علمیہ کی خوشبو آرہی ہے تو وہ افکار رضا کے صفحات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ رسالہ ''حدائق بخشش'' پر تحقیقی مضامین شائع کرتا ہے۔ ہر واعظ شیریں بیان، اعلیٰ حضرت کے چند اشعار پڑھ کر محفل کو گرما لیتا ہے۔ ہر نعت خواں انعام واکرام حاصل کرنے کے لیے ''مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' سنا کر وقت گزار لیتا ہے۔ ہر شاعر اپنا رنگ جمانے کے لیے اعلیٰ حضرت کے کلام پر تضامین لکھ لیتا ہے۔ مگر جب فکر رضا کی بات چلتی ہے تو ''افکار رضا'' کے صفحات اپنے دامن بچھا دیتے ہیں۔ پاکستان میں جہانِ رضا (لاہور) اور ''معارف رضا'' (کراچی) بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم وفنون کو مختلف انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مرکزی مجلس رضا لاہور نے اعلیٰ حضرت کی تصانیف کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچایا ہے۔ مگر ہندوستان میں صرف ''افکار رضا'' ہی ایک ایسا جریدہ ہے جو اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شمع اٹھائے چار دانگ عالم میں روشنیاں پھیلا رہا ہے۔ بریلی شریف جو مرکز رضویت ہے، وہاں کے علماء ومشائخ جس انداز میں اعلیٰ حضرت پر کام کر رہے ہیں وہ

سب پر عیاں ہے۔ مگر ممبئی کا ایک ''افکار رضا'' شمع شبستان رضا بن کر اپنے پروانوں کو دعوت شوق دے رہا ہے۔ آج ''افکارِ رضا'' تمام رضویوں کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اے اعلیٰ حضرت کا نام لینے والو! آؤ! ''افکار رضا'' کی خدمات پر ایک نظر ڈالو اور سارے ہندوستان میں ایک ایسا جریدہ لاؤ جو ''افکار رضا'' کا ہم پلہ ہو۔

ہم ''افکار رضا'' کے مدیر شہیر سے درخواست کریں گے کہ وہ اس شمع کو بجھنے نہ دیں۔ اس شمع کو جاری وساری رکھیں۔ آج اپنوں کی بے اعتنائی ورضوی اہل قلم کی بے نیازی اور رضویوں کی مفت خوانی کی پروانہ کریں۔ ''قدم بڑھائیں ہم تمہارے ساتھ ہیں

اَلا لَاتحزن اَخی بلّیا فللرحمٰن الطافٌ خفیا

اے بلاؤں میں گھرے ہوئے زبیر بھائی ڈرو نہیں غم نہ کرو اللہ کے خزانوں سے غائبانہ الطاف آئیں گے۔

(ماہ نامہ ''جہانِ رضا'' دسمبر ۲۰۰۷ء)

عیسائی مبلغین اور علماء اسلام

برصغیر میں فرنگی اقتدار کے طلوع کے ساتھ ہی عیسائی مبلغین (مشنری) کی آمد کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط پر (۱۸۱۳ء) میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے ایک بل پاس کیا۔ جس کی رو سے انجمن ترقی علوم عیسائیت کے آرک بشپ کو اختیار دیا گیا کہ وہ پاک و ہند میں تبلیغ عیسائیت کے لیے اپنے مبلغین بھیجے۔ چنانچہ انگلینڈ کے پادریوں کی ایک جماعت ۱۸۱۴ء میں کلکتہ پہنچی اور اپنا کام شروع کردیا۔ برطانوی حکومت جوں جوں برصغیر کے وسیع علاقوں میں اپنا تسلط قائم کرتی گئی، عیسائی مبلغین کی کھیپ میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں انگلستان کے مشہور مبلغین نے برصغیر میں عیسائی تبلیغ کی بنیادیں رکھیں۔ جن میں ہنری مارٹن، کلاڈیس لوکاٹین، ڈاکٹر ڈف، مسٹر جن سن، پادری جوشامارش اور ولیم وارڈ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ اپنی علمی قابلیت میں شہرہ آفاق تھے اور اپنی تبلیغی قابلیت کی بناء پر سارے یورپ میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ابتدائے کار میں ان عیسائی علماء نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں اساتذہ اور تلامذہ کی حیثیت سے انجیل کے تراجم وتفاسیر کی اشاعت کا ایک شعبہ قائم کیا اور مشرقی زبانوں میں اپنے نظریات کی تبلیغ کرتے اور نہایت پرامن طریقہ سے عیسائی مذہب کی خوبیاں بیان کرتے۔ ان کے منادی کرنے والے بازاروں، چوراہوں اور میلوں کے اجتماعات میں چلے جاتے اور عوام کے سامنے عیسائیت کی تبلیغ کرتے۔ ۱۸۵۲ء میں ان عیسائی تبلیغی اداروں نے ملک میں ۱۳۴۶ سکول قائم کرلیے جن میں ۴۲۷۵۰ عیسائی

لڑکے اور لڑکیاں پاک و ہند کی علاقائی زبانوں سے واقف ہو کر عیسائی تبلیغ کے لیے تیار ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۱۲۶ ایسی درس گاہیں قائم کر دی گئیں جن میں ۱۴۵۶۲ نوجوانوں کو فن مناظرہ میں طاق کر کے ملک کے مختلف حصوں میں بھیج دیا گیا۔ دوسری طرف انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے ساتھ ساتھ ۲۵ پرنٹنگ پریس قائم کر دیئے گئے جن میں عیسائی تبلیغی لٹریچر چھپ چھپ کر برصغیر کے گوشہ گوشہ میں پہنچنے لگا۔

اگر یہ ادارے اپنے پر امن تبلیغی کارناموں میں مصروف رہتے تو کوئی بات نہیں تھی مگر ان کے فارغ التحصیل نوجوانوں نے مسلمان علماء کرام اور عوام الناس کے ساتھ مناظرانہ انداز پر عیسائیت کی برتری منوانے کے لیے جگہ جگہ ہنگامے برپا کرنے شروع کر دیے۔ مسلمان ایک طرف سیاسی طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے مکار اور سفاک حکمرانوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ چکا تھا اور دوسری طرف مذہبی دلآزاری کے ساتھ ساتھ بعض دریدہ دہن عیسائی مبلغین نے سرکار دو عالم ﷺ کی شان میں ہذیان گوئی شروع کر دی۔ اس صورت حال نے علماء اسلام کو میدان عمل میں لا کھڑا کیا اور انہوں نے ان لوگوں کو للکارنا شروع کیا۔

علماء اسلام اپنی بے سرو سامانی کے باوجود انگریز کے سیاسی اور تبلیغی طوفانوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ چنانچہ علماء حق کی ایک جماعت تو باقاعدگی کے ساتھ جہاد کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور انہوں نے عوام کے اندر روح جہاد پھونک کر انہیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے لیے تیار کر دیا۔ ناکامی کی صورت میں ان علماء دین کو جن مصائب اور آلام کا سامنا کرنا پڑا، اس کے بیان سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ ان کے لاشے کئی کئی دنوں تک دار و رسن کی زینت

بنتے رہتے بعضوں کو توپ دم کر دیا گیا۔ بعض عمر بھر دریائے شور (کالا پانی) کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے اور بعض کی آنکھوں کے سامنے ان کے اہل و عیال کو ذبح کر دیا گیا اور ان کے مدارس کو لوٹ کر جلایا دیا گیا۔ ان بزرگوں میں مولانا احمد اللہ مدراسی، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا فضل امام، مولانا عنایت علی چریا کوٹی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے علاوہ سیکڑوں علماء کرام شمع حریت وطن پر پروانہ وار قربان ہوتے رہے۔ مگر علماء کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو عیسائی مبلغین کو علمی میدان میں للکارتا اور انہیں شکست فاش دے کر ناموس رسول ﷺ اور عظمت اسلام کی حفاظت کرتا تھا۔ ان علماء کرام میں شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، ڈاکٹر وزیر حسن، مولانا آل حسن، مولانا شرف الحق، مولانا احمد علی سہارنپوری، اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی، مولانا غلام دستگیر قصوری، مولانا حافظ ولی اللہ لاہوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے عیسائی پادریوں کے خلاف علمی جہاد کیا۔ عیسائی مبلغین کے کتابی اور اخباری زہریلے پراپیگنڈے کا علمی انداز میں جواب دیا۔ وہ قریہ بہ قریہ کوچہ بہ کوچہ اور دور دراز دیہات میں پہنچے۔ معرکہ آرا مناظرے، عدیم المثال مباحثے اور زور دار مقابلے کر کے عیسائی مبلغین کے کھوکھلے دعووں کے تار و پود بکھیر دیتے۔ انگریز حکومت نے ان علماء حق کو باغی اور غدار قرار دیا۔ ان پر مقدمے قائم کیے، جائیدادیں ضبط کیں، جلاوطن ہوئے، پس دیوار زنداں پابجولاں رہے مگر پاک و ہند کی سرزمین کو عیسائی مبلغین کے منحوس اثرات سے پاک کر کے دم لیا۔ ان علماء کرام کے علمی جہاد کا نتیجہ یہ تھا کہ جس قوم نے پورے دو سو سال حکومت کی اس کے مذہب کے تبلیغی اثرات اس کے جانے کے ساتھ

ہی ختم ہوتے گئے۔

ان علماء کرام نے اس سلسلہ میں جتنی کتابیں لکھیں، رسالے شائع کیے، مناظرے کیے، مضامین چھاپے، ان کے اثرات وفوائد لکھنے بیٹھیں تو پوری تاریخ مرتب ہوتی ہے مگر ہم اس دور کو ایک طائرانہ نظر سے دیکھتے چلے جاتے ہیں تا کہ آج کا مسلمان یہ اندازہ لگا سکے کہ دین حق کی حفاظت کے لیے ان کے آباؤ اجداد نے کتنا خون جگر نچھاور کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاک وہند کے مسلمانوں کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے جب وہ تصور کرتے ہیں کہ ان کے بزرگوں نے انتہائی سنگین حالات کے باوجود عظمت اسلام کو آنچ نہیں آنے دی۔

عیسائی مبلغین کی بڑھتی ہوئی قوت نے مسلمانان برصغیر پر عرصہ حیات تنگ کردیا تھا۔ لارڈ میکالے کے وائسرائے مقرر ہونے کے بعد مشنریوں کی خاص طور پر سرپرستی ہونے لگی۔ انہیں بے پناہ مالی امداد دے کر غریب عوام کو ترغیب عیسائیت دی جانے لگی اور فورٹ ولیم کالج نے مغربی علوم کی اشاعت کے دروازے کھول دیے۔ لارڈ ڈلہوزی نے تو انگریزی تہذیب وتمدن کو رواج دینے کے لیے باقاعدہ ایک محکمہ قائم کیا اور عیسائی مذہب اختیار کرنے کے لیے ضلع کے تمام افسروں اور ان کی بیگمات کو مالی امداد دینے کے حکم نامے جاری کر دیے۔ فوجی افسر اپنی رجمنٹوں میں اپنے ماتحت سپاہیوں کو حضرت مسیح کی تعلیمات دینے لگے۔ پنجاب کے اعلیٰ حکام ہنری لارنس، جان لارنس، رابرٹ ڈلنلڈ، میکوڈ ہربرٹ، ایڈورڈ اور جان نکسن نے انجیل کی تعلیم دلوانے کے لیے پوری سرکاری مشینری وقف کر دی تھی۔

علماء کرام کو اس بات پر سزائیں دی جاتی تھیں کہ وہ عیسائیوں کو نصاریٰ

کیوں لکھتے تھے۔ لفظ نصاریٰ کی خونی داستان مولانا حالی نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔ ''بعض اضلاع میں مسلمانوں کی تحریریں ایام غدر میں پیش کی گئیں جن میں انگریزوں کو لفظ نصاریٰ سے تعبیر کیا گیا تھا۔ انگریزی حکام نے اس لفظ کو بھی بغاوت پر محمول کرتے ہوئے لکھنے والے کو سزائیں دیں''۔

سرسید نے اسی لیے انگریزوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ایک رسالہ ''تحقیق لفظ نصاریٰ'' لکھا اور انگریزی میں چھپوا کر حکام تک پہنچایا تا کہ وہ مزید سختی نہ کریں۔

سرکاری اثر اندازی کا یہ عالم تھا کہ ۱۸۵۸ء میں کمانڈر انچیف سرجان نے فوجی سپاہیوں کو داڑھی صاف کرنے کا آرمی آڈر نافذ کیا۔ جیل میں قیدیوں کی داڑھیاں منڈوادی جاتیں۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری کی داڑھی زبردستی مونڈی گئی تو انہوں نے اپنے ایک ساتھی مولانا یحییٰ کو دیکھا جو اپنی داڑھی کے گرے ہوئے بال اٹھا کر روتے ہوئے کہتے ''یہ داڑھی خدا کی راہ میں کھینچی گئی اور کاٹی گئی'' (تواریخ عجیبہ)

''حیات جاوید'' میں سرسید نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ سرکاری ملازمین کو نماز پڑھنے سے روکا جاتا تھا اور ۱۸۵۸ء کے بعد مسلمان لڑکوں کو عیسائی سکولوں میں داخلہ لینے کی سرکاری ترغیب دی جاتی تھی۔ مولانا عبدالحق دہلوی مصنف ''تفسیر حقانی'' نے تفسیر حقانی کے ص ۸۴ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ عیسائی مشنریوں نے قرآن پاک میں تحریف کر کے پرانے قلمی نسخے عوام سے لے کر نئے ایڈیشن چھپوائے۔ غریب اور یتیم بچوں کو عیسائی بنایا جاتا۔ غرض کہ عیسائیت کو مقبول اور مرغوب بنانے کیلیے ہر حربہ استعمال کیا جاتا۔

اندریں حالات علماء اسلام نے سخت نوٹس لیا۔ وہ میدان عمل میں نکل آئے اور پاک وہند کے الگ الگ شہر میں ان بر خود غلط پادریوں کو سرعام للکارا اور شکست فاش دی جانے لگی اور ان کے غلط دعوؤں کا محاسبہ کر کے ان کا تنقیدی تعاقب کیا گیا۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی کا عیسائیوں سے ایک مناظرہ

ہندوستان میں عیسائی مناظروں کا سلسلہ اگرچہ اکبر دور سے شروع ہو چکا تھا اور اس دور کے مشہور مناظرے شیخ قطب الدین تھانیسری، مولانا عبداللہ اور پھر شاہجہانی دور میں مولانا سعد اللہ خاں نے سر کیے تھے مگر دور غلامی میں عیسائی پادری بے لگام ہو کر ہر مسجد میں مناظرے کا چیلنج دے دیا کرتے تھے۔ ابتداء میں علماء کرام حکومت کے جور وستم کے سامنے ان لوگوں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ مگر سب سے پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سکوت کو توڑا اور عیسائیوں کو للکارا جس سے دوسرے علماء کرام میں بھی جرأت پیدا ہوگئی۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی جامع مسجد میں درس قرآن دیا کرتے تھے۔ ایک دن آپ بہت بڑے مجمع کے سامنے قرآن پاک کی تفسیر بیان کر رہے تھے کہ ایک بارعب پادری نے آگے بڑھ کر آپ کو مخاطب کیا اور کہا کہ قرآن کا درس بند کریں۔ پہلے میرے ایک سوال کا جواب دیں مجمع میں ایک سناٹا چھا گیا۔ پادری بڑا بے باک تھا اور اردو اور فارسی زبان سے واقف نظر آتا تھا۔ اس نے آتے ہی یہ شعر پڑھا۔

''کہ ایں بزیر زمین است او باوج سماست''

کہنے لگا حضرت عیسیٰ کی اولوالعربی اسی واقعہ سے ظاہر ہو رہی ہے کہ وہ آسمان پر ہیں اور

آپ کے نبی زیر زمین مدفون ہیں۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بجائے اس کے کہ اسے طویل علمی دلائل دے کر قائل کرتے فی الفور ایک شعر پڑھا:

بگفتمش کہ نہ ایں حجت قوی باشد حباب بر سر آب و گہر تہ دریا ست

اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ حضرت عیسیٰ بمنزلہ بلبلہ آسمان پر ہیں اور سرکار دوعالم موتی کی طرح سمندر کی تہہ میں ہیں۔ یہ فی البدیہ شعر سن کر پادری بڑا محظوظ ہوا اور آپ کی ذہانت کی داد دینے لگا اور کہنے لگا اچھا مفصل مناظرہ پھر کریں گے۔

اس واقعہ کے بعد شاہ عبدالعزیز دہلوی نے محسوس کیا کہ یہ لوگ عقلی طور پر علماء اور عوام کو پریشان کرتے رہیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد آپ نے اپنے درس کا رخ عیسائیت کے رد اور شیعوں کے خلاف جو ان دنوں مسلمان ریاستوں میں سنیوں سے الجھ رہے تھے، پھیر دیا۔ آپ نے اپنے ہم عصر علماء کرام کو بھی جرأت دلائی اور مناظروں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ کوئی دن ایسا نہ تھا کہ دہلی، لاہور، امرتسر اور پاک وہند کے دوسرے بڑے شہروں میں کوئی نہ کوئی مناظرہ نہ ہوتا ہو۔

مولانا ہادی کا ایک دلچسپ مناظرہ

انہی دنوں مولانا ہادی نے ایک مفصل کتاب مناظرہ بنام ''رد نصاریٰ'' ۲۰ دسمبر ۱۸۴۰ء کو شائع کرادی۔ اس کتاب میں عیسائیوں کے ان تمام اعتراضات کا، جو وہ آئے دن مسلمانوں کے خلاف اٹھاتے رہتے تھے علمی انداز میں جائزہ لیا گیا۔ یہ کتاب اس دور کی بڑی مفید کتاب سمجھی جاتی ہے جو عام مناظرین کے لیے بڑی مفید

ثابت ہوئی۔ اس ضمن میں ایک سوال کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔ ایک پادری نے کہا
اگر معراج مصطفیٰ کو صحیح مان لیا جائے تو آج تک آسمان میں کوئی سوراخ تو دکھائی دیتا یا
آسمان کا کوئی دروازہ ہی ہوتا جس سے آپ گزرتے تھے۔ اس کے جواب میں انجیل
کے مکتوب باب ۱۲ آیت ۲ تا ۵ کا حوالہ دیا گیا تھا جس میں پولس نبی آسمان پر گئے اور
عیسائی دنیا کسی سوراخ یا دروازے کا مطالبہ نہیں کرتی۔ حضرت عیسیٰ دو روز قبر میں رہ کر
سوراخ کے بغیر آسمان پر کیسے چلے گئے؟

پادری نے کہا" بہت سے رسول پیدا ہوئے مگر حضرت عیسیٰ کی طرح باپ
کے بغیر کوئی پیدا نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کے بیٹے تھے"۔ جواباً پوچھا گیا: تو پھر
حضرت آدم کے متعلق کیا خیال ہے؟ جو باپ اور ماں دونوں کے بغیر پیدا ہوئے؟ پھر
ان کو خدا کا بیٹا کیوں نہ مانا جائے؟ آدم کو خدا کا بیٹا ماننے پر انکار ہے اور ابن آدم پر
اصرار اسی طرح معجزہ شق القمر، زکوٰۃ، نماز، روزہ غرضیکہ عیسائیوں کے تمام سوالوں کے
مختصر الزامی اور عقلی جواب جمع کر دیے تھے۔ جس کا عیسائیوں کے پاس کوئی جواب
نہیں تھا۔

مولانا آلِ حسن نے پادری فینڈر کا تعاقب کیا

یہ مناظرہ خط کتابت کے ذریعہ ہوا۔ ۲۲ جولائی ۱۸۴۴ء سے شروع ہو کر ۲
فروری ۱۸۴۵ء تک جاری رہا۔ اس مناظرہ میں پادری فینڈر کو اپنی شکست کا اعتراف
کرنا پڑا (کارل گوٹلیب فینڈر)۔ یہ پادری ۱۸۰۳ء میں درہم برگ جرمنی میں پیدا ہوا
، ابتداء ہی سے فینڈر کو مذہبی تعلیم پر لگا دیا گیا اور پادری فریڈرک کے زیر تعلیم رہا

۱۸۲۰ء میں بائبل مشنری کالج میں پانچ سال تک علم الٰہیات کا مطالعہ کرتا رہا۔ وہ دنیا
کی مختلف زبانوں پر عبور حاصل کرتا رہا۔ خاص کر مشرقی علوم پر اس کی گہری نظر رہی۔
چنانچہ ۱۸۲۵ء میں اسے آرمینیا میں شوشا کے قصبہ میں انجیل کا ترجمہ کرنے کے لیے
بھیجا گیا۔ وہ ترکی، آرمینی اور فارسی میں مشاق ہو گیا۔ چنانچہ وہ ان تین زبانوں میں
مسلمانوں میں مسیحی اصولوں کی تبلیغ کرنے لگا۔ ان ہی ایام میں اس کی مشہور کتاب
''میزان الحق'' جرمنی زبان میں ۱۸۲۹ء میں شائع ہوئی۔ پھر اس کا ترجمہ فارسی،
انگریزی، اردو، مرہٹی، ترکی اور عربی زبان میں کیا گیا۔ اس کتاب نے عالم اسلام میں
اضطراب کی لہر دوڑا دی، اس دوران وہ بغداد، تہران، اصفہان اور کرمان پہنچا اور مسیحی
لٹریچر تقسیم کرتا رہا۔ دوران سفر تبریز میں پہنچ کر اس نے ایک آزاد خیال ایرانی ادیب
سے شناسائی پیدا کر لی اور ''میزان الحق'' کا فصیح فارسی میں ترجمہ کرا لیا۔ ۱۸۳۳ء میں
واپس جرمنی چلا گیا۔ ۱۸۳۷ء میں اپنے ایک دوست کریس کے ساتھ ہندوستان میں
وارد ہوا اور چرچ مشنری سوسائٹی کی طرف سے آگرہ میں مسیحی تبلیغ پر متعین کر دیا گیا۔
آگرہ میں ایک عیسائی مبلغہ سے شادی کر کے شہر کے گنجان آباد علاقہ میں قیام پذیر ہوا
اور آگرہ کے گرد و نواح میں نکل جاتا اور عیسائیت کا پرچار کرتا رہا۔ سب سے پہلے اس
کی اس حرکت کا ایک مسلمان افسر مولانا آل حسن نے نوٹس لیا اور میزان الحق کے
جواب میں ''استفسار'' لکھی۔ لکھنو کے ایک اور عالم دین نے پادری فینڈر کی کتاب ''
مفتاح الاسرار'' کے جواب میں ''کشف الاستار'' لکھی جس کا جواب پادری فینڈر نے
''حل الاشکال'' کے نام پر شائع کیا۔ ان کتابوں کا منظر عام پر آنا تھا کہ پادری فینڈر
کی شہرت سارے برصغیر میں پھیل گئی۔ ۱۸۴۵ء میں اس پادری نے دہلی پہنچ کر جامع

مسجد دہلی میں علماء اسلام کو مناظرے کا چیلنج دیا۔ لیکن مولانا آل حسن نے اسے اپنے
تحریری مناظرہ میں لاجواب کر دیا اور پادری فینڈر آئندہ کے لیے مولانا آل حسن کے
مقابلہ میں آنے سے ہمیشہ گریز کرتا رہا۔ مولانا آل حسن کے سامنے پادری بے حال
ہو گیا تھا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فینڈر

پادری فینڈر کی بڑھتی ہوئی جرأت کو حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی ثم
مہاجر مکی نے للکارا اور ۱۸۵۴ء میں آگرہ میں پہنچ کر مناظرہ کا اعلان کر دیا اور فینڈر کو
سرعام مقابل ہونا پڑا۔

امام المناظرین مولانا رحمت اللہ کیرانوی محل دربار کلاں قصبہ کریانہ ضلع
مظفر نگر (بھارت) میں رہتے تھے۔ آپ کے جد امجد شیخ عبدالرحمٰن گازرونی محمود
غزنوی کے ان مجاہدین میں سے تھے جنہوں نے برصغیر کو اسلامی زندگی سے روشناس
کیا۔ وہ پانی پت میں زیر قلعہ مدفون ہیں۔ مولانا کے اسلاف ہمیشہ برگزیدہ روزگار
رہے اور علوم دینیہ کی اشاعت میں نمایاں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ مولانا رحمت
اللہ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ بارہ برس کی عمر میں فارسی کی درسیات
سے فارغ ہو گئے۔ آپ شاہجہاں آباد میں مدرسہ مولوی غیاث میں مقیم رہے۔ ان
دنوں لکھنو میں مفتی سعد اللہ کی تدریس کا بڑا چرچا تھا۔ آپ نے وہاں جا کر مسلم
الثبوت، میر زاہد پڑھی۔ درسیات میں آپ نے مولانا احمد علی وزیر ریاست پٹیالہ
حضرت مولانا شاہ عبدالرحمٰن چشتی (یہ وہی مولانا عبدالرحمٰن ہیں جو زبدۃ الاولیاء شاہ
سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے اور ان کا مزار بستی نظام الدین اولیاء دہلی میں ہے
) اور انہوں نے مولوی امام بخش صہبائی سے خاص طور پر تلمذ کیا اور منقولات
و معقولات میں مکمل مہارت حاصل کی۔

مولانا نے عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی مناظروں میں بڑا نام پیدا کیا۔ پاک
و ہند میں جن لوگوں نے آپ سے تلمذ کیا، ان میں سے مولانا عبدالسمیع رامپوری
صاحب انوار ساطعہ، مولانا شاہ ابوالخیر مولانا نور احمد امرتسری (مرتب حواشی مکتوبات
مجدد الف ثانی)، مولانا بدر الاسلام، مولانا احمد دین چکوالی، مولانا محمد سعید ناظم دار العلوم
حرم صولتیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حرم پاک میں آپ نے ایک طویل عرصہ تک
حلقہ تدریس قائم رکھا۔ جس سے ہزاروں طلبہ دنیائے علم میں نامور ثابت ہوئے۔

مولانا کی زندگی کا ایک خاص وقت ردعیسائیت میں گزرا۔ شاہ عبدالغنی سجادہ نشین
خانقاہ شاہ غلام علی دہلوی کی فرمائش پر "ازالہ اوہام" لکھ کر عیسائی نظریات کا مسکت جواب
دیا۔ یہ کتاب اب پاکستان میں "بائبل سے قرآن تک" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

مولانا نے دیکھا کہ مسیحی علماء برصغیر کو اپنی جاگیر سمجھ کر اسلام کے خلاف کتابیں
لکھ رہے ہیں اور محسن دو عالم ﷺ پر ناروا ملے کر کے مسلمانوں کی دل آزاری کر رہے ہیں۔
تو آپ نے اس وقت کے پادری فینڈر اور پادری فرنچ کو مناظرہ کے لیے للکارا اور کہا کہ
جس کتاب "انجیل" کی طرف تم لوگوں کو بلا رہے ہو، یہ الہامی کتاب نہیں بلکہ تبدیل
کر دی گئی ہے اور جس دین کی تم دعوت دیتے ہو وہ منسوخ ہو چکا ہے۔

یہ مناظرہ دو دن ۱۰، ۱۱ اپریل ۱۸۵۴ء کو گڑھ عبدالمسیح اکبر آباد، آگرہ میں ہوا۔
ہزاروں سامعین کی موجودگی میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے ان پادریوں کو ہاتھوں

ہاتھ لیا۔ آپ کے معاون ڈاکٹر وزیر محمد خان صاحب جنہیں عیسائی لٹریچر پر بڑا عبور تھا بھی آپ کے ساتھ رہے ۔ یہ مناظرہ پاک وہند کے ان تاریخی اور فقید المثال مناظروں میں سے ایک ہے جس پر دنیائے عیسائیت آج تک لرزاں ہے۔

مولانا نے اس مناظرہ کے دوران یہ ثابت کر دیا کہ عیسائیوں کی موجودہ انجیل جس پر پادریوں کو ناز ہے تحریف شدہ ہے (ندائے عام ص ۱۲۲)۔ آپ نے انجیل کے مختلف نسخے پیش کیے جو زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ پادری فینڈر اس مناظرہ میں لاجواب ہو گیا تھا۔ اس مناظرہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ شکست خوردہ فریق اپنا مذہب ترک کر دے گا مگر پادری فینڈر صرف اعتراف شکست کر کے میدان سے فرار ہو گیا۔ مناظرہ کے چند روز بعد پادری فینڈر نے روئیداد مناظرہ پر ایک کتاب "حل الاشکال" کے نام سے لکھی اور ان مباحث پر استدلال دینے کی ناکام کوشش کی جو اسے مناظرے کے وقت شکست دلانے کا ذریعہ تھے۔

اس مناظرہ کی مفصل کیفیت وزیرالدین ابن شرف الدین نے "البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف" کے نام سے لکھی اور فخر المطابع شاہجہاں آباد سے ۱۲۷۰ھ میں چھپوا کر تقسیم کی گئی۔ ان مناظروں نے مولانا کو اتنی شہرت دی کہ انگریز آپ کے نام سے بوکھلا اٹھا۔ پادری انہیں عیسائیت کے لیے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ چنانچہ جنگ آزادی کے پانچ سال بعد شاملی کی تباہی کے دوران انگریزوں نے مولانا کو اور ان کے ایک ساتھی جو تھانہ بھون میں تھے باغی قرار دے دیا اور آپ کے وارنٹ جاری کر دیے۔ جب مولانا گرفتار نہ ہو سکے تو انگریزی عدالت نے آپ کی عدم موجودگی میں مقدمہ چلا کر آپ کی ساری جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ واقعہ پانی پت

اور کیرانہ ضبط کر لی۔ جائیداد کی ضبطی کا فیصلہ کرنال کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے ۰ وری ۱۸۲۶ء کو سنایا۔ اس جائیداد کی تفصیل "تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ" ہند کے صفحہ ۶۷۵ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مولانا رحمت اللہ اور پادری فینڈر کے مناظرہ کی تفصیلی رپورٹ اور نسخ انجیل کے موضوع پر دلائل جناب امداد صابری صاحب کی کتاب "فرنگیوں کے جال" میں مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر خاں اور پادری فینڈر کا مناظرہ

آپ اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے ایک رفیق کار جناب ڈاکٹر وزیر خاں سرجن الہ آباد بھی تھے۔ فینڈر کی شکست کے بعد ہندوستان کے سارے پادری دم بخود تھے۔ ادھر ڈاکٹر وزیر خاں نے مناظرہ کی روئیداد چھاپ کر ملک کے کونے کونے تک پہنچا دی تھی۔ اندریں حالات پادری فینڈر نے اپنی خفت مٹانے کے لیے ڈاکٹر موصوف سے خط کتابت شروع کر کے مناظرے کا آغاز کر دیا۔ یہ مناظرہ یکم مئی ۱۸۵۴ء کو شروع ہوا اور ۱۲ اگست ۱۸۵۴ء میں ختم ہو گیا۔ اس عرصہ میں کئی خطوط کا تبادلہ ہوا۔ جس میں پادری فینڈر کے تحریری سوالوں کا مسکت جواب دے کر اسے لاجواب کر دیا گیا۔ یہ خطوط تردید عیسائیت میں بہترین مواد ہیں۔

اسی دوران چند اور پادری عماد الدین اور مولانا محمد عمر دہلوی، چودھری مولا بخش اور پادری فینڈر کے درمیان مناظرے بڑے اہمیت رکھتے ہیں۔ رائے بریلی میں اسی دوران ایک مناظرہ الطاف مسیح اور مولانا سلیم اللہ دہلوی کے درمیان ہوا۔ شرط یہ تھی کہ ہارنے والا جیتنے والے کا مذہب اختیار کرے گا۔ چنانچہ الطاف مسیح کو شکست ہوئی

اور انہوں نے اعتراف شکست کے بعد مشرف باسلام ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس مناظرہ کی مکمل رپورٹ مولانا سلیم اللہ کی کتاب ''اظہار الاسلام'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مولانا شرف الحق نے پادری پیٹرک کو للکارا

مولانا رحمت اللہ کے مناظرے سے عوام الناس کے حوصلے بلند ہو گئے اور علماء اسلام میں عیسائیوں کے جواب کے لیے جرأت ہو گئی۔ مولانا شرف الحق ردنصاریٰ میں بڑے معروف عالم دین تھے۔ انہوں نے پادری پیٹرک کو مناظرے کے لیے للکارا۔

مولانا شرف الحق برصغیر میں ردنصاریٰ میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ آپ کے والد مولانا حافظ جلال الدین کو انگریزوں نے جنگ آزادی میں باغیوں کی ایک جماعت کے سربراہ ہونے کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا۔ مولانا شرف الحق ۱۸۶۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کو ابتداء ہی سے شاہ رحیم بخش کی روحانی صحبت ملی۔ ۱۸۷۷ء میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں داخلہ لے کر انگریزی زبان سیکھی۔ ۱۸۸۱ء میں مولانا الطاف حسین حالی سے فارسی کی تکمیل کی۔ ۱۸۸۳ء میں فتح پوری کے دینی مدرسہ سے سند حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے فاضل فارسی کیا اور پنجاب بھر میں اول آئے۔ ان دنوں عیسائی اور آریہ مناظروں کا ملک میں بڑا زور تھا۔ دینی مدارس کے طالب علم ان مناظروں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ آپ بھی عبرانی، سنسکرت اور عیسائی لٹریچر کا مطالعہ کرنے لگے۔ طالب علمی کے زمانہ میں جب گھنٹہ گھر دہلی میں ایک پادری نے تمسخرانہ انداز میں کہا کہ مسلمانوں کے پیغمبر ''حبیب اللہ'' کہلاتے ہیں۔ لیکن جب پیغمبر کے نواسے کو کربلا میں شہید کر دیا گیا تو مسلمانوں کے پیغمبر خدا سے سفارش نہ

کر سکے۔ حالانکہ حبیب کا محبوب زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ آپ کو شاہ عبدالعزیز کا جواب یاد تھا۔ مجمع عام میں پادری کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ ''آپ بھول گئے ہیں حبیب نے سفارش کی تھی مگر خدا تعالیٰ نے فرمایا اے حبیب آپ اپنے نواسے کی بات کرتے ہیں ان لوگوں نے میرے بیٹے عیسیٰ کو سولی پر چڑھا دیا تھا تو بھی میں خاموش رہا۔'' اس بات سے مسلمان مجمع میں ''نعرہ تکبیر'' بلند ہوا اور پادری صاحب کھسک گئے۔ آپ کی چلتے پھرتے مناظروں میں دلچسپی بڑھی تو آپ کے استاد مولانا حالی نے پہلے تکمیل تعلیم پر پابندی کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ آپ دینی مدارس میں علوم عربی کے حاصل کرنے کے لیے داخل ہوئے۔ عبرانی اور یونانی زبان حکیم عبدالمجید خان کے زیر علاج ایک یہودی سے پڑھی، پشتو مولانا عبدالحکیم افغانی اور ترکی مولانا ابوالخیر سے سیکھی۔ آپ آٹھ زبانوں کے ماہر ہونے کے باوجود فن مناظرہ میں کسی ماہر استاد کی تلاش میں تھے۔ کہ مولانا رحمت اللہ فاتح عیسائیت کا شہرہ سنا تو عازم حج بیت اللہ ہوئے اور ۱۳۰۵ میں مدرسہ صولتیہ میں داخلہ لے کر فن مناظرہ میں کمال حاصل کرلیا۔ مولانا رحمت اللہ نے آپ کو سند فراغت کے ساتھ ساتھ ''ازالۃ الشکوک'' اور ''اظہار الحق'' تبرکاً عنایت کر کے ردنصاریٰ کی اجازت عطا فرمائی۔ آپ باطنی علوم کے حصول میں مکہ معظمہ میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت ہوئے اور خرقہ خلافت حاصل کر کے سلسلہ چشتیہ صابریہ میں اجازت حاصل کی۔

آپ نے اپنی عمر میں تین حج کیے اور اسی دوران اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کر کے ہر ملک میں عیسائی پادریوں سے مناظرے کیے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے مکہ مکرمہ میں مثنوی مولانا روم سبقاً سبقاً پڑھی۔

برصغیر میں واپسی پر مولانا نے ہر میدان میں عیسائی مبلغین سے مناظرہ کیا۔
چنانچہ پادری بشپ فرنچ پادری ہومر، پادری ویکٹ، پادری ویون، پادری ڈنبر، پادری
رائٹ، پادری جانسن، پادری وٹرلی اور پادری کارلایل سے مناظرے بڑے مشہور
ہوئے۔ دسمبر ۱۸۹۱ء میں پادری گولڈ سمتھ سے حیدر آباد اور ۸ فروری ۱۸۹۳ء میں
پادری جے سول سے پونہ اور ۸ مارچ ۱۸۹۴ء میں پادری رونس سے غازی پور میں
جو مناظرے ہوئے۔ وہ یادگار اور تاریخی مناظروں میں شامل ہوتے ہیں۔

تحریف انجیل پر آپ سے یکم اپریل ۱۸۹۱ء میں دہلی کی جامع مسجد فتح پوری
میں لارڈ بشپ جے اے لیفرائے کا مناظرہ تو خصوصیت کا حامل ہے۔ اس مناظرہ میں
دہلی اور اطراف دہلی سے ہزاروں مسلمان اور عیسائی جمع ہوئے۔ مسلمانوں کے جلیل
القدر علماء اور زعماء شریک مناظرہ تھے اور ادھر عیسائیوں کے پادری اور انگریز افسر بھی
شریک تھے۔ تین روز مناظرہ جاری رہا۔ تحریف انجیل پر ایسے ٹھوس اور دستاویزی
ثبوت دیے گئے۔ لیفرائے نے اعتراف کیا کہ واقعی انجیل میں تحریف ہوئی ہے۔ ان کا
یہ اعتراف مناظرہ میں بھی تحریری شکل میں لے لیا گیا۔

پادری رونس سے مباحثہ

غازی پور کے مشن سکول میں ۸ مارچ ۱۸۸۵ء میں پادری رونس کے ساتھ
مولانا شرف الحق کا مناظرہ بھی تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ اس مناظرہ میں پادری
رونس نے اپنی شکست کا اعتراف کرلیا۔ مگر یہ کہا کہ میں مولانا کے منطقی دلائل کے
سامنے شکست کھا گیا ہوں۔ لیکن وہ حق ثابت نہیں کر سکے۔

مولانا شرف الحق مناظر اسلام نے رد نصاریٰ میں بڑا کام کیا۔ ان کی
کتابیں آج تک عیسائی مبلغین کے اعتراضات پر کاری ضرب کا کام دے رہی ہیں۔
ان کی تصانیف میں سے دافع البہتان بہ تنزیہ الرحمٰن، استیصال دین عیسوی بمقابلہ دین
محمدی مناظرہ، غازی پور، مناظرہ کالکا، مناظرہ حیدر آباد دکن، مناظرہ پونا اور دینی
مناظرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

پادری عماد الدین

اسی زمانے میں جب کہ علماء اسلام، عیسائی مبلغین کو پے در پے شکست دے
رہے تھے، پنجاب میں پادری عماد الدین نے اسلام اور محسن اسلام پر ناروا حملوں کا
سلسلہ شروع کر دیا۔ عماد الدین المعروف حکیم الٰہی کے والد چراغ دین پانی پت کے
رہنے والے تھے۔ اس نے عیسائیت قبول کر لی مگر آخر عمر میں عیسائیت سے تائب
ہوگئے۔ پادری عماد الدین نے اپنی سرگزشت "عمادیہ" میں اپنے خاندان کا نسبی تعلق
حضرت جمال الدین قطب ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ سے ملایا ہے۔ مگر ان کے بھائی خیر الدین
کے مطابق (کوہ نور لاہور ۲۴ جنوری ۱۸۷۴ء) یہ قوم کے تیلی تھے اور پانی پت میں یہی
کام کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اکبر آباد میں ہوئی۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر سلین فاش نے
انہیں انجیل پڑھائی اور دوسری مسیحی لٹریچر بھی دیا۔ اس ابتدائی تربیت کا یہ اثر ہوا کہ عماد
الدین نے ۲۹ اپریل ۱۸۶۶ء میں امرتسر کے پادری رابرٹ کلارک کے ہاتھ پر عیسائی
مذہب اختیار کرلیا۔ دو سال تک سرکاری ملازمت میں رہ کر "خادم دین عیسوی" کی
حیثیت سے تبلیغ مسیحیت کے لیے باہر نکلے۔ وہ شام کے وقت امرتسر کی گلیوں میں چل

نکلتے۔رات کے دس بجے تک مختلف لوگوں سے عیسائیت پر گفتگو کرتے۔کچھ عرصہ کے بعد انہیں مغربی دارالعلوم کی طرف سے ڈی ڈی حکم الٰہی کی ڈگری دی گئی۔مگر امرتسر کے علماء اسلام اور عوام نے ان کا زور توڑ دیا۔یہی وجہ ہے کہ پادری عماد الدین نے عیسائیت پر کتابیں لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔اگر چہ یہ پادری ۱۸۹۰ء میں، راہی ملک عدم ہو گیا، مگر اس کی تحریروں نے مذہبی دنیا میں ایک فتنہ کھڑا کر دیا۔دینی موضوعات پر اس نے ۵۴ کتابیں لکھیں۔جن میں تلخیص الاحادیث، تعلیمات ومکاشفات نغمہ طنبوری، تحقیق الایمان عقوبت الضالین، آثار قیامت، واقعات عماد الدین، تفسیر متی اور تفسیر اعمال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان کی تحریر میں اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی بہت پائی جاتی تھی۔ان سے نہ صرف مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی بلکہ ان کے عیسائی ہم عصر پادری کرپول نے بھی ان کی تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔''پادری عماد الدین کی تحریریں ہندوستان میں ایک اور غدر برپا کریں گی۔''

اگر چہ ان تحریروں کی سنڈاس سے اس کے ہم مذہب بھی نالاں تھے مگر علماء اسلام نے اس کی کتابوں کے جواب لکھنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور جواب میں اتنی جاندار کتابیں لکھی گئیں جو عیسائیت کے نظریات کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئیں

(ماہنامہ ضیائے حرم لاہور۔اپریل ۱۹۷۱ء۔ماہ نامہ ''جہان رضا'' جولائی ۲۰۰۵ء)